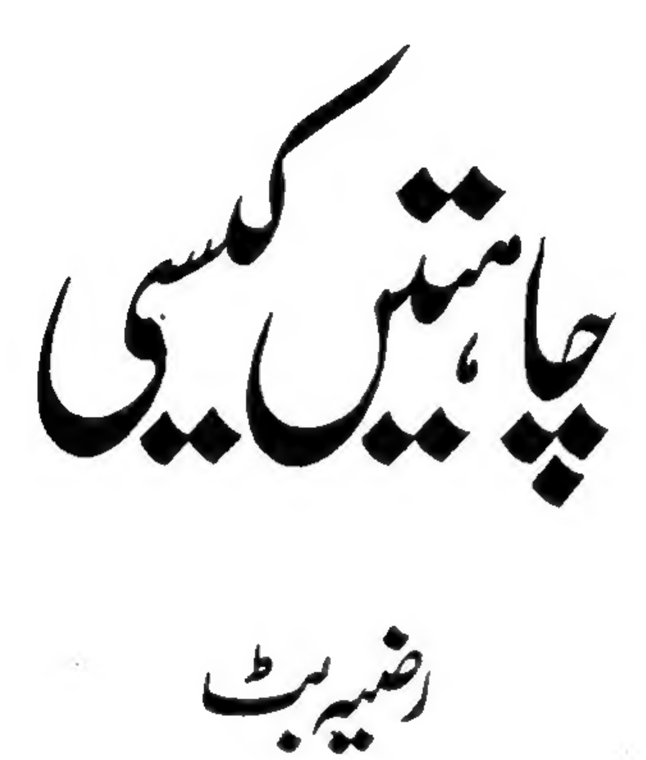
چاہتیں کیسی

رضیہ بٹ



رضیہ بٹ

سنگِ میل پبلی کیشنز ۰ لاہور

فہرست

صبح کا آنچل

عروسی لباس پر نگاہ پڑتے ہی اسے اپنی پہلی شادی یاد آ گئی۔ احساس کے حوالے بڑے جاندار ہوتے ہیں۔ لباس کے رنگ میں وہی جھلک تھی یا جگمگاتے سلمے ستارے میں۔ اسے اس یاد نے ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے ڈبے سیماں کی طرف دھکیل دیئے۔

تین سالوں میں یہ اس کی تیسری شادی تھی۔ سیماں بنارس ساڑھی والے سے دونوں ڈبے لے کر آئی تھی۔ رما اپنے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھی تیز برقی روشنی میں اپنی بھنوؤں کا جائزہ لے رہی تھی۔ کبھی ایک کو اُچکاتی کبھی دوسری کو۔ ٹویزر ہاتھ میں تھا۔ جہاں کہیں کوئی فالتو بال نظر آتا اکھاڑ لیتی۔ وہ بیوٹی پارلر سے بھنویں بنوا کر آئی تھی۔ بازوؤں اور ٹانگوں پر تھریڈنگ بھی کروائی تھی۔ کل شادی تھی اور ایک دن پہلے یہ کام کرنا تھا۔ وہ ابھی ابھی بیوٹی پارلر سے آئی تھی اور۔

ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں بھنوؤں کو بنا سنوار رہی تھی۔

"آجاؤں؟" سیماں نے نیم وا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں۔" وہ اسٹول پر ہی گھوم کر دروازے کی طرف رُخ کرتے ہوئے بولی تھی۔

"لو۔" اس نے کپڑے بڑھائے۔

"آ گئے کپڑے۔؟"

"ہاں!"

"کیسے ہیں؟"

"بہت خوبصورت۔"

"کام کیسا ہے۔؟"

"اٹھائیس ہزار کا عروسی لباس بنا ہے محترمہ۔ کام۔"

رما بے تابی سے اٹھ کر اس کی طرف آگئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ڈبے لے کر بیڈ پہ رکھتے ہوئے خود بھی بیٹھ کر وہ کپڑے دیکھنے کو بے چین تھی۔

سیماں نے ڈبوں کے ڈھکنے ہٹاتے ہوئے اسے جگمگ کرتا لباس دکھایا تھا۔

اور کپڑے دیکھتے ہی اپنی شادی یاد آگئی تھی۔

وہ چُپ ہو گئی۔

سیماں نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ "پسند آئے کپڑے۔"

"ہاں!" روکھا سا جواب اس کے منہ سے نکلا۔

"کیا ہوا۔؟"

"کچھ نہیں۔"

"کھوگئی ہو کہیں۔"

اس نے اپنی خوبصورت اور کشادہ آنکھوں کو پوری طرح کھول کر سیماں کو دیکھا اور بولی

"کھوئی تو برسوں پہلے تھی۔"

سیماں نے ہنس کر اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "کبھی کبھی تمہیں ماضی کا دورہ پڑتا ہے۔"

"ہوں!" اس نے اپنی حسین آنکھیں بند کر لیں۔

"آنکھیں کھولو بھئی۔ کپڑے دیکھو۔ کتنے خوبصورت ہیں۔"

"خوبصورتی کا احساس پہلی بار ہوا تھا۔"

"اب بھی ہوگا۔"

"ہوں!"

سیماں نے دونوں ڈبوں سے کپڑے باہر نکال کر اسے دکھائے۔ "اتنا بھاری اور خوبصورت کام ہے۔ کپڑا تو نظر ہی نہیں آتا۔ جھلک پڑتی ہے صرف قرمزی رنگ کی۔ نبیل کے پاس پیسہ بھی ہے اور اچھا ذوق بھی۔"

رما کے اندر ہل چل سی مچی تھی۔ سیماں کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

"خوب موٹی آسامی ہے۔ تین چار لاکھ کا تو زیور ہی خریدا ہے۔ پہلی بیوی کا زیور الگ ہے۔۔ شادی کے دن کہتا ہے نیا زیور ہی پہنایا جائے۔ ویسے تم نے پہلی بیوی کے زیور کا بھی صفایا کرنا ہے۔"

"سیماں!" وہ اس کی بات ان سُنی کرتے ہوئے بولی۔

"کیا ہے!"

"کیا تم مجھے تھوڑی دیر کے لیے تنہا نہیں چھوڑ سکتیں۔"

"طبیعت خراب ہو گئی ہے کیا۔!"

"یہی سمجھو۔"

"ڈاکٹر کے پاس چلو گی!"

"نہیں۔ بس تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔"

"چھوڑ دیتی ہوں۔ ویسے بھی میں اور سلیم نبیل کے ہاں جا رہے ہیں۔ حق مہر کا تصفیہ کرنا ہے۔ ویسے تو وہ ہر بات مان رہا ہے۔ جتنا بھی کہیں گے لکھ دے گا۔ دوسری کا چاؤ بھی بہت ہے نا اسے۔" سیماں کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھری۔ ہنس کر بولی۔ "خوب اُلّو بن رہا ہے۔ آگے بھی بنے گا۔"

رما کچھ نہیں بولی۔

سیماں نے اس کی پشت تھپتھپائی۔ پھر کپڑے سمیٹتے ہوئے بولی۔ "تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔ ہم لوگ ایک گھنٹے تک آجائیں گے۔"

اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور پھر بولی: "چلو آج کھانا باہر ہی کھائیں گے۔ ایک گھنٹے تم ریسٹ سے لو، ٹھیک۔"

رما نے سر ہلایا۔ سیماں دونوں ڈبے میز پر رکھ کر پھر اسے ریسٹ کرنے کا کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

رما اس کے کمرے سے نکلتے ہی بیڈ پر گرنے کے انداز میں پڑ گئی۔ اس نے نرم وگداز تکیے میں منہ دے لیا۔ اس کے نرم وریشمی سیاہ بال بکھر گئے۔

وہ بے حد حسین تھی۔

قدرت کے ہاتھوں کا تراشا ہوا حسین شاہکار تھی۔ بے داغ چہرہ میدے اور سیندور میں نور گھلی رنگت، حسین سیاہ آنکھیں جن پر لمبی اور گھنی پلکیں جب جھکتیں اٹھتیں تو قیامت بپا کرنے کی اہل ہوتیں۔ کومل سی ناک گلابی گلابی بھرے بھرے ہونٹ جن پر شبنمی قطروں کے ٹھہراؤ کا احساس جاگتا رہتا۔ تراشا ہوا جسم نرم وگداز ہاتھ اور گلابی گلابی پاؤں۔ وہ سراپا قیامت تھی۔ میک اپ اور سج دھج اس کے حسن کو جہاں سوز بنا دیتے۔ وہ جہاں جاتی جدھر جاتی لوگوں کو مرعوب ومتاثر کرتی

وہ کون تھی۔؟

کہاں سے آئی تھی۔؟

کس خاندان سے اس کا تعلق تھا۔؟

یہ بات سیماں کو معلوم تھی نہ اسے۔

برسوں پہلے بس کا حادثہ ہوا تھا۔

رما نے تکیے میں چھپا چہرہ ذرا سا اوپر اٹھایا۔ کمرے میں چاروں طرف وحشت زدہ نظروں سے دیکھا بس کے حادثے کا دھماکا اس کے ذہن میں اب تک محفوظ تھا۔ وہ ماضی میں کھو گئی تھی اور اسے برسوں پہلے کا حادثہ یوں لگ رہا تھا ابھی ہوا ہے۔ اس نے پھر سر تکیے پہ پٹخ دیا اور اس کی اک غیر واضح سی شبیہہ لہرانے لگی۔ اس شبیہہ کو اس نے ذہن کے پردے پر پوری طرح دیکھنا

چاہا۔ سوچ کی مدد سے واضح کرنا چاہا۔

لیکن نہ کر سکی۔

یہ شبیہہ یقیناً اس کی ماں کی تھی۔ شفقت اور محبت کا احساس اسے اپنے چاروں طرف پھوار کی طرح پڑتے محسوس ہونے لگا تھا۔

وہ شاید اپنی ماں کے ساتھ بس میں سفر کر رہی تھی کہ بس حادثے کا شکار ہو گئی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا چیخیں بلند ہوئیں۔ اس کے بعد کیا ہوا اسے کچھ یاد نہ تھا کہ وہ سیماں کے گھر کب آئی تھی۔ سنا ہی تھا کہ بس میں سیماں کی امی بھی سفر کر رہی تھیں۔

وہ کبھی کبھی رما کو بتایا کرتیں: "بڑا خوفناک حادثہ ہوا تھا۔ صرف پانچ آدمی بچ پائے تھے۔ سب کے سب مر گئے تھے کچھ لوگ وہیں موت کے منہ میں چلے گئے۔ کچھ ہسپتال جا کر دم توڑ گئے۔"

رما پوچھتی: "میں بھی ہسپتال میں تھی!"

وہ جواب دیتیں: "ہاں۔ تمہیں معمولی سی چوٹیں آئی تھیں۔ شاید تمہارے ماں باپ مر گئے تھے۔ تم اکیلی روتی پھر رہی تھیں۔ میں معمولی زخمی ہوئی تھی۔ مرہم پٹی کر کے ہسپتال والوں نے مجھے ڈسچارج کر دیا تھا۔ میں ہسپتال سے واپس آنے کے لیے باہر نکلی تو تم نے رو رو کر میری ٹانگوں کے گرد اپنے ننھے ننھے بازو کر دیے۔ میں نے تمہیں پیار کیا۔ تمہاری امی ابو کا پوچھا۔ تم کچھ نہ بتا سکیں بس روئے گئیں۔ میں جان گئی کہ تمہارا یہاں کوئی نہیں ہے اس لیے گھر لے آئی۔"

"امی!" رما کہتی۔ وہ سیماں کی امی کو امی ہی کہتی تھی۔ "پالا پوسا جوان کیا تھا۔ آپ نے میرے گھر والوں کے متعلق پتا چلانے کی کبھی کوشش کی۔؟"

"ہاں بہتیری دفعہ۔"

"پھر۔"

"کچھ پتا نہ چل سکا۔"

"یقیناً سب اسی بس میں مرگئے ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے۔"

سیماں کی امی آسے ہمیشہ پیار کرلیتیں۔ اور وہ ان کے سینے میں منہ چھپا کر ممتا کی گہرائیوں میں ڈوب جانے کی کوشش کرتی۔ یہ کوشش ہی ہوتی۔ رما کی روح کو کبھی تسکین نہ ملتی۔ بھوک کا احساس جاگ اُٹھتا۔ اسے لگتا وہ جنم جنم سے پیار کی بھوکی ہے۔ اس کے اندر اک خلا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکتا۔

خلا اور بھوک کا احساس من میں لیے وہ اسی گھر میں جوانی کی حدود تک جا پہنچی۔ سیماں اس سے دو چار سال بڑی تھی۔ عام سی شکل وصورت اور نچلے متوسط طبقے کی لڑکی تھی۔ شادی بھی اپنے ایسے ہی لوگوں میں ہوگئی۔ سلیم کے مالی حالات و وسائل کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ معمولی سا کلرک تھا۔ اور کرائے کے گھر میں اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ سیماں سلیم سے تو مطمئن تھی لیکن مالی حالات سے مطمئن نہ تھی۔ اسے اچھے اچھے ملبوسات پہننے کا شوق تھا۔ زیورات کی بھی شوقین تھی۔ اچھا سا سجا سجایا گھر پانے کی بھی تمنا تھی۔

لیکن ـــ

یہ سب کچھ ایک کلرک کی تنخواہ میں کیسے پورا ہو سکتا تھا۔ شادی کے پہلے دو سال تو لڑتے جھگڑتے ہی گزر گئے۔ سلیم اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ اُلجھ پڑتی۔ وہ پریشان ہو کر پیسے بنانے کے ڈھنگ سیکھنے کے متعلق سوچنے لگتا۔ کبھی یہ سوچیں وہ اپنے تک ہی محدود رکھتا اور کبھی انہیں سیماں پر آشکار کر دیتا۔

انھیں دنوں رما کے لیے ایک رشتہ آیا۔

سیماں لڑ جھگڑ کر امی کے گھر آئی تھی۔ انہوں نے اس کے لڑائی جھگڑے کی داستان سُنے بغیر کہا۔ "رما کے لیے رشتہ آیا ہے۔"

"کہاں سے۔؟" وہ جلدی سے بولی۔

"یہیں شہر سے۔ بہت مالدار ہے۔ جائیداد بھی ہے اور کاروبار بھی۔"

"اچھا!" سیماں تنک کر بولی۔ "اپنی بیٹی کے لیے تو ایسا رشتہ نہ ڈھونڈا۔"

"اپنی اپنی قسمت ہے بیٹی۔"

"قسمت بھی بنانے سے بنتی ہے۔"

"اس کے حُسن پر وہ لوگ مفتون ہو گئے ہیں۔ ورنہ اتنا مالدار رشتہ ہمارے ایسے گھروں میں نہیں آتا۔"

سیماں کو امی کی تاویل اچھی نہیں لگی۔

"ایک نقص بھی تو ہے نا۔" امی نے آہستگی سے کہا۔

"کیا۔؟" وہ جلدی سے بولی۔

"لڑکے کی شکل وصورت واجبی سی ہے۔ اور ذرا سا لنگڑاتا بھی ہے۔"

سیماں کو جیسے تسکین ملی۔ بولی "کر دیں پھر۔ سوچتی کیا ہیں۔ مال و دولت تو ہے نا، عیش کرے گی۔"

"عیش تو واقعی کرے گی۔ لیکن یہ نقص۔؟"

"تو پھر سلیم ایسا خوبصورت کنگلا ڈھونڈ لیں اس کے لیے بھی۔" وہ جل کر بولی۔ امی نے سر ہلا دیا۔

رما کی شادی طے پا گئی۔ ان دنوں وہ سولہ سترہ سال کی تھی۔

رما نے ایک بار پھر بستر میں کروٹ بدلی۔ نرم و گداز تکیے سے سر اُٹھایا اور پھر پٹخ دیا۔ اسے اپنی پہلی شادی یاد آرہی تھی۔

سیماں ہی نے اسے بتایا تھا۔ "رما تیری شادی ہو رہی ہے۔"

"سچ۔؟" وہ ایک دم کہہ اُٹھی تھی۔

"ہاں!"

"کہاں ؟"

"یہیں اسی شہر میں "

"کس کے ساتھ ۔؟"

"ایک لڑکے کے ساتھ اور کس کے ساتھ ۔"

وہ شرما گئی تھی، لیکن من میں پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگی تھیں۔

"بہت امیر کبیر ہیں وہ لوگ ۔ تیرے تو عیش ہوں گے ۔ ڈھیر سارے گہنے جڑوا رہے ہیں ۔ تیرے لیے ۔ کپڑے بھی بڑے قیمتی خرید رہے ہیں "

رما کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا تھا۔ گہنے کپڑوں کا شوق اسے بھی بہت تھا۔ عمر کا تقاضا بھی یہی تھا۔ دُلہن بننے کا ارمان بھی دل میں تھا۔ اس عمر میں سوچیں سمجھ کا دامن تھوڑا ہی پکڑتی ہیں ۔ شترِ بے مہار ہوتی ہیں جدھر رُخ ہوا پھیل گئیں۔

ہر نوعمر لڑکی کی طرح رما نے بھی بڑے سہانے رنگین و حسین خواب سجا لیے۔ رشتہ کیسے طے ہوا۔ کیا شرائط طے ہوئیں ۔ کیسے جہیز بنا اسے کچھ پتا نہ تھا۔ وہ تو دن رات خوابوں کی دُنیا میں کھوئی رہتی جہاں اک ان دیکھا شہزادہ چپکے چپکے در آتا۔ ان خوابوں کی رنگینی اور بڑھ جاتی۔ اس شہزادے کی گمبھیر اور بوجھل آواز اس کے اندر ہل چل مچا دیتی۔

شادی کے دن تو اس کی حالت دیدنی تھی۔ بہکی جا رہی تھی۔ سہیلیاں اسے گھیرے میں لیے بیٹھی تھیں ۔ کوئی اس کے خوبصورت بالوں میں کنگھا کر رہی تھی۔ کوئی ہاتھوں پر مہندی سجا رہی تھی۔ کوئی ڈھولک پیٹ رہی تھی تو کوئی رسیلے رسیلے پیا ملن کے گیت گا گا کر اسے چھیڑ رہی تھی۔

بارات آگئی ۔ رما کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ چہرہ گلابی ہو رہا تھا بغیر کسی سج دھج کے بھی گلاب کے پھول کی طرح کھل رہا تھا ۔

نکاح ہو گیا۔ سیماں عروسی جوڑا اور چھوٹے بڑے کئی مخملی ڈبے لیے اندر آئی۔

"لو " اس نے رما کی ایک سہیلی سے کہا " جلدی سے دُلہن بنا دو ۔ رخصتی کے لیے وہ لوگ ابھی سے شور مچانے لگے ہیں "

"بہت اچھا " اس نے سیماں سے ساری چیزیں لے لیں ۔

"دیکھو " سیماں نے کہا " زیوروں کے کئی سیٹ ہیں۔ شاید چھ ہیں "

اسما نے جلدی سے ڈبے گنے۔ "ہاں "

"سارے تو نہیں پہن سکے گی "

"کیوں نہیں "

"صرف کانوں میں ایک ہی سیٹ کے بندے پہنے گی ۔ باقی سب چیزیں اسے پہنا دیں گے "

"اچھا بھئی ۔ جو زیور نہ پہنا سکو سنبھال کر ڈبوں ہی میں رکھنا اب یہ ساری تمہاری ذمہ داری ہے سمجھیں "

"بالکل ٹھیک " اس نے کہا ۔ سیماں باہر چلی گئی ۔ مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف تھی وہ سہیلیاں عروسی لباس اور زیورات دیکھنے کو بے تاب تھیں ۔

اسماء نے عروسی جوڑا نکالا ۔

یہ قرمزی رنگ کے ٹیشو کا تھا ۔ دوپٹہ بھی ویسا ہی تھا ۔ اور خوب بھاری کام اس پر ہوا تھا ۔ زیورات کے سیٹ بھی جڑاؤ اور بھاری تھے ۔ لڑکیاں بڑے رشک سے رما کو تکنے لگیں ۔

پھر —

سب نے مل کر اسے دلہن بنایا ۔ قرمزی ٹیشو کے بھاری کام والے عروسی لباس اور زیورات نے اس کے حُسن کو چار چاند لگا دیے ۔ جس نے اسے دیکھا عش عش کر اٹھا ۔ وہ خوشبوؤں میں بسی زیوروں سے لدی جگ مگ کرتے لباس میں سجی پیا گھر آگئی ۔

خواب حقیقت کا پرتو، تو ہوتے ہیں ۔

لیکن حقیقت نہیں ہوتے ۔

حقیقت کے پرتو اور حقیقت میں جو فرق ہوتا ہے ۔ وہ بسا اوقات بڑی سنجیدگی سے

زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور اس کی جڑیں ہلا دیتا ہے۔

رما کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

اس کے خوابوں کا شہزادہ جب حقیقت کے روپ میں اس کے سامنے آیا تو وہ ویسا نہیں تھا۔ رما کے خوابوں کو اک دھچکا لگا۔ دوسرا دھچکا راشد کی لنگڑی ٹانگ نے لگایا۔

لیکن ___

یہ دھچکے عارضی تھے۔ ایسے نہ تھے کہ سپنوں کی خوبصورت عمارت ان دھچکوں سے دھم سے آن گرتی۔ کم عمری کی وجہ سے رما نے یہ سب باتیں بری طرح محسوس تو کیں۔ لیکن ان سے نبرد آزما ہونے کا بھی سوچا۔ راشد نے محبتوں اور چاہتوں کی پھوار برسائی تو وہ اس کی وجودی خامیوں کو بھول کر سیراب ہونے لگی۔ چند ماہ بہت اچھے گزرے۔

پھر۔

جذبات میں ٹھہراؤ آنے لگا۔ زندگی کی اور سچائیاں بھی آنے لگیں۔

وہ اک بھرے پڑے کنبے میں بیاہی گئی تھی۔ ساس سسر نندیں جٹھانیاں سبھی اس حویلی نما گھر میں رہتے تھے۔ ساس بہو بیٹے کا پیار دیکھ کر جلنے لگیں۔ نندوں اور جٹھانیوں کو حسن ہوشربا سے حسد پیدا ہوا۔ باتیں چبھن بننے لگیں۔ رما کو ہر کسی نے اپنے تیر کا ہدف بنلیا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ راشد سے شکایت کرتی تو وہ درگذر کرنے کی بات کرتا۔

"اس گھر میں رہنا ہے رما۔ تو سب کی عزت کرنا ہوگی۔ تم چھوٹی ہو وہ بڑے اگر کوئی بات کر بھی دیں تو بُرا نہ منایا کرو۔"

وہ پہلے پہلے تو ملائمت سے اسے سمجھا دیتا۔ لیکن جب رما اپنی ناسمجھی اور ناعاقبت اندیشی کی بنا پہ اس کے سامنے ہی اس کی ماں بہنوں اور بھابیوں کو بُرا بھلا کہتے ہوئے ان کی شکایتیں اس سے کرنے لگی تو وہ جھنجھلا گیا۔

اکثر اس کی بات ان سنی کر دیتا۔

کبھی جھڑک دیتا۔

کبھی غصّے سے بُرا بھلا کہہ دیتا۔

رما کی حالت عجیب سی تھی۔ گھماؤ میں آئے ہوئے لٹو کی طرح تھی۔ کچھ سمجھ نہ پائی تھی کہ کہاں رُکے۔

حالات نے تلخی ہی کا رُخ اختیار کیا۔ تو ایک دن روتی دھوتی وہ امّی کے پاس آ گئی۔

امّی تو پہلے ہی اس کی وجہ سے پریشان تھیں رما کا کیا کرتیں۔ سمجھانا بجھانا ہی تھا۔ رما کو واپس بھیج دیا۔

کھینچا تانی جاری رہی۔

یہ بات سیماں تک بھی پہنچی۔ اس نے رما کو اپنے ہاں بلا بھیجا۔ اس کی کہانی سُنی۔ اسے سمجھانے کے بجائے اور بھڑکایا۔

"اس لنگڑے کی یہ مجال۔ شکل نہیں دیکھتا اپنی۔" وہ غصّے سے بولی۔ "سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ غریب گھرانے کی لڑکی سمجھ کر یہ سلوک کر رہا ہے۔ دیکھ لیں گے ہم بھی۔ گرے پڑے نہیں۔" سلیم نے بھی رما کو شہہ دی۔ راشد کو بُرا بھلا کہا۔ "دب کر نہیں رہنا رما۔ وہ لوگ خود ہی جھکیں گے۔"

رما اس دفعہ خوب شیر ہو کر گھر لوٹی۔

لڑائی جھگڑے جو پہلے معمولی نوعیت کے تھے۔ اب رما کے باغیانہ اور خودسرانہ رویّے سے سنجیدہ ہونے لگے۔

رما نے اب امّی کے گھر جا کر دُکھ سُکھ کی باتیں کرنا چھوڑ دیا۔ جب بھی جھگڑا ہوتا سیدھی سیماں کے ہاں جاتی۔ حالِ دل کہتی اور روتی دھوتی۔ اور آئندہ کے لیے ہدایات لے کر واپس چلی جاتی۔

حالات سدھرنے کے بجائے بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ گھر والوں کا رویّہ بھی جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔ سب اس کے حُسن سے جلتے تھے غریب گھرانے کی لڑکی کو اس گھر میں نہ دیکھ سکتے

تھے۔ طعن و تشنیع سے کام لیا جاتا تھا۔ رما کو بہن بہنوئی بھڑکاتے تھے۔ راشد کو سارے گھر والے۔ یوں میاں بیوی کے درمیان تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ رما نے اب خود بھی راشد کو لنگڑا اور بدشکلا کہنا شروع کر دیا تھا۔

اس دن بھی لڑائی ہوئی۔ رما سیدھی سیماں کے پاس چلی آئی۔ رو رو کر روئیداد سنائی۔

"ان لوگوں کے تیور ٹھیک نہیں لگتے۔" سیماں نے سلیم سے کہا۔

"واقعی۔"

"مجھے تو لگتا ہے۔ اسے گھر سے نکال کر ہی رہیں گے۔"

"ہاں سیماں۔" رما نے آنکھیں پونچھ کر کہا۔ "اب تو وہ لنگڑا بھی بات بات پہ گھر سے نکالنے کی دھمکی دے رہا ہے۔"

"تو پھر۔۔؟"

"کیا کروں میں۔۔؟"

"اپنا مستقبل سوچو۔"

"کیا سوچوں؟"

رما کی بات کا جواب اس وقت تو سیماں نے نہیں دیا۔ لیکن شام جب وہ سلیم کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ اس نے سلیم سے کہا۔

"رما کو چاہیئے اپنے ہاتھ مضبوط رکھے۔"

"یہی میں کہنے والا تھا۔"

"کافی زیور ہے اس کے پاس۔"

"لیکن وہ اسے دیں گے تھوڑا ہی۔"

"یہی تو ہم نے سوچنا ہے کہ وہ زیور کیسے ان سے لے لے۔"

"ہوں۔"

سیماں اور سلیم نے مل کر ترکیب سوچ لی۔ اس ترکیب سے رما کو بھی آگاہ کیا۔ وہ کون سی جہاندیدہ تھی۔ جذباتی سی لڑکی تھی۔ کچھ سوچا نہ سمجھا۔ ہامی بھر لی۔ اور واپس گھر چلی آئی۔ سلیم اور سیماں کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اس نے اپنے ارادے میں تبدیلی پیدا کی۔ ساس سسر، نندوں اور جیٹھانیوں سے خوش خلقی سے پیش آئی۔ بڑھ بڑھ کر کام کیے۔ راشد سے بھی معافی مانگی۔ گھر کی فضا قدرے خوشگوار ہو گئی۔

دوسرے ہفتے سیماں اس کے ہاں آئی۔ اس کی ساس نندوں سے بڑے تپاک سے ملی۔ حال احوال محبت سے پوچھا۔ رما کو بھی گلے سے لگا کر خوب پیار کیا۔

"کیسے آنا ہوا۔۔؟" رما کی ساس نے یونہی پوچھا۔

"میری نند نے اپنے بیٹے کی سالگرہ کی ہے۔ اس نے رما کو بھی بلایا ہے۔ آپ سے کہنے آئی ہوں۔ رما کو اس کے ہاں جانے کی اجازت دے دیجیے گا۔"

ساس پیار سے بولی: "لو ہم نے اس پہ کبھی کوئی پابندی لگائی ہے۔ خوشی سے جائے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" وہ بچھ بچھ گئی۔ "میں خود اسی لیے کہنے آئی تھی۔ کہ آپ سے اجازت لے لوں۔"

"ایسی کیا بات ہے۔ رما پر ایسی ویسی کوئی پابندی نہیں۔" نند نے کہا۔

"پھر بھی اجازت لینا اچھا ہی ہے نا۔" وہ انکساری سے بولی۔

"تمہاری سعادت مندی ہے بیٹی۔" ساس نے سیماں سے کہا۔

سیماں تھوڑی دیر وہاں رہی۔ سب کے دل موہ لیے۔ مروت، خوش خلقی اور سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ سب سے بڑے خوشگوار ماحول میں چائے پی۔

جاتے وقت اس نے رما سے سب کے سامنے کہا: "میرے سسرال کا معاملہ ہے اچھے سے کپڑے پہن کر آنا۔ زیور بھی پہننا ذرا رعب پڑے گا سب پر، سمجھیں۔"

رما مسکرا کر بولی: "سمجھ گئی۔"

دوسرے دن وہ خوب بن سنور کر سیماں کے ہاں جانے کے لیے تیار تھی۔ ساس نے سیف کھول دی۔

"لے لو جو کچھ پہننا ہے۔ سیماں کی سسرال جانا ہے۔ ٹھیک ہی کہتی تھی وہ، زیور ایسے موقعوں پر ہی تو پہنا جاتا ہے!"

اس نے دو سیٹ گلے میں ڈالے اور باقی ڈبوں سے چپکے سے زیور نکال کر بٹوے میں ڈال لیا۔ ہاتھوں میں جتنی انگوٹھیاں آسکتیں تھیں ڈال لیں۔ جڑاؤ کڑے اور درجن بھر چوڑیاں بھی پہن لیں۔

تقریب تو ایک بہانا تھی۔ سیماں کے گھر سے جب وہ واپس لوٹی تو زیور اس کے بدن پر نہیں تھا۔ ساس کی نظر اس پر پڑی چھوٹتے ہی پوچھا۔

"گلوبند اور ہار جو پہن کر گئی تھیں وہ؟"

"سیماں کے ہی گھر رکھ آئی ہوں۔"

"کیوں۔؟"

"شام اُترنے لگی تھی۔ اس نے کہا اتنا زیور پہن کر نہ جاؤ!"

"تمہیں تو سلیم چھوڑنے آیا تھا۔"

"ہاں۔"

"پھر زیور وہاں رکھنے کی کیا تُک تھی۔؟"

وہ جواب دیے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پھر یہی زیور اتنے بڑے جھگڑے کا سبب بنا کر گھر والوں نے رما کو دھکے دے کر نکالا۔

"زیور واپس لے کر آؤ!"

زیور اب سلیم اور سیماں کے قبضے میں تھا۔ ہاتھ آئی چیز کیسے واپس دے دیتے۔ دھوکا بازی پر اُتر آئے تھے اس لیے رما کو وہ بھڑکانے لگے۔

رما کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ دونوں اس سے اس طرح دشمنی کر رہے ہیں، وہ دوست دشمن کی تمیز نہ کر سکی۔ بات بڑھی۔ گھر والے زیور مانگتے رہے سیماں نے زیور نہ دیا۔

اور —

نوبت طلاق تک آپہنچی۔

طلاق ہو گئی۔ رما بوکھلا گئی۔ رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ وہ راشد سے بچھڑ گئی تھی۔

راشد سے۔

جو اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا جس نے اُسے پیار و محبت کے مفہوم سے آشنا کیا تھا اور جو اپنی وجودی خامیوں کے باوجود اُسے اچھا لگتا تھا۔ جو اس کا اپنا تھا لڑائی جھگڑوں کے باوجود جو اُسے تحفظ کا احساس دلاتا تھا۔

لیکن —

سیماں اور سلیم بڑے گھاگ تھے۔ نفرتوں کا غبار انہوں نے جس مقصد کے تحت پھیلایا تھا وہ پورا ہو گیا تھا۔ انھوں نے تو لمبا چوڑا پلان بنا لیا تھا۔ رما پیسہ بنانے کی مشین بن سکتی تھی، وہ رما کو اپنے ہاں لے آئے تھے اور اس پر محبتوں، عنایتوں اور نوازشوں کی بارشیں برسا رہے تھے۔ تسلی پیار اور محبت سے اس سانحے کو بھول جانے کی تلقین کرتے تھے۔

رما بستر سے اُٹھ بیٹھی۔ اپنے خوبصورت ہاتھوں کو مسلتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس کھینچی پھر دیوار پر لگے کلاک پر نگاہ ڈالی سلیم اور سیماں کو گئے گھنٹہ بھر ہو گیا تھا۔ وہ اب لوٹنے ہی والے تھے۔ وہ نبیل کے ہاں حق مہر، زیورات اور دوسری ضروری باتوں کا فیصلہ کرنے گئے تھے۔

نبیل بہت امیر کبیر آدمی تھا پہلی بیوی مر چکی تھی۔ دو سالہ معصوم سی بچی کا باپ تھا۔ اس بچی ہی کی خاطر وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔

کل نبیل کی دوسری اور رما کی تیسری شادی تھی۔

رما نے اک انگڑائی لی اور بستر سے اُٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آبیٹھی۔ برش اُٹھا

کر بالوں میں پھیرتے ہوئے اس نے آئینے میں اپنا آپ دیکھا۔

اپنا آپ۔

جو اس کے ظاہری خوبصورت پیکر کے اندر چھپا ہوا تھا۔

"رما، کیا کرتی پھرتی ہو۔ کبھی سوچا بھی ہے؟" اس وجود سے آواز نکلی۔

رما بے چین ہو گئی۔ سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس اندرونی آواز سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا۔ کوئی جوشیلی سی دُھن زور و شور سے بجنے لگی۔

"رما!" سیماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے آواز دی۔ سلیم بھی اس کے ساتھ تھا۔

رما نے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ سیماں نے بڑے جوشیلے انداز میں رما کو بازوؤں میں بھر لیا اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولی۔ "مبارک ہو۔"

"کس بات کی۔؟" وہ بولی۔

سلیم خوشی سے بہکتے ہوئے بولا: "نبیل نے ساری باتیں مان لیں۔"

"یعنی۔" رما بولی۔

"یعنی دو لاکھ نقد اس نے تمہارے اکاؤنٹ میں حق مہر کی رقم کا جمع کروا دیا ہے۔" سیماں اسے چھوڑ کر بستر پر دھم سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ساڑھے تین لاکھ کا زیور ہے۔" سلیم کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ "وہ بھی تمہارے نام لکھے گا۔"

"بڑا سادہ سا آدمی ہے۔" سیماں بولی۔ "اسے آسانی سے لوٹا جا سکتا ہے۔"

"بیچارہ۔" سلیم ہنسا۔

"بس اسے تو بچی کی فکر ہے۔ کہتا ہے رما بچی کو سنبھال لے ماں کا پیار دے دے۔ اسے بس یہی چاہیئے۔" سیماں ہنس کر بولی۔ "بچی کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ ساری دولت تمہارے قدموں میں ڈال دے گا۔"

رما کچھ نہیں بولی۔ سلیم بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

سیماں بولی: "اس دفعہ ہمیں پروگرام تبدیل کرنا پڑے گا۔"

"یعنی؟" سلیم نے پوچھا۔

"رما کو دولت بٹورنے کے لیے دو تین ماہ نبیل کے ساتھ رہنا ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں۔" سلیم بولا۔ "موٹی آسامی ہے۔ کیوں رما۔؟"

رما نے دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی اندر کی بے چینی سے دوچار تھی۔ آنکھوں میں افسردگی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج وہ اپنی شادی کی باتوں میں جوش و خروش سے حصہ نہیں لے رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" سیماں نے اس کے وجود کے اندر پھیلی بے چینی کو شاید محسوس کر لیا۔

"پریشان کیوں ہو۔؟"

"کچھ نہیں۔" رما نے کہا۔

"تیار ہو کھانا کھانے چلتے ہیں۔" سیماں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر سلیم سے بولی: "اسے باہر گھمانے لے چلتے ہیں۔ اس کی طبیعت کچھ بوجھل سی ہے۔"

"چلیے جناب بندہ حاضر ہے۔" سلیم گاڑی کی چابی اُنگلی کے گرد گھماتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

تینوں باہر نکل آئے۔

رما ماضی کی گرفت میں آئی ہوئی تھی۔ کوشش کے باوجود اس سے چھٹکارا نہ پا سکی۔ وہ سیماں کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ سلیم گاڑی چلا رہا تھا۔ گنگنا رہا تھا۔ سیماں رما سے باتیں کر رہی تھی۔ اُسے نبیل کے ساتھ کس طرح رہنا تھا کیا کچھ کرنا تھا۔ سمجھانے کے انداز میں بتا رہی تھی۔ یا نہیں یہ اُسے پتا نہیں تھا۔

رما کچھ نہیں سُن رہی تھی۔ اس کے سامنے تو ماضی کے پرت اُلٹے جا رہے تھے۔ وہ کیا تھی اور کیا بن گئی تھی۔ ہر پرت پر اس کی زندگی کے پَر تولتے رہے تھے۔

انور سے دوسری شادی سیماں ہی نے کروائی تھی۔ تیسرے مہینے ہی حالات اس طرح اُلجھ

گئے تھے کہ طلاق کی باتیں ہونے لگی تھیں۔

"طلاق دے دو۔" سیماں اور سلیم کا مطالبہ تھا۔ انور ڈیڑھ لاکھ کا زیور اور نقدی رما کو دے چکا تھا۔ آسانی سے طلاق پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن سیماں اور سلیم نے ایسا چکر چلایا کہ اُسے طلاق دیتے ہی بنی۔

یوں انہوں نے لاکھوں روپے ہتھیا لیے تھے۔ واردات کے بعد وہ شہر بدل لیتے۔ نئی جگہ جا کر کرائے پر کوٹھی لیتے۔ گاڑی بدلتے شرفا کی طرح رہنا شروع کر دیتے۔ سلیم تلاش میں رہتا۔ دونوں رما کو ہوٹلوں، کلبوں میں لیے پھرتے۔ آسامی تلاش کی جاتی۔ لوٹا جاتا اور ٹھکانہ اسی دن بدل لیا جاتا۔

"رما، رما۔" سلیم نے میز کی دوسری طرف بیٹھی رما کو پکارا۔ جو خیالوں میں گم تھی۔ ریستوران میں میزوں کے گرد بیٹھے۔ کھاتے پیتے ہنستے مسکراتے لوگوں سے بے خبر تھی۔ سیماں نے سب کی من پسند ڈشیں آرڈر کی تھیں۔ وہ ہال میں بیٹھے لوگوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ رما کی گمبھیر چپ کو اس نے نظرانداز کر رکھا تھا سلیم سے نہ رہا گیا۔

"رما!" اس نے پھر پکارا۔

"بھئی کیا بات ہے۔ آج چہک نہیں رہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

"اسے کوئی دورہ پڑا ہوا ہے۔" سیماں نے قدرے تلخی سے کہا۔ "شام سے اسی طرح گم صم ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں سیماں۔"

"پھر چپ چپ کیوں ہو۔ کوئی نئی بات نہیں۔"

"ہاں۔ نئی بات نہیں۔ تیسری بار۔ نئی نہیں ہوتی۔" کھانا آ گیا تھا۔ سیماں رما سے کچھ کہہ نہیں سکی۔

تینوں کھانا کھانے لگے۔ رما کی چپ ختم نہیں ہوئی۔ ہاں سلیم کی دلچسپ باتوں سے کچھ دور ضرور ہو گئی۔

"اس بار ہم باہر جائیں گے۔" سلیم نے رما سے کہا۔ "یورپ کا ٹور لگائیں گے۔"

"کیوں مال بہت جمع ہو گیا ہے کیا؟" سیماں نے مسکرا کر ہولے سے کہا۔

وہ رازداری سے ہنس کر بولا۔ "باہر بھی بزنس کریں گے۔ سارا خرچہ نکل آئے گا۔"

پھر رما سے بولا۔ "ٹھیک ہے نا رما۔"

اس نے یونہی سر ہلا دیا۔

رات گئے تک سلیم اور سیماں رما کو سمجھاتے رہے۔ نبیل سے دولت بٹورنے کے گُر سکھاتے سمجھاتے رہے۔

اگلی شام رما نے دلہن بن کر قیامت کا روپ دھارا تھا۔

فائیو اسٹار ہوٹل کا ہال روشنیوں اور رنگین جھنڈیوں سے سجا ہوا تھا۔ جگہ جگہ پھولوں کے ہار اور گلدستے سجے تھے۔ فضا میں ہلکی ہلکی مسحور کن موسیقی کا رس گھل رہا تھا کچھ نشستوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ کھڑے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ قہقہے لگ رہے تھے۔ عورتیں اپنے زیوروں اور لباس کی نمائش میں پیش پیش تھیں۔ ایک دوسری سے زیادہ اسمارٹ اور خوبصورت نظر آنے کا اہتمام تھا۔ محفل بھی شاندار تھی۔

رما خوبصورت عروسی جوڑے میں اور بیش قیمت زیورات سے لدی پھندی نبیل کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ لوگ اُس کے حسن سے مرعوب و متاثر تھے۔ تعریفیں ہو رہی تھیں۔ نبیل کو اُس کے انتخاب پہ داد دی جا رہی تھی۔ جسے وہ بڑی انکساری اور خلوص سے سر جھکا جھکا کر اور ہاتھ ماتھے تک لے جا کر قبول کر رہا تھا۔ وہ خود بھی خاصا ہینڈسم اور اسمارٹ آدمی تھا۔ بتیس کے لگ بھگ عمر تھی مالی خوش حالی کا عکس اس کے چہرے پر تھا۔ خود اعتمادی اور وقار کا نمونہ تھا۔ اس وقت اس کا شمار شہر کے متمول بزنس مین میں ہوتا تھا۔

سیماں اور سلیم بہت خوش تھے۔ خوب چہک رہے تھے۔ اس وقت وہ رما کے بھائی اور بھابی بنے ہوئے تھے۔ نبیل کے رشتہ داروں سے وہ اسی رشتہ سے متعارف ہو رہے تھے۔ رما

کے متعلق انہوں نے یہاں بھی کہانی گھڑلی تھی۔

"سولہ سال کی تھی جب شادی ہوگئی سسرال والوں نے ٹکنے ہی نہ دیا۔ اتنے ظلم توڑے کہ بیان نہیں کیے جاسکتے۔ تیسرے مہینے ہی طلاق ہوگئی۔ اتنی معصوم اور بھولی بھالی ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ تین سال اس نے جس طرح گزارے ہیں ہم سے پوچھیے۔ شادی کے لیے سینکڑوں پیغام آئے تھے۔ لیکن یہ اتنا ڈر گئی کہ شادی کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ یہ تو نبیل کی خوش بختی ہے کہ یہ مان گئی۔"

لوگ رما کے حوصلے اور صبر کی داد دیتے ہوئے نبیل کی خوش نصیبی کی باتیں کر رہے تھے۔

نبیل واقعی خوش تھا۔

کھانے کے بعد موسیقی کا پروگرام تھا جو رات ایک بجے تک جاری رہنا تھا۔ لیکن مہمانوں کو شاید رحم آگیا۔ نبیل کے ایک دوست نے ہنس کر کہا "بھئی تم دونوں تو جاؤ اپنے گھر۔ یہ محفل بھی رہے گی۔ بھابی کی طرف سے مسٹر سلیم اور مسز سلیم ہیں۔ تمہاری طرف سے ہم ہیں۔" نبیل مسکرا کر بولا "کوئی بات نہیں۔ سب دوست جمع ہیں۔ ایسے موقعے روز روز تو نہیں آتے۔"

"بھابی سے پوچھ لو۔" دوسرے دوست نے چھیڑا۔

رما نے شرما جانے کی ایسی لاجواب اداکاری کی کہ سامنے کھڑی سیماں قربان ہو ہوگئی۔ رات دو بجے کے قریب نبیل رما کو اپنی شاندار گاڑی میں اپنے پہلو میں بٹھا کر اپنے گھر لے آیا۔ نبیل کی کوٹھی شہر کے خوبصورت ترین علاقے میں تھی۔ کوٹھی کی شاندار عمارت کئی ایکڑ رقبے میں گھری تھی۔ خوبصورت اور نفاست سے لگائے گئے چمنوں میں گھری ہوئی تھی۔

بات صرف خوبصورتی امارت اور نفاست سے آراستگی کی ہوتی تو شاید رما اس قدر مرعوب و متاثر نہ ہوتی۔ لیکن اسے تو اس کمرے میں آتے ہی یوں لگا تھا جیسے کسی فردوسی رعنائیوں سے منور گوشے میں آگئی ہو۔

جیسے مضبوط چار دیواری کے اندر محفوظ ہوگئی ہو۔

جیسے امن سکون اور شفقتوں کے سایوں میں لپٹ گئی ہو۔

جیسے۔

جیسے۔

ماں کی ممتا بھرے سینے میں سما گئی ہو۔

اس کی زندگی بھر کی بھوک اس کمرے میں آتے ہی جانے کیسے مٹ گئی اور وہ خلا جو نہ امی کی شفقت سے بھرا تھا نہ کسی شوہر کی محبت سے اس بیڈروم میں آتے ہی بھر گیا۔

نبیل کے اندر آنے سے پہلے ہی وہ مطمئن اور شاد تھی۔

نبیل آیا۔ گھونگھٹ تو تھا نہیں۔ پھر بھی رما نے سر جھکا رکھا تھا۔ نبیل نے بڑی آہستگی سے اس کا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور اس کی حسین شرگیں آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے مستحکم آواز میں بولا۔

"رما۔ ہم ایک نئی زندگی کی ابتدا کر رہے ہیں۔ میں یہ ابتدا خلوص اور اعتماد کی بنیادوں پہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ یہی اک کامیاب زندگی کی اساس ہیں۔ بولو میرا ساتھ دو گی۔"

الفاظ رما کے کانوں میں اترے اور روح کی گہرائیوں میں اترتے گئے۔ وہ سرتاپا کانپ گئی۔ اپنے سابقہ کردار اور آئندہ پلان کی روشنی میں اپنے آپ کو دیکھا۔ نبیل کے خلوص اور اعتماد کو محسوس کیا۔ گھبرا کر اس نے اپنا چہرہ نبیل کے ہاتھوں سے چھڑا کر گھٹنوں پہ رکھ لیا۔

نبیل نے اسے رما کی حیا اور ادائے دلربائی جانا۔ محظوظ بھی ہوا اور اس پہ ٹوٹ کر پیار بھی آیا۔ لیکن اپنے جذبات پہ قابو رکھا۔

"رما!" اس نے گمبھیر آواز میں بیڈ کے سرے پہ بیٹھے بیٹھے جھکی ہوئی رما کو پکارا۔ وہ ویسے ہی بیٹھی رہی۔ اس کے من میں کتنی ہلچل تھی۔ کیسا طوفان تھا۔ کیا اتار چڑھاؤ تھے نبیل نہ جان پایا۔

"رما!" اس نے پھر پکارا۔

"جی!" وہ اسی انداز میں گھٹنوں پہ سر رکھے مریل سی آواز میں بولی۔

"میرے حالات سے تمہیں آگاہی ہے نا" وہ چپ رہی۔ "میری ایک بچی ہے" وہ اب بھی نہیں بولی۔

نبیل چند لمحے چپ رہا۔ پھر اُس نے رما کا جھکا ہوا سر اُٹھایا۔ اس کی ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ کا سہارا دیتے ہوئے اُس کا چہرہ اُونچا کیا۔

"رما! میں نے شادی کی ہے۔ بیشک یہ میری ضرورت تھی لیکن یقین مانو مجھے اپنے لیے بیوی سے زیادہ اپنی بچی کے لیے ماں کی ضرورت تھی" وہ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

رما نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اتنی پاکیزگی اور اتنا تقدس تھا کہ رما کو اپنا سارا وجود انتہائی گھناؤنا لگا۔ وہ بے طرح گھبرا گئی۔

ایک بار پھر اس نے اپنا چہرہ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ اور گھٹنوں پہ رکھ لیا۔ نبیل اس کی ذہنی دماغی اور دلی کیفیات سے بے خبر تھا۔ وہ بچی کے متعلق اسے بتانے لگا۔ بچی سے اسے بے حد پیار تھا۔ وہ اُس کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اس کے پاس بے انتہا دولت تھی۔ "ممتا اگر خریدی جانے والی چیز ہوتی تو میں معصومہ کے لیے کب کا خرید چکا ہوتا" وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

رما سنتی رہی۔

"میں نہیں چاہتا کہ میری بچی کی زندگی میں کوئی خلا رہ جائے۔ یہ خلا ماں کی محبت کا خلا ہے۔ کیا تم یہ خلا بھر سکو گی!" اس نے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"بولو رما۔ جواب دو۔ یہ خلا بھرنے کی کوشش کرنے کی ہامی تو بھر سکتی ہو۔ بھر سکو گی"

"ہاں۔ ہاں۔ ہاں" وہ ایک دم جیسے چیخ اُٹھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام لیا تھا۔ آنکھیں بند کر لی تھیں اور سر اِدھر اُدھر مارتے ہوئے ہاں ہاں کہہ رہی تھی۔

"رما!" نبیل کچھ پریشان سا ہو گیا۔

رما نے جلدی سے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ پھر بڑے جذباتی لہجے میں بولی "یہ خلا میرے اندر بھی ہے نبیل میرے اندر بھی۔ میں اس خلا میں اس بچی کو بھر لوں گی۔ چلو مجھے اس بچی سے

ملاؤ۔ دکھاؤ مجھے۔ لے چلو اس کے پاس"

وہ بستر سے اُترنے لگی۔ نبیل نے اسے ملائمت سے روکتے ہوئے کہا "وہ سو رہی ہے صبح مل لینا" لیکن رما نے اسے اسی وقت دیکھنے کی ضد کی۔ وہ بیڈ سے اُتر آئی۔

"چلیے" اس نے نبیل سے کہا۔

نبیل نے بڑے پیار سے اسے دیکھا اور پھر بازو بڑھا کر اس کے وجود کو سمیٹ لیا۔ چند لمحوں بعد وہ معصومہ کے کمرے میں تھے۔

وہ بے خبری کے عالم میں پڑی سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اتنی معصومیت اور پاکیزگی تھی کہ رما اسے چھوتے ہوئے ڈر گئی۔

"بڑی گہری نیند ہے اس کی جاگے گی نہیں" نبیل نے پیار سے رما کو دیکھا وہ سمجھا شاید رما اس کے بیدار ہو جانے کے خوف سے اسے چھو نہیں رہی۔

رما حواس باختہ سی کھڑی اسے تکے گئی۔

نبیل جھکا اور بستر سے بچی کو اُٹھایا۔

"یہ تھام لو اسے۔ یہ میری امانت ہے رما" اس نے بچی کو رما کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے کہا "شاید تمہیں اچھا نہیں لگ رہا۔ اِس رات کی ابتدا ہم ذمہ داریوں سے کر رہے ہیں۔ لیکن رما میں نے کہا نا مجھے اس بچی کے لیے ایک ماں کی ضرورت ہے۔ اسے ماں کا پیار دو گی نا۔ اسے ماں بن کر پالو گی نا۔ اس کے کردار کو مضبوط اور اخلاق کو قابلِ رشک بناؤ گی نا۔ اسے اک نیک سیرت اور پاکباز"

رما تھر تھر کانپ رہی تھی۔ بچی کا بوجھ اس سے سنبھالا نہ گیا۔ نبیل نے جلدی سے بڑھ کر بچی اس کے ہاتھوں سے لے کر بیڈ پر ڈالی۔ اور لہراتی ہوئی رما کا وجود بازوؤں میں بھر لیا۔

رما بے جان سی ہو رہی تھی، جسم ڈھیلا پڑ رہا تھا اور نیم بے ہوشی کی کیفیت تھی۔ نبیل گھبرا گیا۔ رما کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور اپنے بیڈ روم میں لا کر بستر پر ڈال دیا۔

"رما۔ رما" وہ اس کا کندھا ہلاتے ہوئے پکار رہا تھا۔ نادم بھی تھا متاسف بھی کہ سہاگ

رات رما سے عشق و محبت کے فاصلے پھلانگنے کے بجائے اپنی غرض کی کتھا سنانے لگا۔

کئی لمحوں بعد رما نے آنکھیں کھول دیں۔ اردگرد دیکھا۔ ماحول سے خوگر ہوئی۔ نبیل کو پہچانا۔

"کیا ہوا تمھارا رما۔؟" نبیل نے اس پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

وہ اُٹھ بیٹھی۔ وہ سخت پریشان تھی۔

اس کی پریشانی سے نبیل اور پریشان ہوگیا۔

"کیا ہوا تھا؟ معاف کرنا میں نے تمہیں بے جا باتوں میں۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

رما نے نفی میں سر ہلایا اس کی خوبصورت آنکھوں میں ساون کے گھنے بادل لہرا رہے تھے۔

"مجھے۔ اپنی بچی کے متعلق آج رات تم سے۔ ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے تمہیں معذرت خواہ ہوں کہ تمہیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔" وہ بے اختیارانہ روتے ہوئے کہہ اُٹھی۔

"پلیز رما۔ معاف کردو۔" وہ بے طرح گھبرا گیا۔

رما بے بسی سے رونے لگی۔ ساون بھادوں کی جھڑیاں لگ گئیں۔ روتے روتے وہ نڈھال ہوگئی۔

نبیل کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا کہ کیا کرے۔ ہر پھر کر یہی ندامت محسوس ہو رہی تھی کہ آج کی رات اسے رما سے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔

"رما۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے معصومہ کے لیے تمہیں یوں مجبور نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم معصومہ کو یقیناً ماں بن کر۔"

"میں اس قابل نہیں ہوں نبیل۔ اس قابل نہیں ہوں۔" وہ بڑے جذباتی اور بے اختیارانہ انداز میں چیخ اُٹھی۔

"مجھ پر اعتماد نہیں کرو۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھتے ہو۔ میں نیک اور پارسا نہیں ہوں۔ مخلص اور ۔"

"رما۔" اب نبیل کی گھبراہٹ اور نوعیت کی تھی۔ اس نے رما کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے

ہوئے بے تابی سے کہا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں۔ میں بہت بُری ہوں نبیل۔ بہت بُری ہوں۔ مجھ پر اعتماد نہیں کرو۔ ہمدرد سا نہیں کرو اپنی پاکیزہ اور معصوم بیٹی کے لیے مجھ پر تکیہ نہ کرو۔ میں کسی قابل نہیں ہوں۔"

وہ چیختے چلاتے جذبات کی شوریدہ سر موجوں سے ٹکراتے ہوئے بے اختیارانہ کہے جا رہی تھی۔

نبیل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ موقعہ کی نزاکت کو کیسے سنبھالے۔ رما کے جذباتی پن سے کیا اخذ کرے۔

وہ اُٹھا اور نفیس بلّوریں گلاس میں پانی بھر کر رما سے کہا۔ "رما پلیز ہوش میں آؤ۔ یہ پانی پی لو۔" رما نے گلاس پرے ہٹا دیا۔

وہ اب بھی کانپتے ہوئے فق رنگت لیے لرزتے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبائے آنکھیں میچے اور کھولتے یہی دُہائی دے رہی تھی۔

"مجھ پر اعتبار نہ کرنا نبیل! مجھ سے خلوص کی توقع نہ رکھنا۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔" اس نے کئی بار یہی کہا۔

تو نبیل نے گلاس واپس میز پہ رکھ دیا۔ اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے سپاٹ آواز میں پوچھا۔ "تم۔ تم یہ نہیں ہو۔ تو پھر کیا ہو!"

رما نے پوری آنکھیں کھول دیں۔ نبیل کو دیکھا۔ بے اختیارانہ اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔

پھر اس کے ہاتھ ٹوٹی شاخوں کی طرح گر گئے۔ وہ خوفزدہ سی ہوگئی۔

"تمہیں کیا ہو رہا ہے؟" نبیل نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "لیٹ جاؤ۔ تھوڑی دیر کے لیے آرام کرو۔ تم سخت پریشان لگ رہی ہو۔"

نبیل نے اسے زبردستی لٹاتے ہوئے کہا۔ "چپ چاپ لیٹی رہو۔ تم بہت نروس ہو رہی ہو۔"

"ہیں۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی نبیل۔ سب کچھ" وہ ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔

"میں ضرور پوچھوں گا۔ ضرور سنوں" نبیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے لیٹے رہنے کو کہا۔

"میں تمہیں دھوکا نہیں دے سکتی۔ پتا نہیں کیوں تمہاری بچی کی پاکیزہ اور معصوم صورت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے نبیل۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ سب کچھ۔"

"اچھا ابھی بتا دینا۔ پہلے اپنے آپ کو سنبھالو۔" نبیل بیڈ کی پٹی پر بیٹھا تھا "لیٹی رہو۔"

لیکن وہ اُٹھ بیٹھی۔ اک عزم، اک حوصلے اور اک جذبے کے ساتھ۔

گو وہ اب نروس نہیں تھی۔ لیکن جذبات کی موجوں سے اب بھی نبرد آزما تھی۔

"نبیل" اس نے اک گہری سانس لے کر کہا۔ اُس کی آنکھوں کے گوشے بھیگے تھے۔ لب کپکپا رہے تھے اور آنکھوں میں ویرانی کی دھول تھی۔

"ہوں" نبیل اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش میں آواز کو پُرسکون بنا رہا تھا۔

"نبیل میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا لیکن تمہیں بتا دوں گی۔"

"ہوں" وہ کوئی بھی غیر متوقع بات سننے کو تیار ہو رہا تھا۔

"لیکن۔ لیکن۔" وہ پھر جذباتی ہو کر رونے کو تھی۔

"ہاں ہاں کہو۔ رما۔ پلیز حوصلے سے کام لو۔ جو کہنا ہے کہہ دو۔"

"نبیل۔ میں جانتی ہوں تم مجھے معاف نہیں کر سکو گے۔" وہ بہتے آنسوؤں کو پونچھے بغیر بولی۔ نبیل چپ رہا۔

"لیکن ایک بات۔ صرف ایک بات مان لینا۔"

"تم کچھ کہو تو سہی۔"

"کہہ دوں گی۔ سب کچھ کہہ دوں گی۔ اس کے بدلے میں کچھ بھی نہیں چاہوں گی۔ دھن نہ

دولت۔ صرف ایک درخواست ہے۔ اپنی بچی مجھے سونپ دینا۔ میں اُسے ماں کا پیار دوں گی۔ ممتا کے سوتوں کے منہ۔"

نبیل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ بیتابی سے پوچھا "کچھ کہو تو سہی۔ جب تک کچھ بتاؤ گی نہیں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

وہ بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے بولی "وعدہ تو کر سکتے ہو۔ بچی کی ماں سمجھ کر نہیں آیا سمجھ کر رکھ لینا۔ میں۔ میں۔"

نبیل کا ذہن ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ پریشانی حد سے بڑھ گئی تھی۔ رما کیا کہنے والی تھی۔ اس بات کا اُسے علم تو نہیں تھا لیکن یہ احساس ضرور تھا کہ وہ کوئی بھیانک اور بدترین بات کہنے والی ہے۔

پھر بھی اس نے اپنے حواس پر قابو رکھا۔ آہستگی سے بولا۔

"اب تو جو ہو چکا سو ہو چکا۔ میں ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔ باقی تمہارے متعلق میں بنا سُنے کیا فیصلہ کر سکتا ہوں۔ بہتر یہی ہے تم تھوڑی دیر آرام کر لو میں بھی بہت تھک گیا ہوں۔ میں دوسرے کمرے میں۔"

"نہیں" نبیل اُٹھنے کو تھا کہ رما نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ نبیل نے محسوس کیا وہ تھر تھر کانپ رہی ہے۔

نبیل پھر بیٹھ گیا۔ اس کی ذہنی حالت قابلِ رحم تھی۔

وہ روتے ہوئے بولی "نبیل یہاں سے نہ جاؤ۔ پہلے سن لو۔ فیصلہ کر لو۔ مجھے سننے سے پہلے تو اپنی رفاقت۔"

نبیل کچھ نہیں بولا۔ رما کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

کئی بے سکون لمحے بے رحمی سے ذہن کو نوچتے کھسوٹتے گزر گئے۔ پھر رما نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ہمت بحال کی بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"نبیل! میں وہ نہیں ہوں، جو سمجھ کر تم مجھے بیاہ کر لائے ہو۔"

"تو پھر کیا ہو...؟" نبیل جھلایا۔

رما اس کی جھلاہٹ کی پروا کیے بغیر بولی: "میں کیا ہوں، سب بتاتی ہوں۔"

اور۔۔

اس نے شروع سے لے کر آخر تک اپنی رام کہانی کہہ سنائی۔ کچھ نہیں چھپایا، ساری سچائیاں کھول کر رکھ دیں۔

نبیل تو جیسے پتھرا ہی گیا۔

رما نے روئیداد ختم کی۔ نبیل کے کسی فیصلہ کا انتظار کیے بغیر وہ اُٹھ کر ڈریسنگ روم میں گئی۔ عروسی لباس اُتارا۔ زیور بھی سارے اُتار ڈالے۔ اک سادہ سا جوڑا نکالا اور باتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر میک اپ تک اُتار آئی۔

وہ واپس کمرے میں آ گئی۔ بیڈ کے دوسری طرف کھڑے ہو کر نبیل کو دیکھا۔ وہ تو اب بھی اسی انداز میں بیٹھا تھا۔ سُن ہو گیا تھا جیسے۔

"نبیل!" رما نے بے جان آواز میں پکارا۔

نبیل نے اُس کی طرف دیکھا۔ دیکھتا ہی رہا۔ زبان سے کچھ نہیں بولا۔

رما چند لمحے چپ چاپ کھڑی رہی۔

کمرے میں بوجھل سی خاموشی کا کرب جان لیوا تھا۔ یوں لگتا تھا دم لیتی کائنات کا دم ایک دم ہی گھُٹ گیا ہے۔

"نبیل!" رما کی آواز جیسے بہت دور سے آئی۔

نبیل نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ آنکھیں میچ کر کھولیں۔ اُس کے چہرے سے کسی ڈراؤنے خواب کا تاثر چھلک رہا تھا۔

اس نے دو تین بار ایسے ہی کیا۔

"نبیل!" رما نے پھر افسردہ سی آواز میں کہا۔

"ہوں۔"

"مجھے... گھر چھوڑ آؤ۔" ٹوٹتے لہجے میں رما بولی۔

"کون سے گھر؟" بے اختیارانہ نبیل کے منہ سے نکلا۔ وہ سرعت سے اُٹھ کھڑا ہوا اور رما کے عین سامنے آ گیا۔

چند لمحے پھر دردناک سی خاموشی کا تسلط رہا۔ دونوں پتھریلے ایستادہ مجسموں کی طرح آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"کس گھر جانا چاہتی ہو؟" بالآخر نبیل نے سرد لہجے میں پوچھا۔

رما نے صرف دُکھی نظروں سے اُسے دیکھا۔ ان نظروں میں کیا تھا، نبیل مضطرب ہو گیا۔ تڑپ اُٹھا۔

"تم اس گھر میں آ چکی ہو رما۔ یہ گھر تمہارا ہے۔" نبیل نے آہستہ آہستہ لیکن مستحکم لہجے میں کہا۔

"نبیل!" رما شاید ان الفاظ کی سچائی کی متحمل نہ ہو سکی۔ ایک بار پھر لہرا گئی۔

نبیل نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔

ہمت واستطاعت سے بار کوئی بھی زیادہ ہو تو سنبھالنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ بار خوشی کا ہو یا غم کا سنبھل نہیں پاتا۔

"رما! تم نے جس ہمت سے مجھے اپنے ماضی کا آئینہ دکھایا ہے اس نے میری ہمتیں بھی بڑھا دی ہیں۔ مجھے یہ سچ کہہ لینے دو کہ میں بھی اب تک فریب دیتا آیا ہوں۔ میں نے بھی تم سے پیشتر کئی لڑکیوں کو اسی طرح سہاگن بنایا، اور پھر ان کا جہیز ہتھیا کر انہیں چھوڑ دیا کرتا۔ پھر قدرت نے مجھے ایک بیٹی کا باپ بنا دیا۔ اس کی ماں اسے جنم دیتے ہوئے فوت ہو گئی۔ جب میں باپ بنا تو مجھے احساس ہوا کہ دوسروں کی بیٹیوں کی زندگی سے کھیلنا کس قدر خوفناک عمل تھا۔ مجھے اپنی بیٹی کے لیے ایک ماں

کی ضرورت تھی۔ میں چاہتا تھا، کہ ایسی لڑکی سے شادی کروں جو خود دکھی ہوتا کہ وہ میری بیٹی کا درد محسوس کر سکے۔ اسے ماں کا پیار دے۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنے ماضی کا سایہ بھی اس پہ ڈالوں۔ یہی سوچ کر اس بار غرض سے پاک ہو کر تم سے دامنِ امید باندھا تھا۔"

نبیل نے ایک لمحے فق ہوتی ہوئی رما کو دیکھا اور پھر بولا۔

"لیکن رما! آج احساس ہوا کہ دھوکا دینا کس قدر آسان اور اس کا وار سہنا کس قدر تکلیف دہ ہے۔ مجھے یقین ہے تم بھی مجھے معاف کر دو گی جس طرح میں نے تمہارے تمام داغوں کو اپنے ذہن سے محو کر دیا ہے۔ آؤ رما! وعدہ کریں کہ اب کبھی کسی اور دھوکے کو زندگی میں جگہ نہ دیں گے۔ میں تھک چکا ہوں رما بہت تھک چکا ہوں۔"

جذباتی لمحے بیت چکے تو نبیل نے رما کو بیڈ پہ لٹا دیا۔

وہ باتیں کرتے رہے۔

اور رات بیت گئی۔

عین اس وقت جب مسجدوں سے موذنوں کی اذانیں نئی صبح کے طلوع ہونے کا مژدہ سنا رہی تھیں۔

رما اور نبیل ایک دوسرے کا ہاتھ ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے خدائے بزرگ و برتر سے اپنی ازدواجی زندگی کی طلوع ہونے والی نئی صبح کی کامیابی و کامرانی کی دعا کر رہے تھے۔

اب کے بچھڑے

ابا کو فوت ہوئے بارہ برس بیت گئے تھے۔ ان بارہ برسوں کی چھاپ اس کے چہرے پر لگ گئی تھی۔ آئینے کے سامنے بیٹھی وہ اپنے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ وقت اس پر کیسے بیت گیا ہے۔ تب وہ بیس برس کی تھی۔ چمکیلی صاف شفاف دھوپ کی طرح۔ کندنی، سنہری [illegible] ہے [illegible] دھوپ کی طرح۔ لیکن برس چپکے چپکے بیت گئے تھے۔ اور اب چمکیلی سنہری دھوپ [illegible] لاگئی تھی۔ لگتا تھا شام اتر آئی ہے، اُجالے میلے ہو گئے ہیں۔ روشنی کو اندھیرا نگل رہا ہے جگہ جگہ چمکنے والے نقوش اب مدھم روشنی میں بے ڈھنگے اور غیر واضح سے نظر آنے لگے ہیں۔ اس نے غور سے اپنا آپ آئینے میں دیکھا۔ آئینہ دنیا کی واحد شے ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔ سب کچھ سچ سچ کہہ دیتا ہے۔ عرشہ کو بھی اس نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا۔ اس کا خوب صورت سا اسمارٹ جسم اب مائل بہ فربہی تھا چہرے کی نرم و نازک جلد کرختگی کے روپ میں ڈھل رہی تھی۔ گہری گہری حسین آنکھوں کے کناروں پر جلد سکڑ کر سلوٹیں سی ڈال گئی تھی۔ ہونٹوں پہ تازگی کے بجائے تشنگی کا سوکھا پن پھیل چکا تھا۔ گالوں کے ابھار ڈھلنے لگے تھے۔ ماتھے پہ سوچوں کی ان گنت لکیریں تھیں۔ بالوں میں روکھا پن تھا۔ چمک تو نام کو نہیں تھی۔

وہ بھورے بھورے اپنے روکھے سوکھے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے کچھ اداس سی ہو رہی تھی۔ بارہ برس اس پر بڑی بے رحمی سے بیت گئے تھے۔

بارہ برس

جنھوں نے زندگی کے دھاروں کا رُخ ہی بالکل انجانی سمت پھیر دیا تھا۔ قدم متعین راستوں سے از خود ہٹ کر دوسری ڈگر پر اٹھنے لگے تھے۔ یہ سب کچھ جذباتی طور پر نہیں ہوا تھا۔ ابا کی اچانک موت ہی نے سب کچھ کر دیا تھا۔ اس کے ہلکے پھلکے نازک کندھوں پر ذمے داریوں کا بوجھ ڈال کر خود آنکھیں موندلی تھیں۔ بیمار تو امی رہتی تھی۔ لیکن مر ابا گئے تھے۔ کتنی ہی دیر تو یہ ٹنگ اسے سمجھ ہی نہ آئی تھی۔

ان دنوں اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ بی اے فرسٹ ڈویژن میں کرنے کے بعد اس نے آگے پڑھنے کے لیے اصرار کیا تھا۔ اصرار حق بجانب بھی تھا۔ اتنی قابلیت ہو تو پڑھنے سے روکنا ابا کے نزدیک مستحسن نہیں تھا۔ حالانکہ اماں نہیں چاہتی تھیں کہ اب وہ مزید مغز کھپائی کرے۔ ہر ماں کی طرح انہیں بھی اس کی شادی کی فکر تھی۔

"کیا ضرورت ہے آگے پڑھنے کی۔ بی۔ اے تک تعلیم کافی ہے"۔ اماں نے ابا سے کہا۔ "اب پڑھانے کے بجائے اس کو بیاہنے کی فکر کرو۔"

ابا اماں کی عقیلی باتوں کو مسکرا کر نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔ "بیاہ بھی کرلیں گے۔ پہلے ایم اے تو کرلے۔"

"ایم اے کر کے کیا کرے گی۔ دو سال جوانی کے اور گنوا دے گی نا۔ دماغ اور اونچا ہو جائے گا۔ اچھے بھلے رشتوں میں بھی کیڑے نکالے گی۔ یہی ہوگا نا۔"

ابا کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ پھر بولے۔ "اچھے بھلے رشتے آئے نا، تو کیڑے نکالنے نہیں دوں گا میں۔ ابھی تک کام کا رشتہ بھی نہیں آیا۔"

"کیوں نہیں آیا۔ جس حیثیت کے ہم لوگ ہیں، رشتے بھی تو اسی حیثیت کے آئیں گے۔"

"ہم کوئی گرے پڑے نہیں بیگم عصمت صاحبہ۔ مانا کہ متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔ زر زمین اتنا زیادہ پاس نہیں۔ پھر بھی شرافت و نجابت خاندانی ہے۔ لڑکی خوبصورت ہے، لائق فائق ہے، بے داغ کردار کی ہے۔"

"ان چیزوں کو آج کل کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ دولت کی شمع پر لوگ پروانوں کی طرح گرتے ہیں۔ جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ لے دے کے تمہاری تنخواہ ہی ہے نا۔ زائد آمدنی تو کوئی ہے نہیں۔ اسی میں سے کھانا پینا اوڑھنا پہننا، سردی گرمی سے نباہ کرنا اور اسی میں سے بچیوں کو بیاہنا ہے۔"

"بچیوں کو۔ ارے بھئی ابھی صرف ایک بچی کی فکر کرو دوسری بے چاری تو ابھی آٹھ سال کی ہے برشہ کی فکر میں مت گھلا کرو ابھی سے بہت برس پڑے ہیں۔ اور اس کے بڑے ہونے تک حسنات بھی خیر سے کمانے لگے گا۔ یہ ذمے داری اس کے کندھوں پر ڈال دیا کرو۔"

"ہو جبھی حسنات تو جوان ہو کر کمانے لگے گا نا، ابھی سے کیا دس گیارہ برس کے بچے کے کندھوں پہ ذمے ڈالو گے۔"

"بھئی عرشہ کی نہیں برشہ کی ذمے داری۔"

"تم ابھی عرشہ کی بات سوچو۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔"

"ایم اے میں داخل کرانے پر جو خرچہ کرو گے، وہ اس کے جہیز کی کوئی چیز خریدنے پر صرف کردو۔"

"میں اس کے لیے زیور خرید رہا ہوں۔"

"زیور!"

"ہاں شنا نہیں، تم نے علم زیور ہے۔ جو بچی اس زیور سے پوری طرح آراستہ ہوگی۔ کیا کہنے اس کی سج دھج کے۔ لوگ اندھے تو نہیں ہوتے۔ یہ زیور بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے۔ اہلِ بصیرت اس کی افادیت کو جانتے ہیں۔ اس لیے فکر نہ کرو۔ ایم۔ اے کرے گی۔ تو اچھے اچھے رشتے آپوں آپ آجائیں گے۔ میں اپنی عرشہ کی شادی کسی بہت اچھے خاندان کے بہت ہی اچھے لڑکے سے کروں گا۔"

"بہت اچھے خاندان کے بہت اچھے لڑکوں کو لوگ جہیز کے ترازو میں تولتے ہیں۔"

"ایسے ہی باتیں بنی ہوئی ہیں۔ روشن خیال روشن دماغ لوگوں کی شرح اتنی محدود نہیں ہوتی اور پھر۔ ہم بھی عرشہ کو کچھ نہ کچھ دے دلا کر ہی رخصت کریں گے۔ ایک ہی تو شادی کرنی ہے ہم نے۔

دوسری بیٹی کی ذمّے داری تو حسنات میاں کی ہوگی "

"بڑی خوش فہمیاں ہیں "

"جو پوری ہوں گی۔ دیکھ لینا۔ حسنات میرا بچہ ہے۔ بہت حساس فرمانبردار اور ذمّے دار "

"میں برشہ کے لیے فکرمند نہیں ہوں، وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ میں بات عرشہ کی کر رہی ہوں۔
میری مان لیں۔ اس کو ایم۔ اے کرانے کے بجائے اس کے لیے رشتہ تلاش کریں "

"رشتے تلاش نہیں کیے جاتے "

"تو پھر کیسے طے ہوتے ہیں؟"

"اللہ میاں نے بندھن باندھ دیے ہوتے ہیں جس سے بندھن بندھا ہوتا ہے۔ وہ آپوں
آپ کہیں نہ کہیں سے آجاتا ہے "

"آ نہیں جاتا۔ تلاش کیا جاتا ہے "

"میرا تو یہ ایمان نہیں "

"مجھے تو آپ کی باتوں کی بالکل ہی سمجھ نہیں آتی بعض اوقات "

"اکیتس برسوں میں بھی مجھے سمجھ نہیں پائیں۔ تعجب کی بات ہے "

اماں کے سمجھانے بجھانے کے باوجود ابا نہیں مانے ایسی باتیں ایسی بحثیں روز ہی ہوتی رہیں۔
اماں نے سفید پوشی کا واسطہ دیا۔ اپنی طبیعت کی نرمی گرمی کے متعلق بتایا۔ لیکن ابا کو تو اسے .... ایم۔ اے کرانے کی دُھن تھی۔ اپنی جگہ اماں بھی سچی تھیں۔ کہ جس ماحول اور معاشرے میں رہ رہی تھیں اس کا تقاضا یہی تھا کہ بچی کے ہاتھ پیلے کر دیتیں۔ اور اپنی جگہ ابا بھی ٹھیک کہتے تھے۔ دُنیا دیکھی تھی۔ بہت سے ممالک گھوم پھر کر لوگوں کو دیکھ چکے تھے۔ ترقی یافتہ ممالک کی عورتیں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوکر ملک کی خدمت کر رہی تھیں۔ اپنا آپ سنبھال رہی تھیں۔ خاندان کی دیکھ بھال کر رہی تھیں عرشہ بھی ایم اے کر کے زیادہ باشعور ہو سکتی تھی روشن خیال بن سکتی تھی۔ ضرورت پڑنے پر نوکری کر سکتی تھی۔ شادی کے بعد بہ طریقِ احسن گھر کی دیکھ بھال کر سکتی تھی۔ شوہر کے شانہ بشانہ کماکر

گھریلو ذمّے داریاں اٹھا سکتی تھی

ابا نے تو یہی سوچا تھا۔

عرشہ بھی ایم۔ اے میں داخلہ لینے کے لیے اصرار کر رہی تھی۔

اماں کی ایک نہ چلی۔ اور عرشہ نے ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا۔

عرشہ بہت خوش تھی۔ یونیورسٹی کی فضا کالج کی فضا سے یکسر مختلف تھی۔ یہاں زندگی محدود نہیں تھی۔ حیات کا کینوس بڑا وسیع تھا۔ مخلوط تعلیم عرشہ کا نیا تجربہ تھا۔ اس نے جلدی ہی محسوس کر لیا کہ یہاں جھجکنے سمٹنے سے کام نہیں چلے گا۔ جسارت، ہمت اور عالی حوصلگی کام دے گی۔ بہت سے لڑکے اس کے گرد منڈلانے لگے۔ نوجوان استادوں نے بھی اس میں دلچسپی ظاہر کی۔ پروفیسر ندیم عثمانی نے تو اس کا اتا پتا معلوم کر کے پرپوزل دینے کا بھی سوچ لیا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ عرشہ کو زندگی کی بہت سی خوب صورتیوں کا احساس تواب ہوا تھا۔ اور خوب صورتیوں کو اور خوب صورت کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ اسے یہ سلیقہ بھی آگیا تھا۔ جوڑ کے لڑکیاں اسے اچھے لگے۔ ان سے اس نے دوستی کر لی۔ کتنے ماہ بھر سے شب و روز تھے وہ۔ کتنا اعتماد آگیا تھا اس میں۔ چھوٹی موٹی سی لڑکی اب یونیورسٹی کی جانی پہچانی پُر اعتماد اور پسندیدہ شخصیت تھی۔ اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ وہ بہت سے لوگوں کو بہت ہی پسند ہے ندیم عثمانی کے متعلق بھی وہ جانتی تھی۔ وہ جب بھی اس کی نگاہوں کی زد میں آتی۔ اس کے ہونٹوں پر نکھری نکھری مسکراہٹ آپوں آپ بکھر جاتی۔

ندیم عثمانی ایک بہت بڑے خاندان کا اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھا تعلیمی سلسلے میں کچھ عرصہ بیرونِ ملک گزار کر تھوڑا عرصہ ہی پہلے یہاں آیا تھا اس کے نظریات یہاں کے نوجوانوں سے کافی مختلف تھے۔ دولت کی اسے بالکل طمع نہ تھی۔ جہیز کی لعنت کے وہ بہت خلاف تھا۔ سلجھی ہوئی خوش شکل لڑکی کو رفیقِ حیات بنانا چاہتا تھا۔ جو خوبیاں وہ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بڑی حد تک اسے عرشہ میں نظر آتی تھیں اس لیے وہ عرشہ سے جو اس کی اسٹوڈنٹ تھی، دوستانہ خلوص سے پیش آتا تھا۔ باتوں باتوں میں کچھ کچھ بے تکلفی بھی برتنے لگا تھا۔ قربتوں کے لیے فاصلوں کو

سیٹنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

عرشہ خاصی ذہین لڑکی تھی۔ نظروں کے خاموش پیغام سمجھتی تھی۔ نوجوانی کا زمانہ ہی تو وہ دور ہوتا ہے جب اندر کی امنگیں، خواہشیں اور تقاضے مچلتے ہیں۔ اور باہر کی دلآویزیاں چپکے چپکے، اندر اترنے لگتی ہیں۔ اور جب اندر باہر کا میل ہوتا ہے۔ تو پسند کی چھاپ اپوں آپ لگ جاتی ہے۔ ندیم عثمانی بھی عرشہ کی شخصیت پر چھا گیا۔ دونوں میں اب صرف ہیلو اور یس سر والی بات نہ رہی تھی۔ جب بھی وقت اور موقع ملتا دونوں باتیں کرنے لگتے اور اکثر بھول جاتے کہ ان کے گردوپیش بھی اک دنیا ہے۔ گو باتیں عام سی ہوتیں لیکن انہماک کے بندھن بڑے مضبوط ہوتے۔

"عرشہ۔"

"جی۔"

"پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟"

"بس ٹھیک ٹھاک ہی ہے سر!"

"کوئی پرابلم تو نہیں؟"

"جب کوئی پرابلم ہوتی ہے تو آپ سے کہہ دیتی ہوں!"

"ہر پرابلم تو نہیں کہتیں!"

"اس وقت پڑھائی کی بات ہو رہی ہے سر!" وہ شوخی سے اٹھلا کر کہتی۔ تو ندیم مسکرا کر اسے گہری گہری پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگتا تھا۔

اس دن ندیم عثمانی اپنے کمرے سے باہر نکلے تو عرشہ برآمدے سے گزر رہی تھی۔ اس کی سہیلی عاصمہ اس کے پیچھے پیچھے تیز تیز قدم اٹھائے جا رہی تھی۔

"عرشہ ذرا ٹھہرو پلیز!" اس نے کہا تو عرشہ نے مڑ کر رک کر دیکھا۔ عاصمہ کے سنگ سنگ عثمانی بھی چلے آ رہے تھے۔

عاصمہ تو اپنی بات کہہ کر واپس مڑ گئی۔ ندیم عثمانی اور عرشہ وہیں رک گئے۔ جب کچھ بات کرنے

کا موڈ ہوتا تو قدموں کو زمین اپوں آپ ہی جکڑ لیا کرتی تھی

"کہاں بھاگی جا رہی تھیں؟"

"لائبریری میں سر!"

"کیوں؟"

"ایک کتاب سے کچھ نوٹس لینے تھے۔"

"عاصمہ تو تمہیں ایسے پکارتی چلی آ رہی تھی۔ جیسے تم ۔۔۔"

"وہ تو ایسے ہی ہے سر۔ چیخ چیخ کر آوازیں دینا اس کی ہوبی ہے شاید۔ عرشہ عرشہ کا شور مچا رکھا تھا۔"

"ویسے تمہارا نام۔"

"عام سا نہیں نا۔۔" وہ اس کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "اس لیے جب اس نام کی دہائی دی جائے تو عجیب لگتا ہے۔"

"شاید، ویسے تمہارا نام ہے منفرد سا۔ کس نے رکھا تھا یہ نام؟"

"میرے ابو نے۔"

"اچھا۔"

"سر، میری بہن کا نام جانتے ہیں کیا ہے۔"

"کیا ہے؟"

"برشہ۔"

"خوب! اس سے چھوٹی کا نام فرشہ ہوگا اور اس سے چھوٹی کا قرشہ۔"

وہ ندیم کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہنستے ہوئے سر نفی میں ہلاتی گئی اور بولی "نہیں سر، ہم صرف دو ہی بہنیں ہیں۔ تیسری اور چوتھی ہوتی تو شاید یہی نام ہوتے ان کے۔"

"آپ کے ابو سے ملنے کا کبھی اتفاق ہوا تو میں ان ناموں کی وجہ تسمیہ ضرور پوچھوں گا۔ اب تک

میرے سننے میں یہ نام نہیں آئے۔ ہو سکتا ہے کسی اور ملک اور زبان کے ہوں۔"

"اوہ سر..." وہ پھول کی طرح کھلتے ہوئے بولی۔" پوچھنے کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ ویسے ابّو نوکری کے سلسلے میں کئی ممالک میں گئے ہیں۔ لیکن یہ نام۔ میرا تو خیال ہے، ان کا تعلق کسی ملک اور زبان سے نہیں۔"

"تو اور کس سے ہے؟"

"اس سے کہ ہو سکتا ہے جب میں پیدا ہوئی ہوں تو ابو کسی بحری جہاز کے عرشے پر ہوں۔ اسی مناسبت سے نام عرشہ رکھ دیا ہو۔"

ندیم عثمانی ہنس دیے۔

"اور برشہ" انہوں نے چند لمحوں بعد پوچھا۔

"برشہ پیدا ہوئی ہو تو شاید وہ کسی ایسے خطے میں ہوں جہاں بارشیں رکنے کا نام نہ لیتی ہوں۔ اس لیے ذہن میں برشہ کا لفظ آگیا ہو۔ جو انہیں خوب صورت لگا ہو۔"

"ندیم عثمانی ہنستے ہوئے بولے" آپ کے ابو کے خوبصورت ذہن کی داد دینا پڑے گی۔"

"بالکل بالکل۔ بہت ہی اچھے اور بہت ہی خوب صورت سوچوں کے مالک ہیں میرے ابو۔"

"واقعی!"

"سچی سر۔"

"مانتا ہوں سچی۔ ان کی ایک خوب صورت سوچ تو تم ہی ہو۔"

"ہائے ہئے۔" وہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہوگئی۔ ندیم تیزی سے قدم بڑھاتے آگے چلے گئے۔

پیار کی نرم نرم پھوار دونوں کے من بھگوتے چلی جا رہی تھی۔ عرشہ کچھ بے پروا قسم کی لڑکی تھی۔ سنجیدگی سے سوچنے کی عادی نہ تھی۔ لیکن اب۔ وہ بھی ندیم عثمانی کے متعلق سوچنے لگی تھی۔ رات کو جب بستر پر لیٹتی آنکھیں سونے کے لیے بند کرتی۔ تو ان بند آنکھوں میں ندیم عثمانی

بڑی بے تکلفی سے اتر آتے۔ عرشہ ان کی شبیہ آنکھوں میں قید کر لیتی۔ انہیں اچھی طرح دیکھتی، انہیں محسوس کرتی، ان سے باتیں کرتی۔ شوخیاں ہوتیں۔ چھیڑ چھاڑ ہوتی، ہنسی مذاق ہوتا۔ سنجیدہ باتیں ہوتیں اور یہ سب کچھ کرتے کرتے نیند اس پہ غلبہ پا لیتی۔ ان دنوں اس کے خواب بھی بڑے خوب صورت ہو گئے تھے۔

یہ سلسلہ کچھ عرصہ چلا۔

دونوں نے خاموش چاہتوں کو خاموشی ہی سے قبول کر لیا تھا۔

ندیم عثمانی ان خاموش چاہتوں کو اب عنوان دینا چاہتے تھے۔ اپنی ماں اور بہنوں سے وہ اس سلسلے میں بات کرنے سے پہلے عرشہ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ اس دن وہ پکا ارادہ کر کے آئے لیکن عرشہ اس دن نہ ملی۔ شاید جلدی گھر چلی گئی تھی۔ دوسرے دن بھی وہ نہیں ملی۔ پتا چلا کہ اس کی امی بیمار ہیں اور اس نے چھٹی لے رکھی ہے۔ وہ پریشان ہوئے۔ لیکن اس کے گھر جانے کا سوچ کر بھی نہ جا سکے۔ یوں چلے جانا کچھ مناسب نہیں لگا۔ وہ عرشہ کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔

ایک ہفتے کے بعد وہ انہیں یونیورسٹی میں نظر آئی۔

"کیا بات ہے عرشہ؟ اتنے دن کہاں رہیں۔ سنا ہے تمہاری امی بیمار تھیں؟" انہوں نے اس سے ملتے ہی کہا۔

"ہاں سر، امی بیمار پڑ گئی تھیں۔ بہت سے روگ پال رکھے ہیں امی نے۔ کبھی کبھی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہیں۔ ورنہ عام طور پر تو وہ اپنی بیماریوں سے بڑی ہمت سے مقابلہ کرنے والی عورت ہیں" عرشہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب تو ٹھیک ہیں نا؟"

"ٹھیک نہ ہوتیں تو میں آتی کیسے؟"

"خدا انہیں ہمیشہ ٹھیک ہی رکھے"

"اوں ہوں۔"

"کیوں ؟"

"سر ہماری امّی جو ہیں نا ۔ چار چھ مہینے بعد ضرور بیماری کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہیں"

"کوئی جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا ۔"

"ہماری امّی کرتی ہیں سر ۔ شاید وہ ہماری محبتوں کو آزماتی ہیں ۔ بہت اذیت ہوتی ہے ہمیں ان کے بستر پر پڑنے سے ۔۔ میری اور ابّو کی جان ہی ہوا ہو جاتی ہے"

"تمہاری اور ابّو ہی کی کیوں دوسرے بہن بھائیوں ۔"

"سر حسنات اور برشہ بہت چھوٹے ہیں ۔ انھیں دکھ تکلیف کا ابھی پوری طرح سے احساس نہیں نا ۔ نہ ہی ماں کے ہونے کی اہمیت اور نہ ہی ہونے کی اذیت سے پوری طرح واقف ہیں ۔ میں اور ابّو تو ۔"

"بہت پیار ہے تم دونوں کو ان سے"

"بالکل حقیقت کو تسلیم کرنے کی ضرورت تو نہیں ہوتی ۔ ماں کتنی اہم ہستی ہے ۔ کون نہیں جانتا؟"

دونوں تھوڑی دیر یہی باتیں کرتے رہے ۔

عرشہ اپنی امّی کی ذہنی اور جسمانی بیماریوں کا ذکر کرتے ہوئے بولی : "امّی بہت حساس ہیں ۔ فوراً ہی پریشان ہو جاتی ہیں ۔ زندگی پر بھروسا نہیں کرتی ۔ وہم سا ہو گیا ہے انھیں ۔ کہ ۔"

"کہ ؟"

"کہ میرے ہاتھ پیلے کرنے کی خواہش دل ہی میں لے جائیں گی" ۔ عرشہ سنجیدگی سے کہہ گئی ۔

ندیم کا جی چاہا ۔ جھٹ سے کہہ دیں "ایسی بات نہ کہو ۔ میں بہت جلد اس سلسلے میں قدم اٹھانے والا ہوں ۔ ان کی یہ آرزو جلد ہی پوری ہو جائے گی"

"وہ تو یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ میں ایم ۔ اے میں داخلہ لوں ۔ بی ۔ اے کے بعد ہی ۔ ۔ ۔"

"تم سے گلو خلاصی چاہتی تھیں" ۔ عرشہ کی سنجیدگی کو کم کرنے کے لیے ندیم مسکرا کر بولے ۔

عرشہ نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا : "وہ تو ابّو رضامند نہیں ہوتے ۔ مجھے امّی کی مرضی

کے خلاف داخلہ دلا دیا ۔"

"بہت احسان کیا انھوں نے مجھ پر" وہ ہنس کر بولے ۔

عرشہ نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا اور بولی : "آپ پر ۔ ۔ ؟"

"اور نہیں تو کیا ۔ تم داخلہ نہ لیتیں ۔ تو مجھے کیسے ملتیں ۔"

وہ ہولے سے بولے ۔

عرشہ نے سر جھکا لیا ۔ اس کے اندر غبارے کی طرح خوشیوں کی ہوا بھر رہی تھی ۔

چند دن اور گزر گئے ۔ ندیم عثمانی کو عرشہ سے براہ راست رشتے کی بات کرنے کا موقع نہ ملا ۔ لیکن اس روز جب عرشہ گیٹ سے باہر نکل کر سڑک پر آ رہی تھی ۔ عثمانی کی گاڑی بھی دوسرے گیٹ سے نکلی ۔ انھوں نے عرشہ کو دیکھا اور ادھر ہی آ گئے ۔

"رکشے کے انتظار میں کھڑی ہو ۔ ۔ ۔ انھوں نے اس کے قریب گاڑی روک لی ۔"

"جی سر ۔"

"آؤ میرے ساتھ"

"کہاں ؟"

"ڈراپ کر دوں گا تمھیں"

"نہیں سر ، رکشا آنے والا ہی ہے"

"رکشے پر اکیلی جاتی ہو ؟"

"نہیں شمسہ عذرا اور میں"

"شمسہ عذرا سے کہہ دو کہ تم آج میرے ساتھ جا رہی ہو"

اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں سر ! آپ جائیں ، میں رکشے پر ہی جاؤں گی"

پھر وہ آہستگی سے بولی "پہلے ہی بہت باتیں بن رہی ہیں سر ۔ ساری یونیورسٹی میں بات پھیل گئی ہے ۔ کہ آپ ۔ ۔ ۔ "

ندیم پورے خلوص اور اعتماد سے مسکراتے ہوئے بولے "باتوں کی پرواہ کرنے لگی ہو؟"

"کرنا ہی چاہیئے"

"باتیں بڑھ بھی سکتی ہیں"

وہ گھبرا کر انہیں دیکھنے لگی۔ وہ جلدی سے بولے "اسی لیے سوچ رہا ہوں۔ لوگوں کے منہ بند کرنا ہی چاہئیں"

"جی؟... سر؟... اس نے فرطِ حیرت سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں "آؤ میرے ساتھ، میں ڈراپ کروں گا تمہیں۔ راستے میں کچھ باتیں، کچھ فیصلے بھی ہو جائیں گے"

عرشہ تذبذب میں پڑ گئی۔ لڑکیاں لڑکے گیٹ سے نکل نکل کر سڑک پر پھیل رہے تھے۔ کچھ گاڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے، کچھ اسکوٹروں، سائیکلوں کی طرف۔ اچھی خاصی تعداد پیدل جا رہی تھی۔ کچھ دور ہی بس اسٹاپ تھا۔ زیادہ تر کا رُخ ادھر ہی تھا۔ عرشہ کو ندیم عثمانی کی گاڑی کے قریب کھڑے دیکھ کر کئی نگاہیں معنی خیز سے اشارے کر رہی تھیں۔ دو چار دھیمی آوازوں میں آوازے بھی کسے گئے تھے۔

"عرشہ آؤ..." ندیم نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ اور اتنے اعتماد سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا کہ انکار کی گنجائش ہی نہ رہی۔ بعض اوقات جذبے سوچ کے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں، طوفانی پہاڑی پہاڑی ندی کی طرح اپنا رُخ آپ متعین کر لیتے ہیں۔ بنے بنائے راستوں پر بہنا ضروری نہیں سمجھتے۔

ندیم اسے ساتھ لے گئے۔ سیدھے گھر جانے کے بجائے ایک ریسٹورنٹ میں چائے کیلئے رُکے عرشہ نے انکار بھی کیا۔ لیکن اصرار کی بھی تو کوئی قوت تھی۔

میز کے کنارے پر عرشہ نے اپنی فائل اور کتابیں رکھ دیں۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ویٹر کو عثمانی نے چائے اور چند لوازمات کا آرڈر دے دیا تھا۔ عرشہ کچھ خوف زدہ سی بھی تھی۔ ایک نوجوان کے ساتھ اکیلے آنے کا پہلا اتفاق تھا۔ اس کا تعلق بھی متوسط طبقے کے ایسے گھرانے سے تھا، جس میں

لڑکیوں کی یہ جسارت برداشت نہیں کی جاتی تھی۔ اسے اپنے ابو کا بھی خیال آ رہا تھا، جنھیں اس پر بے حد اعتماد اور بھروسا تھا۔

"سر" اس نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"ہوں"

"آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟"

"چائے کے لیے"

"چائے ضروری تو نہیں تھی"

"ہاں، ضروری تو نہیں تھی لیکن تقریب بہرِ ملاقات والی بات ہے"

"سر... میرے گھر والے"

"عرشہ۔ ان گھر والوں ہی کی وجہ سے تو تمہیں یہاں لایا ہوں"

"جی...."

چند لمحے دونوں چپ رہے۔ پھر عثمانی پُرسکون لہجے میں بولے "عرشہ میں نے اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر لیا ہے، اس سلسلے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

عرشہ نے ایک بار نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ پھر نگاہیں جھک گئیں۔ حیا کا بار اتنا تھا کہ وہ پھر ان سے نظریں نہ ملا سکی۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔

عثمانی نے تھوڑی تمہید باندھی۔ اپنے اور اپنے خاندان کے متعلق اسے بتایا۔ اپنی دونوں بہنوں کا ذکر کیا۔ ماں کی باتیں کیں۔ پھر بولے "تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں اپنی بہنوں اور امی کو تمہارے ہاں بھیجوں"

عرشہ کچھ کہہ نہ سکی۔ دل تو اتنی زور سے دھڑک رہا تھا۔ گویا پھڑپھڑانے کا گمان ہو رہا تھا۔

"بولو نا؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔ سر جھکائے سامنے رکھی چائے کی پیالی کو تکتی رہی۔

عثمانی نے پھر اصرار کیا۔" جواب دو نا عرشہ۔ تمہاری اس خاموشی سے کیا سمجھوں ؟"

کافی لمبی سی خاموشی کے بعد عرشہ نے سر اٹھایا اور ہمت کر کے بولی۔" سر۔ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں ؟"

" زندگی کا اتنا اہم فیصلہ سنجیدگی ہی سے کیا جاتا ہے عرشہ ؟"

" وہ چند لمحے چپ رہی۔ پھر بولی" سر آپ ایک اونچے خاندان کے فرد ہیں ۔"

" میں خاندانوں کی اونچائی نیچائی کا قائل نہیں ہوں۔ میرے ہاں ماپنے کے پیمانے مختلف ہیں۔ شرافت سے میں کسی خاندان کو اونچا نیچا گنتا ہوں اور تمہارے خاندان کی شرافت کا یقین مجھے بہت سے لوگوں نے دلایا ہے ۔"

عرشہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ہولے سے بولی" تو آپ چھان بین بھی کر چکے ہیں"

ندیم عثمانی بھی مسکرا دیے۔" چھان بین کا لفظ یہاں فٹ نہیں ہوتا۔ ویسے مجھے جس نے بتایا یہی بتایا کہ تمہارے خاندان کی شرافت مسلّم ہے اور بس یہی میرے ماپ کا پیمانہ ہے۔ اب کہو"

وہ چپ ہو گئی۔

" بولو نا، کیا جواب ہے تمہارا ۔؟"

" سر، شرافت اپنی جگہ ۔ لیکن ہم لوگ سفید پوشی کا بھرم بھی بمشکل رکھے ہوئے ہیں میرے ماں باپ کے پاس مجھے دینے کو تعلیم اور اچھی تربیت کے سوا شاید کچھ ؟"

" جانے دو عرشہ ۔ مجھے تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیئے ۔"

عرشہ نے بھرپور نگاہ اس پر ڈالی، پھر بولی" آپ بہت عظیم ہیں سر۔ لیکن ۔ میں ۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں ؟"

" ہاں کہہ سکتی ہو ۔ نا کہہ سکتی ہو ۔"

وہ بڑے خوب صورت انداز میں مسکرا دی۔

" تو اجازت ہے، بھیجوں اپنے گھر والوں کو تمہارے ہاں ؟"

عرشہ نے ہولے سے سر اثبات میں ہلا دیا ۔

" شکریہ عرشہ ؟" ندیم نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ عرشہ کو اس ہاتھ کی مضبوطی سے ندیم کے مضبوط اور غیر متزلزل ارادے سے آگاہی ہو گئی۔

ندیم نے عرشہ کو بازار کے سرے پر ڈراپ کیا۔ خدا حافظ کہنے سے پہلے انہوں نے عرشہ سے کہا۔" چند دنوں تک میں اپنے گھر والوں کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔ صرف رسم نبھانے کے لیے ورنہ معاملہ تو طے ہو ہی چکا ہے۔ اب اپنی ہاں کو نبھانا ہے تمہیں۔ سمجھیں ؟"

وہ سر اثباتی انداز میں ہلاتے ہوئے مسکرا دی۔

بازار سے گلی اور گلی سے گھر تک آتے آتے عرشہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے قدموں پر چل کر نہیں سبک سبک پروں سے پرواز کرتے پہنچی ہے۔ وہ کتنی خوش تھی شاید اندازہ کرنا مشکل تھا۔ آنکھوں میں قوسِ قزح کے رنگ گھل رہے تھے۔ من میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ رگوں میں کھنکتی چھنکتی خوشیاں بہہ رہی تھیں۔ انسان کے اندر خوشیوں اور غموں کو برداشت کرنے کا مادہ ہوتا ہے۔ لیکن جب خوشی یا غم حد سے بڑھ جائیں۔ تو برداشت بھی جواب دے جاتی ہے۔ عرشہ کی خوشیاں بھی اس وقت برداشت کی حدیں توڑ رہی تھیں۔ وہ بھاگ کر امی کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر۔ ان سے لپٹ کر۔ ان کو بازوؤں سے پکڑ کے چکر دے دے کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اتنی بڑی بات ان کے گوش گزار کر دینا چاہتی تھی۔ اکیلے تو اس سے یہ خوشیاں سنبھالے نہ سنبھل رہی تھیں۔ انہیں بانٹنا ضروری تھا۔ اور بانٹنے کے لیے ماں سے زیادہ قریب اور بے تکلف کون تھا۔"

وہ سریلے نغمے کی طرح گنگناتی لہراتی بیگ جھلاتی ڈیوڑھی سے صحن میں آئی۔

بیگ کونے والے تخت پر اچھالا ہی تھا۔ کہ امی گھبرائی گھبرائی باورچی خانے سے پانی کا گلاس لیے دوڑتی ہوئی ابو کے کمرے کی طرف گئیں۔ عرشہ کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ عرشہ کے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی کمرے

سے حسنات اور برشہ بھاگے آئے اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔

"باجی، ابّو کو پتا نہیں کیا ہوگیا ہے؟" گیارہ سالہ حسنات روہانسی آواز میں کہہ رہا تھا اور برشہ روئے جا رہی تھی۔

انھیں پرے دھکیلتے ہوئے عرشہ تیزی سے ابّو کے کمرے کی طرف بھاگی۔ ساری خوشیاں چھلاوے کی طرح غائب ہوگئی تھیں۔ تفکر اور پریشانی نے بدحواس سا کر دیا تھا۔ یہ سُکھ دُکھ بھی عجیب ہی شے ہیں۔ دھوپ چھاؤں کی طرح ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے رہتے ہیں۔ کبھی سنہری دھوپ نکل آتی ہے اور کبھی چھاؤں اسے نگل جاتی ہے۔

ٹھنڈی، برفیلی اور اندھی اندھیری چھاؤں نے ایکا ایکی عرشہ کے مَن میں چمکنے دمکنے والی سنہری پیلی اور جانفزا دھوپ کو ڈھانپ دیا تھا۔ سورج بغیر روشنی کے رہ گیا تھا۔

عرشہ بھاگ کر کمرے میں آئی۔

"کیا ہوا امّی؟" اس نے گھبرا کر پلنگ پہ بے حس پڑے ابّو کو دیکھتے ہوئے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے پانی ابّو کے ہونٹوں سے لگانے والی امّی سے پوچھا۔

امّی نے جواب دیا نہیں یا عرشہ نے سُنا نہیں، وہ ابّو پر جُھک گئی۔ اور ان کے کندھے جھنجوڑ ڈالے۔ ابّو پہ بے ہوشی طاری تھی۔ یہ بے ہوشی ہولے ہولے گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔

جانے کیسے عرشہ نے سعید چچا کو بلایا۔ رضوان، اصغر، حمید اور چھوٹے ماموں کو اکٹھا کیا۔ ڈاکٹر آیا اور ابّو کو فوری طور پر اسپتال منتقل کرنے کے لیے کہا۔

بھاگم بھاگ سب کچھ ہوا، ٹیکسی آئی۔ محلّے دار اکٹھے ہوگئے۔ رشتے دار دوڑے بھاگے اور عرشہ ابّو کو لے کر اسپتال پہنچ گئی۔ ڈاکٹر آگئے۔ کیس ان کے حوالے ہوگیا۔

برین ہیمرج ہوا تھا۔ حیرانی کی بات کہ ابّو کو کبھی ہائی بلڈ پریشر نہیں ہوا تھا۔ اس کی مریضہ تو امّی تھیں۔ سب کے ساتھ عرشہ بھی حیران و پریشان تھی۔ لیکن جب ڈاکٹروں کے استفسار پر سر کی چوٹ کا پوچھا گیا۔ تو امّی نے بتایا کہ وہ غسل خانے میں صبح پاؤں پھسلنے سے گر گئے تھے۔ سر پہ چوٹ کا سراغ لگا تھا۔

معمولی درد کی شکایت کی تھی۔ اور معمول کی طرح تیار ہو کر دفتر چلے گئے تھے۔ لیکن دفتر سے گھنٹہ بھر پہلے لوٹ آئے تھے کہ سر میں درد زیادہ تھا۔ اسپرو سے بھی آرام نہ آیا تھا اور کچھ کچھ غنودگی محسوس ہونے لگی تھی۔

گرنے سے چوٹ سر میں بظاہر معمولی آئی تھی لیکن اندر ہیمرج ہوگیا تھا۔ اور پھٹی ہوئی باریک نسوں سے خون رِس رِس کر دماغ کے جس حصّے میں جمع ہونے لگا تھا۔ اس سے بے ہوشی طاری ہوگئی تھی آپریشن کر کے جمع ہوا خون نکالنا ضروری تھا۔

آپریشن ہوا، چند ساعت کے لیے ابّو ہوش میں آئے پھر وہی غنودگی۔

یہ سلسلہ تین چار روز چلتا رہا عرشہ اور امّی کی پریشانی دیدنی تھی۔ اس وقت تو انھیں صرف ابّو کی جان کی فکر تھی۔ دوائیوں، فیسوں ٹیسٹوں پر جو پیسے خرچ ہو رہے تھے۔ ان سے نہیں مانگے جا رہے تھے۔ ماموں، چچا، خالو سبھی موجود تھے۔ اپنی جیب سے خرچ کر رہے تھے۔ ناگہانی آفت آن پڑی تھی۔ ہاتھ بٹانا ضروری تھا۔

ابّو کا آپریشن تیسری بار ہوا۔ اور یہ آخری ثابت ہوا۔ ابّو ڈاکٹروں کی پوری پوری کوششوں کے باوجود بچ نہ سکے۔ ساری باتیں ڈاکٹروں کے ہاتھ ہی میں ہوتیں تو زندگی موت کا نام مٹا چکی ہوتی۔ ابّو مر گئے۔ جی مر تو وہ کئی دنوں سے رہے تھے۔ جب لمحوں کے لیے جی اٹھتے تو ذمّے داریوں کا بوجھ مار ڈالتا، کبھی عرشہ کو سینے سے لگا لیتے۔ کبھی اس کی امّی کا ہاتھ پکڑ آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتے، سر ادھر ادھر ہلاتے ہوتے مایوسی سے سر ہلاتے، کبھی ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں حسنات اور برشہ کے ہاتھ پکڑ کر عرشہ کے ہاتھوں میں دیتے۔ مرنے سے پہلے انھوں نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں عرشہ سے جیسے منت کی۔ اور ان بچوں کی ذمّے داری اس پر ڈالی جو ابھی کمسن تھے۔ وہ ان کے لیے کوئی اثاثہ بھی نہیں چھوڑ رہے تھے۔ التجائیں ہی تھیں۔ جو اُن کی بجھی آنکھوں میں جَل جَل اُٹھتی تھیں۔ عرشہ نے ابّو کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا کر روتے ہوئے کہا تھا۔ ابّو آپ کا سایہ ہمارے سروں پہ ہمیشہ رہے گا۔ ابّو۔ حسنات اور برشہ کی ذمّے داری میں اس سائے کی ٹھنڈک میں نبھاؤں گی۔ آپ زندہ رہیں

گے ابّو۔ آپ کو کچھ نہیں ہو سکتا۔

لیکن ابّو شاید عرشہ کی یقین دہانی ہی کے منتظر تھے۔ سکون سے آنکھیں موند لیں اور پھر — اگلے دن خاموشی ہی سے ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

اک قیامت ٹوٹ پڑی۔ حشر برپا ہو گیا۔ ماں پچھاڑیں کھا کھا کر گریں، عرشہ بے ہوش ہو گئی۔ حسنات اور بدرشہ سہم کر دھاڑیں مار مار کر رونے چچا کے ساتھ لپٹ گئے۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو نم نہ تھی۔ مرنے والے سے زیادہ اس کے پسماندگان کو دیکھ کر لوگ آنسو بہا رہے تھے۔ گھر کے سربراہ کی حیثیت مضبوط چھت کی سی ہوتی ہے۔ جس کے تلے تحفظ اور پناہ کا احساس ہوتا ہے۔ چھت گر پڑے تو دیواریں چاہے کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہوں۔ تحفظ نہیں رہتا۔ حالات کی کڑی دھوپ اور طوفان بے روک ٹوک در آتے ہیں۔ اور مکینوں پر کسی نہ کسی طور ضرور اثرانداز ہوتے ہیں۔ پھر جس گھر کی دیواریں ہی چھت کی پکڑ سے کھڑی ہوں۔ مضبوط ہوں نہ مستحکم۔ اس چھت کے گرنے سے تو سب کچھ ہی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ چھت گرتی ہے، تو دیواریں آپوں آپ لرز لرز کر ڈھیر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ انھیں پھر سے اٹھانا، بنانا آسان نہیں ہوتا۔ بڑی ہمت اور دل گردے کا کام ہوتا ہے۔

ابّو کی ساری ذمّے داریاں عرشہ کے کندھوں پر آن پڑیں۔ ابّو کی لاش اسپتال سے گھر آئی تو ایک بہت بڑا بل بھی عرشہ کے ہاتھوں میں تھما دیا گیا۔ چھوٹے موٹے خرچے تو ازراہِ ہمدردی عزیزوں نے کر دیے تھے۔ یہ بل تو اب انھوں ہی نے دینا تھا۔ ایک تو غم اور صدمے سے نڈھال اس پہ اتنی بڑی رقم کی ادائیگی۔ وقتی طور پہ تو یہ ذمّے داری امی نے بھائی کے سر پہ ڈالی۔ لیکن بعد میں جس طرح یہ رقم انھوں نے اکٹھی کر کے واپس کی، وہی جانتی تھیں۔

پتا نہیں، زندگی کی بہار و خزاں کا موسم وقت اصول اور قاعدے کا پابند کیوں نہیں ہوتا جب چاہے ہنستی مسکراتی بہار نازل ہو جاتی ہے۔ زندگی خوشبو بن جاتی ہے۔ مہک چار سو پھیل جاتی ہے۔ ہر طرف دل لبھانے والی ہریالی اور رنگا رنگ چمکتے پھول اُگ آتے ہیں۔ ہنسی کی پھوار بدن بھگوئے رکھتی ہے۔ ایسی بھی بہار وارد ہوتی ہے کہ پھولوں کے ساتھ کانٹے نہیں ہوتے۔ کوئی چبھن

نہیں ہوتی۔ کوئی کانٹا نہیں الجھتا، کوئی پھانس نہیں اٹکتی۔ اس بہار کا کوئی وقت متعین نہیں ہوتا کوئی عمر مقرّر نہیں ہوتی۔ چاہے تو برسوں پر محیط رہے، محیط رہے پھیلی رہے۔ اور خزاں کی آنکھوں میں دھول جھونکتی چلی جائے۔ لیکن خزاں بھی برابر تعاقب میں لگی رہتی ہے۔ کبھی آناً فاناً کبھی رفتہ رفتہ اور کبھی خاصے عرصے کے بعد مڈبھیڑ ہو ہی جاتی ہے بہار سے۔ اجاڑ ڈالتی ہے۔ ہنستی مسکراتی پھولوں کی تازگی خوشبو اور چار سو پھیلی مہک کو۔ ویران کر ڈالتی ہے زندگی کی آنکھیں۔ دھول اڑاتی ہے۔ سائیں سائیں کرتی خونخوار ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ ہنسی کی پھوار سے بھیگے بدن سوکھ کر بھربھری مٹی کے ڈھیر بن جاتے ہیں۔ جنھیں آسودگی رگیدتی رہتی ہے۔ بہار کی طرح خزاں کی بھی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ کوئی وقت متعین نہیں ہوتا آنے کا۔ نہ ہی جانے کا دونوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ زندگی بہاروں میں جھومتی، اٹھلاتی سبک خرامی سے گزرتی چلی جاتی ہے۔ گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ کہ من مطمئن اور شاداں ہوتا ہے۔ لیکن خزاں جب زندگی کو روندتی ہے۔ تو اس کے بال و پر نوچ ڈالتی ہے۔ بازو توڑ ڈالتی ہے۔ آنکھوں سے روشنی چھین لیتی ہے۔ حوصلے پست کر دیتی ہے اور ہمتوں کے گلے گھونٹ دیتی ہے۔ مایوسی چار سو پھیل جاتی ہے۔ زیست اپنے آپ سے بیزار ہو جاتی ہے۔ کرب زدہ لمحے گزارنا مشکل ترین کام ہے۔ کٹھن اور بوجھل گھڑیوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر حال سے مستقبل میں دھکیلنا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔

عرشہ اور اس کے گھر والوں پر بھی خزاں ایکا ایکی ٹوٹ پڑی تھی۔ ابّو کے بچھڑنے کا غم اپنی جگہ لیکن ان کی ذمّے داریوں کا بوجھ اتنا تھا کہ عرشہ بوکھلا گئی۔ یونیورسٹی جانا تو خیر چھوٹ ہی گیا۔ اس سے متعلقہ یادیں اور جیتی جاگتی کہانیاں بھی اجڑ گئیں۔

گو ندیم عثمانی چند دوسرے لیکچررز اور اسٹوڈینٹس کے ساتھ تعزیت کے لیے عرشہ کے ہاں آئے تھے۔ اور جاتے جاتے عرشہ سے یہ بھی کہا تھا۔

"عرشہ گھبرانا نہیں۔ اپنے آپ کو تنہا بھی نہیں سمجھنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

عرشہ نے احسان مندی سے سر جھکا لیا تھا۔ کوئی جواب دینے کے بجائے اس کی آنکھوں سے چند قطرے اُبل پڑے تھے ندیم عثمانی کا خلوص اپنی جگہ۔ لیکن اس خلوص کو کہاں کہاں اور کیسے کیسے برتا جا

سکتا تھا، شاید وہ جانتی تھی۔

رونے دھونے کے لیے تو وقت اور جگہ کی کوئی قید نہ تھی۔ ہاں فکرِ روزگار کا مسئلہ ایسا تھا جسے حل کرنا تھا۔ یہ مسئلہ ایسا تھا جسے التوا میں ڈالا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ جمع پونجی اور ابّو کے ادھورے فنڈ بیماری، موت اور اس کے بعد کے چھ سات ماہ... دھکیلنے کی نذر ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ چھوٹا موٹا زیور جو امّی نے عرشہ کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ خزاں کی دستبرد سے بچ نہ سکا۔ جب یہ اثاثہ بھی ختم ہوا تو اماں بہت روئیں۔ عرشہ نے حالات سے سمجھوتہ کرنے کے لیے اب اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا۔ اماں کو رونے سے تو نہ روک سکتی تھی۔ ہاں تسلی دلاسے ضرور دیتی تھی۔

"امّی، خدا کی مرضی یہی تھی۔ وہی اب بہتری کی صورت نکالے گا۔ چچا سعید میرے لیے نوکری کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ بینک کے اتنے بڑے آفیسر ہیں۔ ضرور نوکری دلا دیں گے۔"

عرشہ نوکری کا نام لیتی تو اماں کے کلیجے میں تیر اتر جاتا۔ کیسی افتاد آن پڑی تھی۔ یہی تو اس کے ہاتھ پیلے کرنے کے دن تھے۔ اور گھر بسا کر خوشیاں لوٹنے کا وقت تھا۔ وہ نوکری کی فکر میں گھلی جا رہی تھی۔ نوکری کر کے اس نے ماں اور بہن بھائی کو پالنا تھا، پڑھانا تھا، بڑا کرنا تھا۔

"کاش تیرے ابّو کی جگہ مجھے موت آ جاتی۔" وہ دکھیاری جلے دل سے یہی کہتیں۔

"امّی، پھر کیا ہوتا۔ مصیبت تو پڑنا ہی تھی۔"

"کمائی کرنے والا تو زندہ رہتا۔ تجھے نوکری تو نہ کرنی پڑتی۔"

"چھوڑ دیں اماں۔ نوکری کرنا کوئی بُری بات نہیں۔ اب ابّو کی جگہ میں نوکری کروں گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کب تک چلے گا اس طرح؟"

"جب تک حسنات اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو جاتا اور برشہ جوان ہو کر ڈولی میں بیٹھ کر سسرال نہیں چلی جاتی۔"

"میری بچی۔" اماں کی آنکھوں سے برسات کی جھڑی لگ جاتی۔

عرشہ دل کڑا کر کے کہتی "اماں، بس اب انہی خطوط پر سوچنا ہے مجھے۔ میں حسنات اور برشہ کو کسی کمی کا احساس نہ ہونے دوں گی۔ ابّو کی روح کو صرف اسی طرح تسکین ملے گی امّی مجھے ان کی بجھتی آنکھوں کا کرب کبھی نہیں بھولے گا۔ یہ کرب حسنات اور برشہ ہی کی ذمے داری تھا امّی۔

عرشہ نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اپنے جوان دل پہ جبر کی سِل رکھ لی تھی۔ اسے تو لگ رہا تھا جیسے وہ اسی عمر میں ابّو جتنی ہو گئی ہے۔ ماہ و سال پھلانگ کر سنجیدگی کے خول میں داخل ہو گئی ہے۔

ندیم عثمانی اس سارے عرصے میں اسے صرف ایک بار مل سکے۔ عرشہ کی ہمت بندھائی اور اپنی پیش کش کا بھی دبے لفظوں میں ذکر کیا۔ ابّو کی موت عرشہ کی زندگی کی خوشیوں کی شکست نہیں بننا چاہیے تھی۔ لیکن۔

عرشہ اب اپنے حالات سے پُراعتماد سمجھوتہ کر چکی تھی۔ ندیم عثمانی سے اس دن اپنی چاہتوں کا اقرار کر کے گھر آئی تھی۔ تو پھولوں بھری ٹہنی کی طرح تھی۔ یہ ٹہنی ابا کو بستر پہ بے حس و حرکت پڑے دیکھ کر آپوں آپ پھولوں سے خالی ہو گئی تھی۔ اور اب تو۔ اب تو عرشہ کا من اس عورت کی طرح خالی اور دکھی ہو گیا تھا۔ جس نے مردہ بچے کو جنم دیا ہو۔

اس نے ندیم سے کہا "سر۔ قدرت کو منظور نہ تھا وہ ہو گیا۔"

"موت زندگی ساتھ ساتھ چلتے ہیں عرشہ۔ ابھی تمہارے ذہن پر ابّو کے بچھڑنے کا دکھ حاوی ہے۔ میں انتظار کر سکتا ہوں۔ جب تم نارمل ہو جاؤ۔ تو۔"

وہ تلخ سی مسکراہٹ لیے بولی "سر، میرے گھر کے حالات سے آپ بے خبر ہیں۔ میرے بہن بھائی ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ میری ماں زیادہ پڑھی لکھی نہیں، کہ کہیں نوکری کر سکے۔ ہمارے پاس کوئی اثاثہ نہیں ہے۔ یہ جو میرا گھر آپ نے دیکھا تھا۔ وہ بھی میرے دادا کا ہے۔ جس میں دو چچا اور تین پھوپھیاں حصے دار ہیں۔ یہ تقسیم ہو جائے تو شاید دو کمرے بھی ہمارے حصے میں نہیں آئیں۔"

"دو کمرے ہوں یا دو کوٹھیاں۔ مجھے تم۔"

"سر۔ آپ اپنی خواہش کا بار بار ذکر نہ کریں۔ میں متزلزل ہو گئی۔ تو میری ماں کو شاید بڑے

گھروں میں برتن مانجھنے کی نوکری اور میرے بھائی بہن کو لوگوں کے سودے سلف ڈھونڈنے کا کام کرنا پڑے۔"

"عرشہ تمہاری سوچ نے مجھے دُکھی کیا ہے۔"

"کیوں سر۔ یہ حقیقت ہے۔"

"عرشہ میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اپنے کو تنہا نہ سمجھو میں تمہارے ساتھ ہوں، ساتھ دوں گا تمہارا۔ تمہاری ذمّے داریوں کو اپنی ذمّے داریاں سمجھوں گا۔"

"سر۔" وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے صرف اسے تکتی رہ گئی۔

"مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو عرشہ۔"

وہ چپ رہی۔

ندیم بولا۔ "سوچ لو، چند دن بعد جواب دے دینا۔ میں تمہارا ہاتھ تھامنے کے لیے بے قرار ہوں۔"

عرشہ کئی دن سوچتی رہی۔

راتوں کی نیند اڑ گئی۔

دن کا چین اس کی نذر ہو گیا۔

جوان امنگوں من کی ضرورتوں اور عمر کے تقاضوں نے بڑا بہلایا پھسلایا۔ ندیم عثمانی کی ذات پر بھروسا اور اعتماد بھی مستحکم تھا۔ یہ شادی یقیناً اُس کے مسائل حل کر سکتی تھی۔

لیکن

"کیا یہ مناسب بھی تھا؟"

کیا امی داماد کے ٹکڑوں پر پلنے اور اپنے دونوں بچوں کا بوجھ ڈالنے پر رضامند ہو جائیں گی۔

زمانہ انہیں بخشے گا؟

ندیم عثمانی ایک اونچے خاندان کے فرد تھے۔ کیا ان کے خاندان کی اونچائی تک ایک بے نام خاندان کی رسائی ہو سکے گی؟

جہیز کے بجائے ماں اور بہن بھائی کا بوجھ لے کر وہ اس گھر میں جائے گی۔ جسے سُسرال

کہا جاتا ہے۔ تو کیا وہ لوگ اتنے وسیع القلب ہوں گے کہ اس بار کے ساتھ اس کو قبول کر لیں؟

ندیم عثمانی کا بڑا بھائی ایک بہت بڑے خاندان میں بیاہا ہوا تھا۔ اس کی بیوی لمبے چوڑے جہیز اور اک مشہور جانے پہچانے خاندان کے نام کا لیبل لے کر اس گھر میں آ چکی تھی۔ اس کے سامنے عرشہ اپنے آپ کو کھڑا کرنے کے لیے کون سا سہارا لے گی؟

ہر بات کا جواب نفی میں تھا۔

اور

اس نفی کا اظہار اس نے ندیم عثمانی سے بڑے پختہ استحکام سے کرتے ہوئے کہا۔ "سر مجھے نوکری مل گئی ہے بینک میں۔ یہ میرے کنبے کی کفالت کے لیے کافی نہ سہی ناکافی بھی نہیں۔ اب مجھے خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے سوچنا اور کام کرنا ہے۔ میری بدنصیبی ہے کہ میں آپ کے پروپوزل پر کوئی قدم نہیں اٹھا سکی۔ میری مجبوری، میری ذمّے داری مانع ہے سر۔"

"عرشہ۔"

اس نے گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "معاف کر دیجیے گا سر۔"

"معاف تو نہیں کروں گا۔" ندیم بڑے دکھ سے مسکرائے۔ "ہاں انتظار کر سکتا ہوں۔"

عرشہ نے بیچارگی سے انہیں دیکھا۔ لیکن پاؤں ذمّے داری کی زنجیروں میں اسی مضبوطی سے جکڑے رہے۔ وہ بڑبڑائی .... "انتظار؟"

"ہاں۔" لہجہ بے حد مضبوط تھا۔

عرشہ نے سر اٹھایا اور ندیم پر اک بھرپور نگاہ ڈالی۔ پھر بولی۔ "سر، میرا بھائی ابھی صرف گیارہ سال کا ہے۔ برشہ نو سال کی ہے۔ میری منزل اتنی قریب نہیں کہ وعدے کا چکمہ دے دوں۔ بارہ تیرہ سال کافی طویل عرصہ ہوتا ہے۔ میری ذمّے داریاں کم از کم بارہ تیرہ برس کے طویل عرصے پر پھیلی ہیں سر۔"

"میں تمہاری ذمّے داریاں بانٹنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن میں نہیں چاہتی ۔ ایسا ہونا ممکن نہیں سر ۔ بات وہی اچھی لگتی ہے ، جو ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے ۔ میں نہیں چاہتی کہ اپنے بوجھ تلے آپ کو دبا دوں ۔ پھر اپنے آپ کو ختم کر دوں میرے دل میں آپ کے لیے جو جذبات ہیں ۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ کسی طور پہ مجروح ہوں یا گزند پائیں ۔"

عثمانی چند لمحے چپ رہے ۔ عرشہ نے اتنے دلائل دیے کہ انہیں چپ ہونا پڑا ۔

عرشہ انہیں اداس اور دھندلائی آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ کر جانے لگی تو ندیم عثمانی مسکرائے : " تو بارہ تیرہ سال کا بن باس کاٹنا پڑے گا ؟"

" نہیں سر ۔ یہ تو میرے بن باس کا عرصہ ہے ۔ آپ اس زمرے میں نہیں آتے ۔ خدا کرے آپ کو اچھا جیون ساتھی مل جائے ۔"

جانے کس دل سے عرشہ نے یہ کہا اور عثمانی کا کوئی جواب سننے سے پہلے آنکھیں پونچھتی چکنا چور دل کو سمیٹتی تیز قدموں سے وہاں سے چلی گئی ۔

جو اپنے لیے جیتے ہیں وہ مر جاتے ہیں ۔ جو دوسروں کے لیے مرتے ہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں ۔"

آج عرشہ کے اندر کی جوان لڑکی بھی مر گئی ۔ عرشہ کو دوسرے لوگوں کو زندہ رکھنے کے لیے مر جانا پڑا ۔

زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور اہم ترین ضرورت کے کھونے کا دکھ سمیٹ کر عرشہ اپنی راہ پر گامزن ہو گئی ۔ وہ پھر ندیم سے کبھی نہیں ملی ۔ ہاں اسے پتہ چلا کہ وہ نوکری چھوڑ گئے ہیں ۔ شاید وہ پھر باہر چلے گئے تھے ۔

وقت گزرتا گیا ۔ عرشہ بینک کی ملازمت کرتی رہی ۔ ترقی بھی ہوئی وقت بھی گزرا ۔ اماں راستے ہی میں ساتھ چھوڑ گئیں ۔ ابّو کے پورے پانچ سال بعد وہ بھی ان سے جا ملیں ۔ اب عرشہ پہ حسنات اور برشہ کی ساری ذمّے داریاں تھیں ۔ وہ اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے ان ذمّے داریوں کو نباہے چلی گئی ۔

اور یوں پورے بارہ برس بیت گئے ۔

اس کی ہمتوں اور حوصلوں نے حسنات کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا ۔ وہ سی ایس ایس کر چکا تھا ۔ برشہ نے بھی بی ۔ اے کر لیا تھا ۔ اپنی ناکامی کی بنیاد پر اس نے دونوں کی کامیابی کی بنیادیں اٹھائی تھیں ۔ اپنے آپ کو روند ڈالا تھا ۔ بارہ برسوں کا بار اٹھائے اس کا اپنا آپ مسخ ہو چکا تھا وہ چنچل شوخ ، الہڑ اور بے پروا اسمارٹ سی لڑکی اب روکھی سوکھی ویران سی کھیتی کی طرح تھی ۔

ہنگامہ ہائے حیات سے اکیلے نپٹنا آسان بھی تو نہیں تھا ۔ خصوصاً اس حالت میں کہ ذات کے دکھ اور تقاضے بھی وہ پیچھا نہ چھوڑیں ۔ اس کے دماغ نے جو فیصلہ کیا تھا ، انہی خطوط پر اس نے بارہ سال بتا دیے تھے ۔ لیکن اس کے دل نے اسے معاف نہیں کیا تھا ۔ دل ندیم عثمانی کو کھونے کی خطا پر اسے معاف نہیں کرتا تھا ۔

حسنات کو ملازمت مل گئی ۔ سیکشن آفیسر بن گیا ۔ عرشہ نے جو قربانیاں بہن بھائی کے لیے دی تھیں ، جو مصائب جھیلے تھے ۔ جن مرحلوں سے گزری تھی ، اس کا برشہ اور خاص کر حسنات کو پورا پورا احساس تھا ۔ اسے پہلی تنخواہ ملی تو وہ اس نے عرشہ کی جھولی میں ڈال دی ۔

"یہ کیا ہے ؟" عرشہ نے لفافہ ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنے سعادت مند اور خوبرو بھائی کو دیکھا ۔

"میری پہلی تنخواہ ۔" وہ دو زانو ہو کر اس کا گھٹنا پکڑ کر بیٹھتے ہوئے بولا ۔

عرشہ نے لفافہ چوم کر حسنات کی پیشانی پر بھی بوسہ دیا ۔ " مبارک ہو ۔"

" آپ کو مبارک ہو عرشہ باجی ۔" حسنات نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا ۔ "یہ سب آپ کی قربانی اور محنت کا نتیجہ ہے ۔"

" قربانی کیسی ۔ پگلے ، یہ تو میرا فرض تھا ۔ خدا کا شکر ہے کہ میں کامیاب رہی ۔"

"آپ نے اپنا آپ قربان کر کے ہماری زندگی کامیاب بنائی ہے عرشہ باجی ۔ آپ کی اس طرح گزری زندگی کا لمحہ لمحہ مجھ پر بار ہے ۔"

"اچھا ۔" عرشہ نے اس کی سنجیدگی پہ ہنس کر کہا ۔ "اتنے بڑے ہو گئے ہو ایسی باتیں سوچنے کے لیے ۔"

"بڑا تو میں تب ہی ہو گیا تھا باجی ۔ جب آپ نے ہماری خاطر تعلیم ادھوری چھوڑ کر نوکری کی تھی ۔ اور اپنا گھر بسانے کے بجائے ہمارے مستقبل سنوارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

"بڑے ہوشیار ہو ۔ اتنی باتیں جان گئے تھے۔"

"ہاں ۔ باجی ۔ میں اب وہ لمحے لوٹا تو نہیں سکتا ۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اب میں نوکر ہو گیا ہوں ۔ اب اپنی ذمے داریاں میرے کندھوں پر ڈال دیں ۔"

عرشہ نے مسکراتے ہوئے اس کے گال کو تھپتھپایا۔

"باجی ۔"

"ہوں ۔"

"اب آپ نوکری چھوڑ دیں ۔"

"کیا !"

"ہاں باجی ۔ اب میں جو ملازم ہو گیا ہوں ۔ میری تنخواہ سے گھر کے خرچے پورے ہو جائیں گے ۔"

"حسنات ، ابھی بڑی ذمے داریاں ہیں ۔"

"کیا !"

"برشہ جوان ہو گئی ہے ۔ بی ۔ اے کر چکی ہے ۔ اس کی شادی کرنا ہے ۔ اس کی شادی کے بعد تمہارا گھر بسانا ہے ۔ اس لیے ابھی نوکری چھوڑنے کا خیال بھی نہیں کر سکتی ۔ ویسے بھی اب تو ریٹائر ہو کر ہی نوکری سے الگ ہوؤں گی ۔ پیسہ بھی ملتا ہے اور وقت بھی گزر رہا ہے ۔"

"باجی ۔"

"ہوں"

حسنات نے سر اٹھا کر بہن کی طرف دیکھا ۔ پھر سر جھکا لیا ۔ وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا ۔

"کہو ۔ کیا کہنا چاہ رہے ہو ۔ ؟"

"میں ۔ میں ۔"

"ہوں ۔"

"باجی ۔"

"بھئی کہہ بھی چکو ۔ کوئی خاص بات ہے جو کہتے ہوئے ہچکچاہٹ ہو رہی ہے ۔"

اس نے سر اثبات میں ہلایا ۔

عرشہ ہنس پڑی ۔ پھر بولی ۔ "تم تو میرے بھائی ہی نہیں بے تکلف دوست بھی ہو ۔ پھر یہ ہچکچاہٹ کیسی !"

وہ چند لمحے چپ رہا ۔

پھر آلتی پالتی مار کر اس کے سامنے بیٹھ گیا ۔ کچھ جھجکا پھر ہولے سے بولا ۔ "کچھ کہوں تو خفا تو نہ ہوں گی ؟"

عرشہ مسکراتے ہوئے بولی ۔ "کیوں ۔ کوئی لڑکی تلاش کر لی ہے اپنے لیے آپوں آپ ۔"

"اوہ نہیں عرشہ باجی ۔ میں نے تو اپنے متعلق ابھی کچھ سوچا ہی نہیں ۔"

"تو برشہ کے لیے کوئی پرپوزل ہے تمہارے پاس ۔ کسی دوست کا ؟"

اس نے پھر عرشہ کی طرف دیکھا ۔

"ہاں ، ہاں کہو نا ۔"

"باجی ۔ برشہ سے پہلے میں چاہتا ہوں ۔ آپ کی شادی ہو جائے ۔"

"میری ۔ !" حیرت و استعجاب سے عرشہ نے اسے دیکھا ۔

اس نے آنکھیں جھکائے جھکائے سر ہلا دیا ۔

"یہ خیال تمہارے ذہن میں کہاں سے آگیا ؟" عرشہ مسکراتے ہوئے بولی ۔

"باجی میں سنجیدہ ہوں ۔ برشہ یا میری شادی تب تک نہیں ہو گی جب تک ۔"

"میری شادی نہ ہو جائے ؟"

"ہاں"

"بے وقوف۔"

"کیوں؟"

"میری عمر۔"

"باجی۔"

"ہر بات اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہے حسنات۔ اب برشہ کی عمر ہے، تمہارا وقت ہے۔"

"آپ کا کیوں نہیں۔ آپ نے ہمارے لیے اتنی قربانی دی۔ اتنا کچھ کیا۔ کیا ہم آپ کے مستقبل کے لیے کچھ سوچنے کے حق دار نہیں ہیں۔ برشہ اپنے گھر چلی جائے۔ میں گھر بسالوں۔ تو باجی آپ۔ آپ اندر باہر سے اکیلی نہ ہو جائیں گی۔ اس اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے شادی۔"

"اے چپ رہ۔ بڑا آیا معتبر بن کر۔ اپنے چھوٹے سے ذہن پر اتنی بڑی بڑی باتوں کا بوجھ مت ڈال۔" عرشہ نے پیارسے بھائی کے سر پر ہولے سے چپت لگائی۔

حسنات اس کے گھٹنے پر سر رکھ کر پیار سے بولا۔ "میری باجی۔ میرا ذہن چھوٹا نہیں ہے اب میں بچہ بھی نہیں ہوں۔ فرسٹ کلاس آفیسر ہوں۔"

"خدا تمہیں اور بھی کامیابیاں عطا کرے۔" عرشہ نے سر جھکا کر اس کے بالوں پر بوسا دیا۔

اس دن بات ختم ہو گئی۔ حسنات اٹھ کر چلا گیا۔

لیکن۔

عرشہ کے من کے کئی سوئے ساحل جاگ اٹھے۔ وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور اپنے سراپا پر گہری گہری تنقیدی نگاہیں ڈالتے ہوئے سوکھے بے رنگ سے بالوں میں برش پھیرنے لگی۔

وہ بے شک وہ نہ رہی تھی جو وہ تھی۔

لیکن حسنات کی سوچ بھی غلط نہیں تھی۔ اس کے مستقبل کا خیال اسے صحیح آیا تھا۔

تنہائی کی کاٹ سہنا آسان نہ تھا۔ برشہ اور حسنات کی شادیوں کے بعد اس کے فرائض ختم ہو جاتے تھے۔

اس کے بعد؟

اس کے بعد؟

کیا صرف کمائی کی مشین بنے رہنے سے وقت کٹتا چلا جائے گا۔ بے مقصد اور بے مصرف؟ تنہائی۔ اور اکیلے پن سے۔

"نہیں" اس کے من کے اندر سے آواز اٹھی۔ "تنہائی کا ایک ایک لمحہ کرب و اذیت لے کر آئے گا۔"

وہ اس آواز سے خود ہی گھبرا گئی۔ خود ہی جواباً بڑبڑائی۔ "میں اپنی ذات کے اندر اب بھی لمحوں کا کرب و اذیت سہہ رہی ہوں۔"

"لیکن تمہارے سامنے اک مقصد بھی تھا۔ بہن اور بھائی کی ذمے داری کے احساس سے یہ کرب دب جاتا تھا، مٹ جاتا تھا لیکن جب تم ان دونوں کو منزلِ مقصود پہ پہنچا کر اکیلی رہ جاؤ گی۔ تو۔ تو کیا کرو گی؟"

"لیکن۔ میں کیا کروں؟" وہ زیرِ لب بولی۔

"حسنات کی بات کو مان لو۔" اندر سے آواز آئی۔

"یعنی اپنی شادی رچالوں۔ اس حال میں اس عمر۔" وہ آئینے میں اپنا آپ تکتے ہوئے ہنس پڑی۔

پھر اس کی آنکھوں میں بارہ سال پہلے کی اپنی شبیہ گھوم گئی۔ اس گھماؤ میں اسے ندیم عثمانی کا چہرہ نظر آیا جو اب ایک بھولی بسری بے ضرر سی یاد کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ اس کے چہرے پر جو دکھ و اذیت کی لہریں لہرائیں وہ صرف آئینہ ہی دیکھ سکا۔ کئی دن گزر گئے۔

وہ اپنے آپ میں بٹ سی گئی۔ حسنات نے پھر اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ لیکن عرشہ کا دل کئی بار چاہا کہ وہ اس بات کو چھیڑے اور پیار بھرے اصرار سے عرشہ کے منہ سے اس بات کے

حق میں فیصلہ اگلوالے۔ شادی اب اس کے لیے برشہ کی طرح جذباتی اور رومانی شے نہیں تھی بلکہ تحفظ اور امان کا احساس تھی۔ تنہائی اور اکیلے پن کی اذیت سے بچاؤ کا سہارا تھی۔ اس کی عمر ابھی اتنی زیادہ بھی نہیں ہوگئی تھی۔ کہ شادی کا تصور بھی اس کے اندر مر جاتا۔

وہ اکثر یہ سوچتی کہ اب اس کے لیے کوئی رشتہ آئے گا بھی تو کوئی ندیم عثمانی جیسا نہیں ہو گا۔ بچوں والا رنڈوا یا بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کا خواہش مند ہی اس کی طرف ہاتھ بڑھائے گا۔ کیا وہ کسی ایسے آدمی کے ساتھ نباہ کر سکے گی۔ عمر بھر کی وفاداری کے بندھن باندھ سکے گی۔ ایسے بچوں کو سہارا دے سکے گی۔ جو کسی مرنے والی یا مطلقہ کی کوکھ سے جنے گئے ہوں۔ وہ ان پر ممتا نچھاور کر سکے گی۔ جن کے لیے اس نے نہ تو پل پل انتظار میں کاٹا ہو نہ ہی تخلیق کا دکھ سہا ہو۔

وقت گزرتا چلا گیا۔

برشہ بی۔ اے کر کے گھر بیٹھ گئی۔ عرشہ نے چاہا بھی کہ وہ بھی ایم۔ اے میں داخلہ لے لے۔ لیکن برشہ کو پڑھنے میں واجبی ہی سی دلچسپی تھی۔

وہ عرشہ سے کہتی۔ "بس اتنا ہی کافی ہے باجی۔ مجھے بھی کہیں نوکری دلوا دیں۔ اپنے بینک ہی میں کوشش کریں نا۔"

"نہیں برشہ" عرشہ جواب دیتی۔ "تجھے نوکری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پہلے میں اکیلی تھی۔ اب تو خیر سے حسنات بھی کمانے لگ گیا ہے۔ مالی طور پر اب ہم محفوظ ہیں۔"

"لیکن گھر بیٹھے بور ہوتی رہتی ہوں نا۔"

"سلائی کڑھائی کیا کر۔"

"بوتیک کھول لوں۔"

"نہیں۔ اپنے جہیز کی چیزیں بنایا کر۔ سوچ رہی ہوں، جلد ہی تیرے ہاتھ پیلے کر دوں"

"ہائے باجی۔ یہ نہیں ہوگا۔"

"کیوں نہیں ہوگا؟"

"پہلے آپ کی باری ہے۔"

"ہٹ پگلی۔"

"کیوں!"

"تو بھی حسنات کی طرح سوچنے لگی ہے۔"

"سوچنا بھی چاہیئے۔ آپ نے ہم دونوں کے لیے اتنا کچھ سوچا ہے۔ ہم دونوں آپ کے لیے اتنا سا بھی نہیں سوچ سکتے۔"

"تم دونوں بھک گئے ہو۔"

"جی نہیں۔"

"میں اس عمر میں شادی رچاؤں گی!"

"کیوں کون سی آپ بوڑھی ہو چکی ہیں۔"

"شادی کی بھی اک عمر ہوتی ہے برشہ۔ جیسے تمہاری ہے۔ میں نے کئی جگہ تمہارے لیے رشتے کا کہہ رکھا ہے۔ میرے کولیگ ہیں صمد اسلم۔ وہ اپنے بھتیجے کے لیے خواہش مند بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے، چند دنوں کے اندر وہ لوگ تمہیں دیکھنے آئیں۔"

"اس سے پہلے آپ کو دیکھنے آئیں گے کچھ لوگ۔"

برشہ مسکراتے آنکھیں نچاتے شوخی سے کہہ رہی تھی۔ عرشہ نے حیرانی سے اسے دیکھا اور بولی۔ "مجھے دیکھنے آئیں گے۔ کیوں؟ کہاں سے۔؟"

"حسنات بھائی نے آپ کو نہیں بتایا!"

"نہیں۔"

"شاید وہ آپ کو سرپرائز دینا چاہتے ہیں۔"

"کیا بک رہی ہو۔ سیدھی سیدھی بات کرو۔"

برشہ نے پہلے تو شوخی سے ابرو اُچکائے۔ ہنسی۔ مسکراتی آنکھوں میں لطیف

سے اشارے کیے۔ جب عرشہ نے پوری سنجیدگی سے ڈانٹا تو وہ بھی سنجیدہ ہو کر بولی "عرشہ باجی حسنات بھائی کے دوست ہیں نا۔"

"کون سے دوست۔ اس کے دو تین جگری دوست ہیں۔"

"وہ ۔۔ وہ عمر..... عرفان۔"

"ہوں۔ عرفان جس کی بہن تیری کلاس فیلو بھی ہے۔ کیا نام ہے اس کا۔ ہاں سیما۔"

"ہاں۔"

"تو۔"

برشہ کچھ جھجک رہی تھی۔ عرشہ متجسس نظروں سے اسے تک رہی تھی۔ برشہ کی شرمیلی حرکات سے اسے اندازہ کرنا مشکل تو نہ رہا کہ عرفان اور اس میں پسند کی ڈور بندھ چکی تھی۔ لیکن اس سے عرشہ کا تعلق کیا تھا۔

وہ یہ بات جاننا چاہتی تھی۔ اس نے بار بار پوچھا تو برشہ بولی: "باجی، سیما نے مجھے بتایا تھا"

"کیا؟"

"کہ۔ کہ میں ان کو اس کی امی اور عرفان کو بہت پسند ہوں۔" برشہ نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر کہا۔ "ان کی امی نے حسنات بھائی سے بات کی ہے۔"

"اچھا!" عرشہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "حسنات نے مجھے یہ بات نہیں بتائی۔"

"سوچ میں پڑے ہیں اس لیے۔"

"اس میں سوچ میں پڑنے کی کیا بات ہے؟"

"ہے نا۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ ۔۔ عرشہ باجی۔"

"ہاں ہاں کہو نا ۔ کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔"

"عرشہ باجی۔ بات یہ ہے کہ سیما کا ایک بڑا بھائی اور بھی ہے۔"

تو عرشہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"اس کے دو بچے ہیں۔ بیوی فوت ہو چکی ہے۔ بہت بڑی پوسٹ پر ہے۔"

عرشہ نے سر ہلایا۔

برشہ نگاہیں جھکائے عرشہ کی ذہنی کیفیت سے بیگانہ بولے گئی: "انہیں اس بھائی کی بھی شادی کرنا ہے۔ اور۔ سیما نے مجھے بتایا ہے۔ کہ وہ۔ باجی۔ آپ۔ آپ سمجھ جائیں نا!"

"یعنی وہ اپنے بڑے بھائی کا رشتہ مجھ سے اور چھوٹے کا تم سے کرنا چاہتی ہیں۔"

"جی۔ جی!"

عرشہ چپ ہو گئی۔

"حسنات بھائی کہہ رہے تھے کہ وہ سعید چچا سے کہیں گے کہ وہ آپ سے اس سلسلے میں بات کریں۔ اگر آپ رضامند ہو جائیں تو۔ تو دونوں۔"

وہ شرما کر بھاگ گئی۔ اور عرشہ سوچوں کے بھنور میں چکرانے لگی تھی۔

اس نے اسی شام حسنات کو اپنے کمرے میں بلایا ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اصل بات کی طرف آئی۔ عرفان کو وہ جانتی تھی۔ خوب صورت شریف اور باصلاحیت نوجوان تھا۔ حسنات کے ساتھ ہی اس نے بھی سی ایس ایس کیا تھا۔ اور اب ملازمت بھی فارن آفیسرز میں مل گئی تھی۔ عرشہ کے لیے وہ موزوں ترین تھا۔ لیکن ساتھ میں اس کا رشتہ جوڑنے کی کیا تک تھی۔ یہی بات وہ حسنات سے پوچھنا چاہتی تھی۔

حسنات نے بھی جھجکتے جھجکتے بات کی: "عرشہ باجی، عرفان کا بڑا بھائی ظفر بہت ہی شریف اور صاحب حیثیت آدمی ہے۔ جاب بھی بہت اچھی ہے۔ خاندان انتہائی شریف، باوقار اور دولت مند ہے۔ عرفان کی امی کی خواہش ہے کہ دونوں بیٹوں کے رشتے ہمارے ہاں کر لیں۔ آپ ۔ آپ اجازت دیں تو وہ لوگ ہمارے ہاں آئیں۔"

عرشہ چپ رہی۔

"باجی۔ برشہ کے لیے اس سے اچھا رشتہ شاید ہی ملے۔ عرفان کی بھی خواہش ہے اور اس کے گھر والوں کی بھی۔ برشہ بھی بہت خوش ہے۔ عرفان اور برشہ کی جوڑی بہت اچھی رہے گی۔ باجی، برشہ ان سب کو پسند ہے۔ انہیں جہیز کا بھی کوئی لالچ نہیں۔ کسی قسم کا بار نہیں ڈالیں گے ہم پر۔"

"تو خوشی سے آئیں۔ ہم برشہ کا رشتہ کر دیں گے۔"

"خالی برشہ کا نہیں نا۔"

"تو ضروری ہے کہ میں بھی۔"

"ہاں باجی۔ وہ دونوں رشتے کرنا چاہتے ہیں۔"

"دونوں کے لیے مجبور تو نہیں کر سکتے۔ برشہ انہیں پسند ہے، ٹھیک ہے۔"

حسنات تذبذب میں پڑ گیا۔ چند لمحے سر جھکائے ہاتھ ملتا رہا۔ پھر بیچارگی سے بولا "عرشہ باجی، انہیں ظفر کا رشتہ بھی کرنا ہے اور وہ چاہتے ہیں دونوں بہنیں۔"

"حسنات۔ تم مجھے مجبور نہیں کرو۔"

"باجی۔ برشہ کے لیے۔ یہ بات میں بڑے دکھ سے کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ نے انکار کر دیا تو شاید برشہ کا رشتہ بھی نہ ہو سکے۔"

"کیوں؟"

"ان کی امی۔ یا تو دونوں رشتے لیں گی۔ یا ایک بھی نہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"بس ان کی اپنی سوچ ہے۔ اسی میں مصلحت سمجھتی ہوں گی۔ کہ دونوں بہنیں ایک ہی گھر سے آجائیں۔ تو ظفر کے بچوں کا مستقبل سنور جائے گا۔ شاید ان کے ذہن میں یہ خیال بھی ہو۔ کہ آپ نے جیسے ہمیں پالا پوسا ہے۔ ان بچوں کو بھی۔ آپ اسی طرح پالیں پوسیں گی۔"

عرشہ چپ ہو گئی۔

"آپ سوچ لیں عرشہ باجی۔ آپ کو مجبور تو کوئی نہیں کر سکتا۔ نہ ہی کوئی دباؤ ڈالا جا سکتا ہے ہو سکتا ہے، میرا سوچنے کا انداز غلط ہو۔"

عرشہ نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاں اس کی سوچیں گمبھیر ہو گئیں۔

حسنات نے سعید چچا سے بھی بات کی۔ جو باتیں وہ کھل کر خود عرشہ سے نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سعید چچا کر سکتے تھے۔ اتنے اچھے اور موزوں رشتے قسمت ہی سے مل رہے تھے۔ سعید چچا کے بھی دل کو لگے تھے۔ عرشہ کو قائل کرنا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔

سعید چچا کئی دن عرشہ کو سمجھاتے رہے۔ ظفر ہر طرح سے عرشہ کے لیے موزوں تھا۔ عمر میں بھی کوئی تین سال ہی بڑا تھا۔ خوبرو، لائق اور ایک کلیدی حیثیت کی جاب پر فائز تھا۔ شرافت مسلّم تھی۔ بچے بھی کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھے۔ دونوں ماں کے مرنے کے بعد دادا، دادی کے پاس تھے۔ اور جب تک ان میں ہمت تھی۔ بچوں کی ذمے داری کا بیڑا وہی اٹھانے کو تیار تھے۔

عرشہ انکار کرتی تو کس بنا پر کرتی۔ اس عمر میں ایسا رشتہ ملنا بھی بہت بڑی بات تھی۔

وہ کئی دن سوچتی رہی۔

اس نے یہ بھی دیکھا کہ برشہ اس کی سوچوں کی طوالت سے پژمردہ سی رہنے لگی ہے۔ شاید اسے دھڑکا لگا تھا کہ عرشہ نے انکار کر دیا تو وہ بھی عرفان کو نہ پا سکے گی۔

عرشہ نے بہت سوچا۔ بڑا الجھی۔ کئی دفعہ ندیم عثمانی کا خیال آیا۔

لیکن آخر اسے فیصلہ کرنا ہی پڑا۔ جب ندیم عثمانی نہیں۔ تو کوئی بھی سہی، ظفر ہو یا کوئی اور۔ یہ فریضہ ادا کرنا ہی ہے تو کر ہی دیا جائے۔

اس نے چچا کے سامنے سر جھکا کر خاموشی سے اپنے فیصلے سے انہیں آگاہ کر دیا۔ برشہ کی خوشیوں کا تحفظ صرف اسی طور پر ہو سکتا تھا۔

گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ برشہ کے چہرے پر تو چاندنی بکھر بکھر گئی۔ شگوفوں کی مہک پھیل گئی۔ اسے خوش دیکھ کر عرشہ کو وہ وقت یاد آیا۔ جب وہ ندیم عثمانی سے ازدواجی بندھن

باندھنے کا وعدہ لے کر گھر آئی تھی۔

ندیم عثمانی جو اب اک بھولی بسری بے ضرر سی یاد کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اس یاد میں اب بھی تندی اور تیزی ہوتی تو شاید عرشہ اتنا بڑا اور اہم فیصلہ کبھی نہ کر پاتی۔

کچھ دن تیاریوں کی نذر ہو گئے۔

پھر عرشہ کی شادی ظفر سے ہو گئی۔

اور ایک ماہ بعد بریشہ دلہن بن کر خوابوں کی جنت میں اتر آئی۔

حسنات بے حد خوش تھا۔ اس کو لگتا تھا جیسے اس نے اک ذمے دار باپ کا فرض بحسن و خوبی ادا کر دیا ہے۔ دونوں بہنیں اپنے اپنے گھر میں آباد ہو گئی تھیں۔ یہ کوئی کم خوشی کی بات نہ تھی۔ زیادہ خوشی تو اسے عرشہ کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ جو اب تک بار اٹھائے ہوئے تھی۔ شاید تھک بھی چکی تھی۔ اب سستانے کا وقت آ گیا تھا۔ اس کے سر پر اب چھتنار درخت کا سایہ اور ٹھنڈک تھی۔

عرشہ اپنا گھر بسا چکی تھی۔ بریشہ بھی راہِ زندگی پر کامیابی سے گامزن تھی۔ دونوں کو اب حسنات کا گھر بسانے کی آرزو اور فکر تھی۔

وہ کوئی بہت ہی اچھی لڑکی تلاش کر رہی تھیں۔ ایسی لڑکی جو حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت سے بھی مالا مال ہو۔

اس دن عرشہ اسی سلسلے میں میکے آئی ہوئی تھی۔ دونوں بچے بھی ساتھ آئے تھے۔ تین چار ماہ ہی میں بچے اس سے بے حد مانوس ہو گئے تھے۔ عرشہ نے فراخدلی سے ممتا کی چھاؤں انہیں مہیا کی تھی۔

اس نے چچی کے ساتھ کہیں لڑکی دیکھنے جانا تھا۔ وہ کمرے میں کپڑے تبدیل کرنے آئی خوب صورت سا جوڑا استری کر کے بستر پر پھیلا رکھا تھا۔ وہ ابھی باتھ روم میں جانے ہی والی تھی کہ ملازم لڑکا آ گیا۔

"بی بی جی!" وہ دروازے پر رک کر بولا۔

"ہوں!" عرشہ نے مڑ کر دیکھا۔

"کوئی مہمان آئے ہیں!"

"کون؟"

"پتا نہیں جی۔ ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں!"

"نام نہیں پوچھا!"

"نہیں!"

"باہر ہی کھڑے ہیں!"

"جی نہیں بیٹھک میں بٹھا دیا ہے!"

"اچھا!" عرشہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ اس لیے نہیں کہ آنے والے کے متعلق کوئی خیال آیا تھا صرف اس لیے سوچ میں پڑی کہ کپڑے پہلے تبدیل کرے یا آنے والے صاحب سے مل کر بعد میں بدل لے۔

اس نے اسی طرح بیٹھک میں جانے کا ارادہ کیا۔ ہو سکتا ہے کوئی اس کا بینک کا کولیگ ہو۔ یا بینک ہی کے سلسلے میں کوئی ملنے والا ہو۔ اس نے جلدی سے بالوں میں برش کیا۔ آئینے میں سراپا دیکھا۔ دوپٹہ کندھوں پر ڈالا اور کمرے سے نکل کر بیٹھک کی طرف چل دی۔

وہ سامنے ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔

عرشہ نے اندرونی دروازے کا پردہ ہٹا کر اندر آنے کے لیے قدم رکھا تو نظر ان پر پڑی۔

نظریں ساکت سی ہو گئیں۔

وہ پردے کو ہاتھ میں سختی سے پکڑے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

وہ ندیم عثمانی تھے۔

تیرہ چودہ برسوں میں جسم قدرے بھاری ہو گیا تھا اور آنکھوں پر چشمہ آ گیا تھا کنپٹیوں کے بالوں پر تھوڑی تھوڑی سفیدی اتر آئی تھی۔ بس۔ باقی ویسے کے ویسے ہی تھے۔

انہوں نے عرشہ کو دیکھتے ہی اٹھ کر بڑی گرمجوشی سے سلام کیا۔ "ہیلو۔ کیسی ہو۔؟"

عرشہ نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ آنکھیں بار بار کھولیں بند کیں۔

پھر اپنے آپ کو بمشکل سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ کر قریبی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"پہچاننے میں دشواری ہو رہی ہے۔ بھول چکی ہو۔ میں ندیم عثمانی ہوں" ندیم نے عجلت، گھبراہٹ اور مسکراہٹ کے درمیان کہا۔

وہ آگے بڑھ کر عرشہ کے قریب والے صوفے پر آبیٹھے۔

"عرشہ" انہوں نے اک مسکراتی نگاہ اس پر ڈالی "حیران ہو رہی ہو مجھے دیکھ کر پریشان؟"

عرشہ نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وقتی پشیمانی اور دباؤ سے اپنے آپ کو نکالتے ہوئے بولی "سر! آپ نے یوں اچانک آکر حیران ہی کر دیا"

عثمانی مسکرا کر گہری سانس چھوڑتے ہوئے ذومعنی لہجے میں بولے "شکر ہے۔ پریشان نہیں کیا۔ کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں!"

"میں پورے ساڑھے بارہ سال بعد کل ہی یہاں آیا ہوں!" وہ عرشہ کو دیکھتے ہوئے بولے

"اتنا عرصہ آپ کہاں رہے سر؟" عرشہ کے اندر زبردست توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔ لیکن کمال ہمت سے وہ عثمانی کا سامنا کرتے ہوئے ان سے باتیں کر رہی تھی۔

عثمانی نے مختصراً ان سالوں کی روئیداد اسے سنائی۔ وہ عرشہ کے یونیورسٹی چھوڑنے کے کچھ ماہ بعد ہی اس سے آخری دفعہ مل کر امریکہ چلے گئے تھے۔ وہیں ملازمت کر لی تھی۔

"عرشہ" مختصر سی روئیداد چند لمحوں میں اس کے گوش گزار کرنے کے بعد وہ بڑی رسانیت سے بولے۔

"جی۔" بے جان سی آواز عرشہ کے وجود سے نکلی۔

"یاد ہے جب ہم آخری بار ملے تھے تو تم نے کیا کہا تھا"

"سر۔"

"تم نے کہا تھا کہ تمہاری ذمے داریاں بارہ تیرہ سال کے طویل عرصے پر پھیلی ہیں۔ اور میں نے جواب دیا تھا۔ تو پھر بارہ تیرہ برس کا بن باس کاٹنا ہوگا"

"سر۔ وہ۔" عرشہ اندر سے کانپ اٹھی۔

اس کی بات سنے بغیر وہ اپنی لے میں بولے۔ "عرشہ میں بارہ تیرہ برس کا بن باس کاٹ کر واپس آگیا ہوں۔ اب تو تمہاری ذمے داریاں نبھ چکی ہوں گی۔ اور۔"

"ممی" دونوں بچے کمرے میں آتے ہی عرشہ کے گلے میں بازو ڈال کر جھول گئے۔ جیسے بم پھٹا۔ ندیم عثمانی کی بات ادھوری رہ گئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ عرشہ اور بچوں کو دیکھنے لگے۔ کچھ پوچھنے کی ان میں ہمت نہ رہی۔

عرشہ نے ان پر اک نگاہ ڈالی۔ اس کے اندر اک چیخ ابھری اس نے کہنا چاہا، سر آپ نے دیر کر دی۔ لیکن وہ چپ رہی۔ اپنے آپ کو سنبھالا۔ چہرے پر اندرونی کرب کی ایک جھلک تک نہ آنے دی۔ چند لمحے سر جھکائے ضرور بیٹھی رہی۔

پھر۔ ہاں پھر

دونوں بچوں کے ہاتھ پکڑ کر گود میں بٹھاتے ہوئے بولی "سر یہ ظفر کے بچے ہیں۔ اور اب میں مسز ظفر ہوں۔ ذمے داریوں کا بوجھ ایک بار پھر مجھے سونپ دیا گیا ہے!"

"عرشہ" عثمانی کے چہرے پر دکھ کے مہیب سائے لہرانے لگے۔ وہ صرف یہی کہہ سکے۔

عرشہ بچوں کو ہٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہاں رکنا محال تھا۔ ندیم عثمانی کے چہرے پر پھیلی مایوسی اور دکھ کے سائے دیکھنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

"سر، میں آپ کے لیے چائے بنواتی ہوں!" وہ ان کا جواب سنے بغیر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

ندیم عثمانی نے دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے تیرہ دنوں

کانہیں تیرہ مہینوں کا بھی نہیں۔ تیرہ سالوں کا بن باس کاٹا تھا۔ کیا یہی دن دیکھنے کے لیے ؟

کاش وہ امریکہ سے واپس ہی نہ آتے۔ امید کتنی حسین اور کتنی جاندار چیز ہے۔ اس کے سہارے جہاں اتنے برس کاٹے تھے۔ کیا تھا جو پوری زندگی ہی کٹ جاتی۔

عرشہ چائے لے کر آئی تو ندیم عثمانی جا چکے تھے۔

برسوں پہلے
ندیم عثمانی عرشہ سے بچھڑے تھے۔
ملنے کے لیے
اور اب
اب بچھڑے تھے۔
کبھی نہ ملنے کے لیے۔

بہلاوے

میں بچوں کو اسکول ڈراپ کر کے مارکیٹ چلی گئی۔ ضروری سودا سلف لینا تھا۔ اسٹور میں گھومتے پھرتے چیزیں خریدتے اور پیک کرواتے ساڑھے دس بج گئے۔ میں نے ساری چیزیں جلدی جلدی گاڑی میں رکھیں اور گھر کی راہ لی۔ چھ ماہ کی مونا کو سلا کر آئی تھی۔ اس کے دودھ کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ یقیناً اٹھ چکی ہوگی اور دودھ کے لیے رو رہی ہوگی۔

مجھے ڈاکخانے بھی جانا تھا۔ لیکن مونا کا خیال کر کے سیدھی گھر چلی آئی۔ شانو۔ میں نے پورچ میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے ملازم لڑکے کو آوازی دی۔ مونا کے رونے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں نے تسکین کی سانس لی۔

"جی بیگم صاحب" شانو کندھے پر جھاڑن رکھے باہر آگیا۔

"گاڑی سے سودا نکالو۔ اور کچن میں لے چلو۔"

"اچھا بیگم صاحب"

"شیداں یہیں ہے نا ؟"

"جی کپڑے دھو رہی ہے"

"مونا سو رہی ہے"

"جی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ جاگ رہی ہیں۔ شیداں نے جھولے میں ڈال دیا ہے۔ کھیل رہی ہیں"

"اچھا احتیاط سے چیزیں نکالو"

"بہت بہتر۔"

"گاڑی بند کرکے آنا۔"

"اچھا جی۔"

میں شانو کے سپرد اس کا کام کرکے اندر آئی۔ ابھی مونا تک بھی نہ جا پائی تھی کہ کال بیل بجی۔

"اوہ۔ کون آگیا؟" میں نے بیزاری سے کہا۔ اور خود بیل کرنے والے کا انتظار کیے بغیر اپنی بچی کے جھولے کی طرف بڑھ گئی۔ گول مٹول سی مونا بڑی خوش تھی۔ رنگین جھنجھنا جو جھولے کے ساتھ لٹک رہا تھا اسے دیکھ دیکھ کر خوب ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی اور غوں غاں کی بے مقصد آوازیں نکال رہی تھی۔

"اوہ میرا گوٹا مونا۔ بھوک نہیں لگی۔ دودھ پیئے گا گبلو۔" میں بچی کو بازوؤں میں بھر کر پیار کرنے لگی۔

"بیگم صاحب!" شانو نے پکارا۔

"کیا ہے؟"

"اک بیگم صاحب ملنے آیا ہے جی۔"

"کون بیگم صاحب؟"

"بولتا ہے ہمسایہ ہے۔ آپ سے ملنے آیا ہے۔" شانو پٹھان لڑکا تھا۔ برسوں سے ادھر ہی رہ رہا تھا۔ لیکن مونث مذکر کی الٹ پھیر ہمیشہ کر دیا کرتا تھا۔

"انھیں بٹھاؤ۔ میں آتی ہوں۔"

"بٹھا دیا جی ڈرائینگ روم میں۔ صوفہ سیدھا کرکے رکھ دیا ہے۔"

"اچھا۔ ہاں سودا نکال لیا؟"

"نکال رہا ہوں جی۔ وہ بیگم صاحب آگیا تھا۔ اب نکالتا ہوں۔"

مجھے اس وقت کسی کا آنا اچھا نہیں لگا۔ سو کام بکھرے پڑے تھے۔ اس گھر میں آئے ہمیں چوتھا دن تھا۔ ابھی تک سامان پوری طرح نہیں کھولا تھا۔ بمشکل ایک بیڈ روم سیٹ کر پائی تھی۔ ڈرائینگ روم میں قالین رول ہوا پڑا تھا۔ صوفے بے ترتیب تھے۔ میزیں بندھی پڑی تھیں۔ تصویریں دیوار

کے ساتھ الٹا کر رکھی تھیں۔ ڈیکوریشن کی ساری چیزیں پیک تھیں ابھی۔

میں چند لمحے مونا کو پیار کرتی رہی۔ پھر شیداں سے کہا۔ شیداں مونا کا دودھ بنا لاؤ۔ دس بجے دینا تھا گیارہ بجنے والے ہیں۔ بیچاری بچی!

"اچھا بیگم صاحب۔"

"بوتل فریج میں رکھی ہے۔ اچھی طرح دیکھ لینا۔ شانو کبھی کبھی ٹھیک طرح سے صاف نہیں کرتا۔ چینی ایک چمچ ڈالنا۔"

"مجھے پتہ ہے بیگم صاحب جی۔"

"تو سنبھالو اسے۔ کوئی ملنے والا آیا ہے۔"

"اچھا جی۔" شیداں نے گیلے ہاتھ دوپٹے سے پونچھ کر مونا کو لینا چاہا۔ مونا ہنس کر میرے ساتھ لپٹ گئی۔ منی سی بچی کو میری خاص پہچان تھی۔ میں نے زبردستی مونا کو شیداں کے حوالے کیا۔ اپنے کمرے میں آئی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ بالوں میں برش پھیرا۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک کا ٹچ دیا۔ اور دوپٹہ درست کرتے ہوئے ڈرائینگ روم میں آگئی۔

بے ترتیب سی چیزوں کے درمیان ایک صوفے پر وہ بیٹھی تھی۔ میں نے ناگواری کو مسکراہٹ تلے دبا کر بڑے تپاک سے اسے خوش آمدیدی انداز میں سلام کیا۔ وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی میرے سلام کے ساتھ ہی اس نے بھی سلام کیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر تپاک سے مسکرا دیں۔

وہ پچیس چھبیس سالہ بڑی پرکشش اور اسمارٹ سی خاتون تھی۔ سیاہی مائل ہلکے زرد رنگ کا نیلے اور کالے پھولوں والا سوٹ پہن رکھا تھا۔ دوپٹہ بھی سوٹ ہی کی طرح کا تھا۔ اس کا رنگ گورا نہیں تھا۔ لیکن گندمی رنگ میں بلا کی ملاحت تھی۔ ناک نقشہ عام سا تھا۔ البتہ بال سیاہ اور لمبے تھے۔ اس کی ڈھیلی سی چوٹی پشت سے نیچے آرہی تھی۔ اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں لیکن پتہ نہیں مجھے ان آنکھوں میں زندگی کی بجائے موت کا سا سکوت گھلا محسوس ہوا۔ پھر بھی اس کی آنکھیں پرکشش تھیں۔

"تشریف رکھیے" مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میرا اس وقت آنا ناگوار تو نہیں گزرا" اس نے تو شاید یونہی کہہ دیا تھا مجھے لگا میرے چہرے سے اس نے یہ احساس پڑھ لیا ہے۔ اس لیے میں دانستہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ایسا کیوں سوچا آپ نے مجھے تو بیحد خوشی ہوئی ہے۔"

"میں کل آنا چاہ رہی تھی۔ گیٹ تک آئی بھی۔ لیکن پھر لوٹ گئی۔ آپ کو یہاں آئے تین چار دن ہی ہوئے ہیں نا۔"

"جی آج پانچواں دن ہے۔ دیکھ لیں ابھی تک سامان کھلا ادھر کھلا پڑا ہے۔ سیٹ کرنے میں کئی دن لگیں گے۔"

"کہیں تو میں آپ کی مدد کر دوں۔"

"شکریہ۔ آپ رہتی کہاں ہیں؟"

"سامنے والی قطار میں دائیں ہاتھ۔ کالے گیٹ والا گھر میرا ہے۔"

"اچھا۔ اچھا۔ جہاں بڑی خوش رنگ بیلیں ہیں۔ پوری عمارت پھولدار بیلوں سے گھری ہے۔"

"جی وہی۔"

"یقین مانیں۔ مجھے یہ گھر بہت اچھا لگا تھا۔ کس سلیقے سے آپ نے بیلیں چڑھا رکھی ہیں پھولوں سے مجھے بڑا پیار ہے۔ یہ قدرتی ڈیکوریشن۔"

"جی۔ مجھے بھی عشق ہے پھول پودوں سے۔"

"پھر تو دوستی خوب نبھے گی ہماری آپ کی۔" میں نے بے تکلفی سے ہاتھ پھیلایا اس نے اپنا سلونا سا نرم و گداز ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

میں معذرت کر کے چند لمحوں کے لیے کچن کی طرف گئی۔ شانو سے چائے بنانے اور بسکٹ اور مرمرے جو میں ابھی مارکیٹ سے لائی تھی رکھ کر لانے کا کہہ کر پھر اندر آ گئی۔

ہم دونوں باتیں کرنے لگیں۔

اس نے پوچھا "آپ لوگ کہیں سے پوسٹ ہو کر آئے ہیں۔ یا یہاں ہی گھر تبدیل کیا ہے"

میں نے اسے پوسٹنگ کا بتایا۔ میرے میاں سہیل ملٹی نیشنلز کی ایک مشہور فرم میں منیجر تھے۔ کراچی سے تبادلہ لاہور ہو گیا تھا۔ یہاں پروڈکشن منیجر ہو کر آئے تھے۔ کافی سہولتیں تنخواہ کے علاوہ بھی ملی تھیں۔ جن میں سب سے بڑی سہولت چار بیڈ روم کی یہ خوبصورت کوٹھی بھی تھی

میں نے مختصراً سہیل کے بارے میں اسے بتایا۔

"آپ کے بچے؟" اس نے اپنی بے جان آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"تین ہیں" میں نے کہا۔ "دو بیٹے۔ ایک بیٹی۔ بیٹے سات اور پانچ سال کے ہیں۔ بیٹی چھ ماہ کی ہے۔"

"میرا ایک ہی بیٹا ہے" اس نے اسی لہجے میں کہا۔

میں ہنس پڑی۔ اور بولی "بھئی یقین مانیں۔ میں تو پوچھتے ہوئے جھجک رہی تھی کہ آپ کی شادی بھی ہوئی ہے یا۔"

میری شادی کو اگلے ماہ پورے چھ سال ہو جائیں گے۔ وہ بولی۔ "پانچ سال کا کوکب ہے میرا۔"

"آپ کے میاں کیا کرتے ہیں؟" میرے سوال پر چند لمحے وہ جیسے کسی پریشانی سے دوچار ہوئی پھر فوراً ہی سنبھل گئی۔ مسکراتے ہوئے بولی "انجینئر ہیں سعودی عرب میں۔"

"اوہ۔ اچھا" میں نے مسکرا کر کہا۔ گویا اس کی لمحاتی پریشانی کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔

"کب سے وہاں ہیں؟"

"شادی سے ایک سال پہلے گئے تھے۔"

"آپ بھی گئیں۔۔؟"

"ایک دفعہ گئی تھی۔ کوکب صاحب تشریف لانے والے تھے۔ اس لیے واپس آ گئی۔"

"پانچ سال سے آپ پھر گئی نہیں۔"

"نہیں۔"

"وہ جلدی جلدی چکر لگا لیتے ہوں گے۔"

"کہاں جی۔ سال میں ایک ماہ کی چھٹی ہوتی ہے۔"

"ہائے"... میں ہنس کر بولی۔ "سال کے گیارہ مہینے..... انتظار ہی میں گزار دیتی ہیں آپ"۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک بالکل نہیں تھی۔ موت کا کپکپا دینے والا سکوت تھا۔ وہ بولی: "انتظار ہی زندگی ہے۔"

میں نے دانستہ اس تکلیف دہ موضوع کو بدل دیا۔ اس سے پوچھا: "آپ کا بیٹا کیا نام بتایا آپ نے؟"

"کوکب۔"

"ہاں کوکب۔ کس کلاس میں ہے؟"

"کلاس ون میں۔"

"میرا نوفل بھی کلاس ون میں ہے۔ نبیل کلاس ٹو میں۔"

"کس اسکول میں داخل ہوئے ہیں بچے؟"

"سینٹ انتھنی میں۔"

وہ خوش ہو کر بولی: "کوکب بھی وہیں پڑھتا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ بچے بہت خوش ہوں گے۔ میرا نوفل تو بڑی جلدی دوستی کر لیتا ہے۔"

"کوکب بھی ایسا ہی ہے۔"

شانو چائے لے آیا۔ ٹی کوزی ایک سیٹ کی پیکن دو مُرسکے پلیٹیں اور کپ اور......

میں نے معذرتانہ انداز میں کہا: "رنگ برنگے برتنوں میں کھا پی رہے ہیں ہم لوگ۔ ابھی برتن وغیرہ سب پیک ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہفتہ دو تو ابھی لگیں گے گھر سیٹ کرنے میں۔ آپ کہیں تو میں

میں روز آجایا کروں مدد کے لیے۔"

میں نے اس کی پُر خلوص آفر پُر خلوص طریقے ہی سے لوٹا دی۔

"آپ اس گھر میں اپنے سسرال والوں کے ساتھ رہتی ہیں؟" میں نے اپنی پیالی میں شکر گھولتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ یہ میری امی کا گھر ہے۔"

"آپ اپنی امی کے پاس رہتی ہیں گویا۔"

"پتہ نہیں۔" اس نے چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ "امی میرے پاس رہتی ہیں یا میں امی کے پاس۔"

میں اس کی بات سے کچھ سمجھی نہیں۔ بات کی گہرائی میں جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پہلی ملاقات تھی۔ کیا خبر کیسے لوگ تھے۔ کسی بات کا برا ہی نہ مان جائے اسی لئے میں نے ایک بار پھر موضوع دوسری طرف پھیر دیا۔

محلے کے لوگ کیسے ہیں؟

دائیں ہاتھ کون رہتا ہے؟

بائیں کون؟

"سامنے والے گھر میں اکبر اور سعیدہ اکبر رہتے تھے۔ وہ ہم لوگوں سے ملنے کل رات آ چکے تھے۔"

"اچھے لوگ ہیں۔" میں نے اکبر اور سعیدہ کے متعلق کہا۔

"ہاں بہت اچھے۔ بڑے ملنسار۔ کام آنے والے۔ شریف لوگ ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر موت کا سکوت گھل گیا۔ بے جان نظروں سے مجھے دیکھا اور ڈوبتی آواز میں بولی: "میں تو اسی وقت ملنے آسکتی ہوں آپ کو۔ میرے میاں تو یہاں نہیں ہیں نا۔ اس لیے شام کو آنے کا سوال نہیں۔ شام کو تو آپ کے ہاں کپل ہی آسکتے ہیں نا سہیل

بھائی اور آپ سے ملنے۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے ہنس کر کہا۔ اس کی بات سے جانے کیوں مجھے دلی دکھ ہوا۔ لیکن دکھ کی بات تو نہیں تھی۔ ظاہر ہے اس کا میاں یہاں نہیں۔ اور وہ اکیلی کسی کے ہاں کام کرنے اسی وقت ہی آسکتی ہے۔ اینٹی کیٹ یہی تھے۔ اور وہ اتنی سلجھی ہوئی تھی۔ اینٹی کیٹ کا پاس کرنا ہی تھا اسے۔

فضا پھر بوجھل سی ہوگئی تھی۔ اس لیے میں نے پھر ٹاپک بدلا۔ ہنس کر بولی: "دیکھو تو۔ اتنی دیر سے ہم بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کا نام تک نہیں پوچھا۔ آپ کا نام؟"

سنبل۔ مسز سنبل عارف۔ عارف مجھے شبنی کہتے ہیں۔"

میں مسکرا کر بولی "صرف عارف کا حق ہے شبنی کہنے کا۔ یا کوئی دوسرا بھی استعمال کر سکتا ہے؟"

"حق تو ان ہی کا ہے۔ ویسے چاہیں تو آپ بھی شبنی کہہ لیں۔" وہ پہلی بار کھل کر مسکرائی "امی بھی شبنی کہتی ہیں۔"

"لگتا ہے آپ اپنی امی کی اکلوتی بیٹی ہیں۔"

"یہ کیسے جانا؟"

"بس۔ یہی محسوس ہوا باتوں سے۔"

"میرے دو بھائی ہیں۔ دونوں امریکہ میں سیٹل ہو گئے ہیں بہن میں ایک ہی ہوں۔ سو امی کی اس لحاظ سے اکلوتی اور اس لحاظ سے بھی کہ بھائی برسوں بعد آتے ہیں۔ پھر چلے جاتے ہیں یقین کریں فون بھی سالوں بعد کرتے ہیں۔"

"پھر تو میں نے ٹھیک کہا نا۔ کہ آپ اکلوتی ہیں۔"

"بالکل۔ میں اور امی ماں بیٹی بھی ہیں۔ دوست بھی مونس و غمگسار بھی۔"

"آپ کے والد؟"

"فوت ہو گئے ہیں دو سال ہوئے ہیں۔ امی بس بکھر کر رہ گئی ہیں۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔ رفاقت ٹوٹ جائے تو ایسا ہوتا ہی ہے۔"

"نہیں ہونا چاہیئے نا۔" اس نے اتنے زوردار لہجے میں کہا کہ میں اس کا منہ تکنے لگی۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔ آنکھوں کی بے جان کیفیت جاندار ہو گئی تھی۔ وہ بحث کرنے کے موڈ میں نظر آنے لگی تھی۔ بولی "اب امی یہ سمجھ لیں۔ یہ بات ذہن میں بٹھا لیں کہ ابو میرے نہیں زندہ ہیں۔ تو اس میں ہرج کیا ہے۔"

وہ اس طرح بے معنی اور لایعنی باتیں کرنے لگی کہ مجھے اس کی دماغی صحت پہ ایک لمحہ کو شک سا ہوا۔

میں نے بات ختم کرنے کے لیے ہنس کر کہا: "آپ کی چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ لائیں اور بنا دوں۔"

"بس ٹھیک ہے شکریہ۔" اس نے کہا اور پھر اپنا نظریہ بیان کرنے لگی۔ اس نے چند باتیں ہی کیں کہ میں مسکرا کر بولی۔ "چھوڑیئے سنبل اس بحث کو۔ ہاں تو آپ نے میرا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

"سوری۔" اس نے کہا "واقعی۔ ہاں تو آپ کا نام؟"

"کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے مذاق کیا۔

"وہ برجستہ بولی۔ مسز سہیل"

اس کی حاضر دماغی پر میں مسکرا اٹھی۔ میرے ذہن میں جو اس کی دماغی صحت کے بارے میں شک گزرا تھا۔ میں اس پہ دل ہی دل میں نادم ہوئی۔

"میرا نام رابعہ سہیل ہے۔" میں نے چائے کی پیالی واپس رکھتے ہوئے کہا۔

"پیارا نام ہے۔"

"پیارا تو نام ہے۔ تمہاری طرح تمہارا نام بھی پیارا ہے۔"

"میں پیاری ہوں۔" وہ ہنس پڑی۔

"بہت۔ بہت زیادہ۔"

"ایسے ہی رابعہ جی۔"

"نہیں سچ کہہ رہی ہوں۔"

میں واقعی سچ کہہ رہی تھی۔ وہ مجھے بہت پیاری لگی تھی۔ اس کی شخصیت اس کا رکھ رکھاؤ اس کا اندازِ گفتگو سبھی دلنشیں تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اپنے ذوق کی خاتون ہمسایہ میں رہتی ہے۔

چائے کے بعد بھی ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ پھولوں کی باتیں زیادہ کیں۔ مجھے حیرانی ہوئی پھولوں کے متعلق اس کا علم اور تجربہ خاصا وسیع تھا۔

آئندہ ملنے کا وعدہ کر کے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"رابعہ آپ تکلف کرتی ہیں۔ چاہیں تو میں روز آجایا کروں گھر سیٹ کرنے میں مدد دینے کے لیے۔ فارغ ہی ہوتی ہوں۔"

میں نے ملائمت سے شکریہ ادا کیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ میں اسے گیٹ تک چھوڑنے گئی۔

چند دن میں گھر ہی کی نوک پلک سنوارتی رہی۔ شام کو تھوڑا سا وقت نکال کر میں اور سہیل اپنے ہمسایوں سے ملنے چلے جاتے کبھی دائیں ہاتھ والے آجاتے کبھی بائیں والے۔ سامنے کے تینوں چاروں گھروں سے لوگ آچکے تھے۔ ان سے شناسائی ہوگئی تھی۔

لیکن میں سبنی کے ہاں نہ جاسکی۔ اس کا میاں یہاں نہیں تھا۔ نہ ہی والدین حیات تھے۔ اس لیے سہیل کا ان کے ہاں جانا موزوں نہیں تھا۔ مجھے ہی جانا تھا لیکن فرصت نہ مل سکی۔

ہفتے عشرے کے بعد وہ خود ہی آگئی۔ آتے ہی بے تکلفی سے بولی "رابعہ آپ نے میرے ہاں آنے کی زحمت نہیں کی نا۔"

"اوہ سوری" میں واقعی شرمندہ ہوئی۔ "یہی روز سوچتی تھی۔ تمہارے ہاں آؤں۔ لیکن وقت ہی نہ مل سکا۔"

"حالانکہ محلے کے ہر گھر میں آپ کو جانے کا وقت مل گیا۔" اس نے ہنس کر گلہ کیا اب میں اسے کسی طور نہ کہہ سکی کہ شام کو فرصت ہوتی ہے اور میں سہیل کے ساتھ ان سب گھروں میں گئی ہوں۔

تمہارے ہاں تو صبح کے وقت ہی آسکتی ہوں تا میں نے کچھ کہا نہیں۔ وہ خود ہی مسکرا کر بولی "چلو معاف کیا۔"

"شکریہ سبنی۔ تم بہت اچھی ہو۔"

"خیر اتنی اچھی بھی نہیں۔" وہ مسکرا رہی تھی اور ہاتھ میں پکڑا کارڈ جھلا رہی تھی۔

"کیوں؟"

"کیوں کہہ دیا سو کہہ دیا"

"پھر بھی کیوں۔ کیوں اتنی اچھی نہیں تم۔"

اس نے بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "دراصل میں اتنے دن یہاں تھی ہی نہیں"

"سچ۔"

"ہاں۔"

"اچھا ہی ہوا۔ تمہارے ہاں میں آئی نہیں۔"

"آجاتیں تو گھر میں نوکر اور نوکرانی ہی ملتے۔"

"کہاں گئی ہوئی تھیں؟"

"امی کو لینے۔ پنڈی۔ ماموں کے ہاں گئے انھیں دو ہفتے ہوگئے تھے۔"

ہم دونوں ڈرائینگ روم میں آبیٹھیں۔ اس نے ایک سرسری سی نگاہ کمرے پر ڈالی۔

"اچھا ذوق ہے تمہارا۔" اس نے کہا۔

"شکریہ۔" میں نے انجانا سا فخر محسوس کیا۔

"ہوگیا پورا گھر سیٹ؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں کچھ ہو ہی گیا ہے۔"

"آپ کے بچے کہاں ہیں۔ آج تو چھٹی ہے۔ گھر پہ ہی ہوں گے۔"

"مونا گھر پہ ہے نوفل اور نبیل آج خالہ کے ہاں گئے ہیں۔"

"آج آجائیں گے۔"

"شام کو آجائیں گے۔ کیوں؟"

"میرے کوکب کی برتھ ڈے ہے کل۔"

"اوہ۔ اچھا۔ مبارک ہو۔ کتنے سال کا ہوگا؟"

"پانچویں برتھ ڈے ہے۔ میں تمہارے بچوں کو مدعو کرنے آئی تھی۔"

میں نے ہنس کر کہا "صرف بچوں کو۔ مجھے نہیں۔"

"آپ بھی ضرور آئیں" وہ بے چین سی ہوئی۔ اس کی حسین آنکھوں میں وہی موت کا سکوت گھلا اور رنگت قدرے پھیکی پڑ گئی۔ جلدی سے بولی "عارف ہوتے تو سہیل بھائی کو بھی مدعو کرتی۔ میں ان کے نہ ہونے کی وجہ سے صرف بچوں اور ان کی ماؤں ہی کو مدعو کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"آپ نے بُرا تو نہیں مانا۔"

"کس بات کا؟"

"آپ کے میاں کو مدعو نہیں کر رہی۔"

"شُبنی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ جو مناسب بات ہے وہی تم کرتی ہو۔ بُرا ماننے کی کیا بات۔"

"شکریہ" اس نے کہا اور کارڈ میرے حوالے کر دیا۔

"میں تو ابھی تک تمہارے کوکب سے بھی نہیں ملی۔ ویسے نوفل نے بتایا تھا کہ کوکب اسی کی کلاس میں پڑھتا ہے۔"

"ایک ہفتہ امی کی وجہ سے اسے بھی اسکول سے چھٹی کرانا پڑی۔ ویسے میں اس کو ریگولرلی پڑھاتی ہوں۔ میرا بچہ خاصا ذہین ہے۔ میک اپ کر لیتا ہے۔"

"خوش قسمت ہیں۔ جو بچے آپ سے باقاعدگی سے پڑھتا ہے۔ یہ اپنے نوفل اور نبیل تو

میرے قابو میں ہی نہیں آتے۔ ابو ہی سے ڈرتے اور انہی سے پڑھتے ہیں۔"

اس نے میری طرف دُکھی دُکھی حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور بولی "خوش بخت تو آپ ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ شُبنی کے سامنے اپنے میاں یا بچوں کے باپ کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا میاں چونکہ دور ہے سال بھر بعد آتا ہے۔ اس لیے وہ اس کی کمی شدت سے محسوس کرتی ہے

وہ چند منٹ رُکی۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو نا کچھ دیر اور۔ آج تو میں فری ہوں۔"

"پھر آؤں گی۔ مجھے دو چار جگہ کارڈ دینے جانا ہے۔"

میں اس کے ساتھ باہر آگئی۔ شانو مونا کو لیے کھڑا تھا۔ گول مٹول سی مونا نے پھولا پھولا فراک پہنا ہوا تھا۔ شُبنی بڑی محبت سے اس پہ جھپٹی "اللہ کتنی پیاری بچی ہے آپ کی۔ اُف۔ نظر نہ لگ جائے اسے۔ مجھے بیٹیاں بہت پسند ہیں۔ کوکب کی دفعہ میری دلی خواہش تھی کہ بیٹی ہو۔"

"عمر پڑی ہے ابھی" میں نے ہنس کر کہا "بیٹا ہوا ہے بیٹی بھی آجائے گی۔"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ مونا کو پیار کر کے شانو کے حوالے کیا۔ اور خدا حافظ کہتے ہوئے اپنی گاڑی میں جا بیٹھی۔

پھر وہ خدا حافظ کہتے ہوئے اپنی گاڑی گیٹ سے نکال لے گئی۔ اس نے جاتے سمے مجھ پہ نگاہ ڈالی۔

جانے اس نگاہ میں اتنی اذیت اتنا کرب کیوں تھا۔

میرا دل مسلا گیا۔

اس رات میں نے سہیل سے شُبنی کا ذکر کیا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے بے جان سکوت کا بطور خاص ذکر کیا۔

"پتہ نہیں وہ سکھی ہے کہ دکھی" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

سہیل ہنس کر بولے: "شگفتہ صرف میاں کی موجودگی ہی دے سکتی ہے عورت کو محترمہ۔ آج میں بھی کہیں چلا جاؤں تو محترمہ بھی دکھی ہو جائیں گی۔"

"اللہ نہ کرے۔" میں نے کروٹ بدل کر سہیل کو کندھے سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ واقعی سنبی کا شوہر دور تھا سال میں ایک مرتبہ آکر چلا جاتا تھا۔ پیسہ ظاہر ہے بہت کماتا ہوگا۔

لیکن صرف پیسہ خوشیاں تو نہیں دے سکتا۔

مجھے سنبی سے دلی ہمدردی محسوس ہوئی۔ اور میں نے تہیہ کر لیا کہ اس سے ضرور پوچھوں گی وہ اپنے شوہر کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتی۔ پورا سال انتظار کے جان لیوا انتظار میں کیوں گزارتی ہے۔ ایک مہینے کی چھٹی تو پلک جھپکتے میں گزر جاتی ہوگی۔

اگلی شام میں بچوں کو تیار کرکے کوکب کا تحفہ لے کر سنبی کے ہاں گئی۔

سنبی کے گھر کے گیٹ میں داخل ہوتے ہی میری نگاہ اس کے لان پر پڑی۔ اتنا خوبصورت لان میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ سبزہ یوں تھا جیسے مخملیں فرش بچھا ہو۔ رنگا رنگ پھول پودے بڑی نفاست سے سجے تھے۔ بیلوں کی اک اپنی شان تھی۔ درخت اتنے اسٹائلش اور دیدہ زیب تھے کہ میں چند لمحے گم صم سی کھڑی نیچر کے اس حسن کو اپنے اندر جذب کرتی رہی۔ سنبی کے حسنِ ذوق سے میں بڑی متاثر ہوئی۔

بچے مجھے اندر جانے کے لیے کھینچ رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ پھولدار بیلوں کے چھجوں تلے سے ہوتی برآمدے میں آئی اور ڈرائینگ روم کی طرف بڑھی۔ جہاں کافی مہمان آئے بیٹھے تھے۔ ہلکی ہلکی موسیقی فضا میں گھل رہی تھی۔ لوگ باتوں میں مشغول تھے۔ صرف عورتیں اور بچے ہی تھے۔

ڈرائینگ روم اتنے سلیقے اور آرٹسٹک طریقے سے آراستہ تھا کہ ایک بار پھر میری نظریں اس کے حسن کو جذب کرنے کے لیے مچل اٹھیں۔ ڈرائینگ روم کی سج دھج تو سنبی کے ذوقِ نظر کی مرہونِ منت تھی ہی۔ لیکن قیمتی نادر اور نایاب اشیاء اس گھرانے کی امارت کا بھی اعلان کر رہی تھیں۔

سنبی کسی خاتون سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑی تو لپک کر آئی۔ تپاک سے گلے ملی۔ میرے

بچوں کو پیار کیا۔

آج وہ بیحد دلکش اور پُرکشش لگ رہی تھی۔ اس نے انتہائی خوبصورت اور قیمتی ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ نفیس سا زیور تھا۔ بال پشت پر کھلے چھوڑ رکھے تھے۔

"بہت حسین لگ رہی ہو۔" میں نے اس کے کان میں اونچی سرگوشی کی۔

"یعنی ہوں نہیں۔ لگ رہی ہوں۔" وہ ہنسی۔

"نہیں بھئی یہ بات نہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا آؤ بیٹھو۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑا۔

"اپنے کوکب سے تو ملاؤ۔ مجھے اور میرے بچوں کو۔ میں نے کہا۔

"آئیں۔ نوفل نیبل آئیں آپ بھی۔ وہ ہمیں لیے وسیع ڈرائینگ روم کے مشرقی حصے کی طرف لے گئی۔ جہاں پانچ سالہ پیارا سا بچہ اپنے ساتھیوں سے کھیل رہا تھا۔ میرے بچے ایک لمحہ سکڑے سہمے۔ کچھ اجنبیت محسوس کی۔ لیکن دوسرے لمحے وہ اپنے ہم عمر ساتھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

"میری امی سے تو آپ نہیں ملی نا۔" سنبی نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"آؤ ملاؤں۔" وہ میرا ہاتھ پکڑے دوسری طرف مڑی۔ جہاں خوبصورت صوفوں میں دھنسی ادھیڑ عمر عورتیں۔ بیٹھی گپ شپ لگا رہی تھیں۔

اس نے اک عمر بھاری بھر کم سفید قیمتی ریشمی لباس میں ملبوس عورت کے پاس لے جاتے ہوئے کہا: "امی یہ رابعہ ہیں۔ میری نئی دوست۔ آپ سے میں نے ذکر کیا تھا نا نئی نئی یہاں آئی ہیں۔"

میں نے قدرے جھجک کر انہیں سلام کیا۔ سنبی کی امی بہت بردبار اور باوقار سی خاتون تھیں۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے دعائیں دیں۔ احوال پرسی کی اور بتایا "سنبی تمہاری بہت تعریف کرتی تھی۔"

میں ہولے سے مسکرا دی۔

سنبی بولی۔ "بہت اچھی ہیں یہ۔"

"بس اب اتنا بھی نہ بناؤ۔ اچھی تو تم خود ہو۔"

وہ ہنس پڑی۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہنسنے کے باوجود اس کی آنکھوں میں وہی سکوت وہی بے جان کیفیت اور وہی جمود ہے۔ اس کی امی بھی سوگوار سی دکھائی دیں۔ ان کے چہرے پر شفقت تو تھی۔ لیکن سوگواری کی ایسی گہری چھاپ تھی جو کھلا اعلان تھی کہ خوشی کا سایہ اس کے چہرے پر نہیں پڑ رہا

مجھے شمی کی بات یاد آگئی۔ جو اس نے پہلی ملاقات میں اپنی امی کے متعلق کہی تھی۔ کہ ابّو کے مرنے کے بعد امی بکھر گئی ہیں۔

وہ واقعی بکھری ہوئی تھیں۔ آج کے خوبصورت اور خوش کن موقع پر بھی وہ دل گرفتہ تھیں۔ ایک اکلوتی بیٹی کے ایک اکلوتے بیٹے کی برتھ ڈے پر تو انہیں خوش ہونا چاہیے تھا۔ واقعی زندگی کے متعلق بعض لوگوں کا رویّہ اس قدر منفی ہوتا ہے کہ وہ اسی کی سیاہ عینک چڑھائے رہتے ہیں۔ خوشی کی کوئی رمق آنکھوں میں اترنے نہیں دیتے۔

برتھ ڈے بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ ڈائیننگ ہال کی بڑی سی میز پر کیک اور دوسرے لوازمات رکھے تھے۔ پانچ منزلہ کیک پر پانچ موم بتیاں لگی تھیں۔ جھنڈیاں، سنہری لڑیاں، غبارے پھول ہر طرف لٹک رہے تھے۔ کیک کاٹنے کی رسم ہوئی۔

کوکب نے موم بتیاں ایک ایک کرکے بجھائیں۔ اس کے دائیں ہاتھ شمی کھڑی تھی۔ بائیں ہاتھ کیک کے ساتھ عارف کی بڑی سی تصویر پڑی تھی۔ بتیاں بجھتے ہی تالیاں بجیں، ہیپی برتھ ڈے گایا گیا بچے پھولوں اور غباروں پر پل پڑے۔ بڑے نفیس برتنوں والی میز کی طرف بڑھے اور پلیٹیں اٹھا اٹھا چیزیں ان میں رکھ کر کھانے لگے۔ مہمان کافی تھے۔ اتنا بڑا کمرہ بھی تنگ محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے دونوں بچوں کو پلیٹوں میں کھانے پینے کی چیزیں ڈال کر ایک طرف کر دیا۔ خود کیک پیس لینے کو بڑھی تو میں نے دیکھا۔ شمی کے پیچھے کھڑی اس کی امی اپنی آنکھیں رومال سے پونچھ رہی تھیں۔

اس مبارک اور خوشی کے موقع پر آنسو!

مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔

شمی مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگی تھی۔ میں اس سے کچھ کہہ سن نہ سکی۔

شام کافی گہری ہوگئی تھی۔ جب میں بچوں کو لے کر واپس آئی۔

چند دن بھی نہ گزرے تھے وہ مجھے ایک اسٹور میں ملی۔ وہ کچھ چیزیں خرید رہی تھی۔ علیک سلیک ہوئی۔

وہ بولی: "آج میں نے واپسی پر آپ کے ہاں آنا تھا۔ اچھا ہوا آپ یہیں مل گئیں۔"

"خیریت ہے۔" میں نے پوچھا۔

"میری ویڈنگ اینورسری ہے۔ آپ کو مدعو کرنا تھا۔"

"ویڈنگ اینورسری؟" میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"کیوں۔ نہیں ہو سکتی کیا۔" اس نے مضحکہ خیز انداز میں سوال کیا۔ تو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے سیل مین کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"بھئی عارف سعودی عرب اور تم یہاں اینورسری مناؤ گی۔"

"اب اس میں کیا قصور کسی کا کہ اینورسری کی تاریخ اس ماہ کی چھبیس ہے۔ اور عارف نے اگلے ماہ کی انتیس کو آنا ہے۔" اس نے بے پرواہی سے کہا۔

"پھر کیا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک ماہ سے کیا فرق پڑتا ہے۔ عارف آجائیں تو منا لینا۔"

"یہی تو مسئلہ ہے۔" وہ بولی۔

"کیا؟"

"میں اینورسری اسی ڈیٹ پر مناتی ہوں۔ جس پر شادی ہوئی تھی۔"

میں چونکہ دکان میں کھڑی تھی۔ اس لیے بحث میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے اس کی یہ بات مجھے بہت عجیب لگی۔

"اچھا رابعہ۔" وہ اپنا سامان اٹھاتے ہوئے بولی۔ "چھبیس کی رات ڈنر ہمارے ساتھ کرنا ہوگا۔"

میں ہنس کر بولی۔ "میں تو اگلے ماہ کی انتیس کو تمہارے ہاں ڈنر کرنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں رابعہ نہیں۔ پلیز چھبیس کی رات ضرور آنا۔ اور پھر معذرت خواہ ہوں کہ تمہیں اکیلی ہی کو دعوت دے رہی ہوں۔"

"حالانکہ اینورسری عارف کے ہوتے ہوئے ہونی چاہیئے تھی۔ اور میرے ساتھ سہیل کو بھی ڈنر میں شریک ہونا چاہیئے تھا۔"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہی موت کے کھلے سکوت والی نگاہ مجھ پر ڈالی اور بائے کہتے ہوئے اسٹور سے نکل گئی۔

میں نے اس اینورسری کا ذکر سہیل سے کیا۔

"بھئی میں کیا جانوں عجیب و غریب شخصیت ہے تمہاری دوست کی۔"

"کتنی غلط بات ہے۔ اینورسری منانے کا فائدہ؟"

"بالکل!" سہیل نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "شوہر صاحب سعودی عرب بیگم صاحبہ یہاں اور سالگرہ منائی جارہی ہے دھوم دھڑکے سے۔"

"پاگل ہے بالکل۔ سنبی میں ذرا بھی عقل نہیں۔"

"چلو تمہیں کیا اور ہمیں کیا۔"

"لگتا ہے دولت بہت ہے اس کے پاس۔ آئے دن فنکشن کرتی ہے۔ برتھ ڈے تھوڑی شاندار کی تھی۔"

"اینورسری تو اس سے بھی شاندار ہوگی بیگم صاحبہ۔ آپ فنکشن کی فکر چھوڑیں تحفے کا سوچیں وہ تو لے جانا ہی پڑے گا۔"

"بالکل۔ وہ تو ہے۔"

"فنکشن بھی ہوگا۔ دعوت بھی اڑے گی۔ تحائف بھی دیے جائیں گے۔ پھر کتنے ظلم کی بات ہے۔ محترمہ وہاں ہوں گی اور ہم گھر پہ بچوں کی دیکھ بھال کر رہے ہوں گے۔" سہیل نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

"ٹھیک کہا آپ نے۔ لیکن مسئلہ تو یہی ہے۔ عارف صاحب یہاں ہوتے تو آپ بھی مدعو

ہوتے۔ اکیلی عورت تو مردوں کو اس فنکشن میں مدعو نہیں کر سکتی نا۔"

اس رات ہم دونوں کافی دیر تک سنبی ہی کی باتیں کرتے رہے اس کے خوبصورت آراستہ پیراستہ گھر سے کہ اس کی حسین موت کے کھلے سکوت والی آنکھوں تک کا تذکرہ کیا۔ اس کی باوقار باوقار لیکن سوگوار امی کی باتیں کیں۔ سوگوار امی جو اکلوتے نواسے کی برتھ ڈے کے خوشی کے موقع پر بھی چپکے چپکے آنسو پونچھے جارہی تھیں۔

اتفاق ہی کی بات کہ چھبیس تاریخ کی شام میرے نندوئی کراچی سے آگئے۔ مجھے ڈنر میں شریک ہونا تھا۔ لیکن ان کے آجانے سے مجھے اپنا پروگرام مختصر کرنا پڑا۔

سنبی نے تو سات بجے کا دعوت نامہ دیا تھا۔ اور یہ محفل رات گئے تک جاری رہنا تھی۔ سنبی کی ایک دو سہیلیاں ہارمونیم کے ساتھ گانا بہت اچھی گاتی تھیں۔ سنبی نے مجھے بطور خاص کہا تھا "ڈنر تو خیر ہوگا ہی۔ گانے کی محفل خوب جمے گی۔"

گانا میری بھی کمزوری تھی۔ میں محفل میں بیٹھ کر گانا سننے کا تصور ہی میں لطف لے رہی تھی۔ لیکن پروگرام بدلنا پڑا۔ حسین بھائی ایک عرصے کے بعد آئے تھے اور صبح انہوں نے پنڈی چلے جانا تھا۔ اس لیے میں صرف سنبی کو مبارکباد اور تحفہ دینے کے لیے ہی تھوڑی دیر کے لیے گئی۔

کینڈل ڈنر بڑا پر تکلف اور شاندار تھا۔ کچھ زیادہ خواتین نہیں تھیں لیکن جو تھیں خاصی ماڈ اور امیر کبیر تھیں۔

سنبی آج دلہن کی طرح سجی بنی تھی۔ پھولدار خوشبو کی بھاری ساڑھی پہنی تھی۔ بھاری بھاری زیور زیب تن تھے۔ بالوں کا خوبصورت جوڑا بنا تھا جس کے گرد پھولوں کی کلیوں کے مہکتے ہار لپٹے تھے۔ میک اپ بھی بہت خوبصورت اور گہرا تھا۔

میں نے اسے تحفہ تھمایا اور مبارکباد دیتے ہوئے بولی۔ "سنبی میں تمہاری اس حسین محفل میں شرکت نہیں کر سکتی۔"

"کیوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ میری کلائی پکڑ کر بولی۔ اس کی آنکھوں کی بے جان ویرانی

اور گہری ہوگئی

اس ویرانی کو دیکھ کر جی چاہا کہہ دوں ۔ ایسے بھی کیا اصول کہ اسی تاریخ کو اینورسری منانا تھی تم جتنا مس کر رہی ہونا عارف کو وہ تمہاری ان اداس اور بے جان ویران آنکھوں سے ظاہر ہو رہا ہے۔

لیکن میں نے یہ بات نہیں کہی ۔ اور واپسی کی اجازت چاہی۔

"رابعہ نہیں ۔ تم نہیں جاؤ گی ۔"

"پگلی ۔ میرا جی تو بہت کر رہا ہے ۔ لیکن مہمان آگئے ہیں ۔ مہمان بھی سسرالی ۔ خوامخواہ باتیں بنیں گی ۔ حسین بھائی اچانک ہی آگئے ہیں ۔ نہ آتے تو میں رات بھر تمہارے پاس رہتی ۔" پھر میں نے ہنس کر کہا "آج اتنی حسین لگ رہی ہو ۔ عارف ہوتے تو ۔"

میں نے ہنستے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی ۔ اس کی آنکھوں کا سکوت لمحہ بھر کو درہم برہم ہوا ۔ لیکن وہ مسکرا دی ۔ مجھے تو لگا تھا ۔ پھک سے رو دے گی ۔ لیکن وہ مسکرانے لگی تھی ۔

میں نے اس سے کلائی چھڑائی ۔ جی تو واقعی نہیں کر رہا تھا کہ یہ دعوت نہ اڑاؤں اور محفل موسیقی میں شرکت نہ کروں ۔ لیکن کیا کرتی ۔ مجبوری تھی ۔ واپس لوٹ آئی ۔

آج ان عورتوں میں مجھے سبنی کی امی نظر نہیں آئیں ۔ شاید وہ کسی اور کمرے میں تھیں ۔

اس رات کے بعد میں تقریباً مہینہ بھر سُنبی سے نہ مل سکی ۔ اگلے ہی ہفتے مجھے امی کی بیماری کی وجہ سے ان کے ہاں جانا پڑا ۔ دو ایک دفعہ گھر بچوں کو دیکھنے تو آئی ۔ لیکن سنبی کے ہاں جانے کا وقت نہ ملا ۔

اور

وہ

انتیس کی شام تھی ۔ میں بازار سے واپس لوٹ رہی تھی ۔ سہیل ڈرائیو کر رہے تھے ۔ اور میں اُن کے ساتھ بیٹھی تھی ۔ اپنی اسٹریٹ میں داخل ہونے کو تھے کہ سامنے سے سنبی کی گاڑی آگئی ۔

"ذرا روکئے گا ۔" میں نے سہیل سے کہا ۔

"کیوں ؟" وہ بولے ۔

"سنبل کی گاڑی ہے سامنے ۔ بڑے دن ہوئے اسے دیکھا نہیں ۔ ذرا علیک سلیک ہو جائے ۔"

سہیل نے گاڑی روک دی ۔ سنبل بھی مجھے دیکھ چکی تھی ۔ اس نے گاڑی کے ساتھ گاڑی کھڑی کرتے ہوئے بڑے تپاک سے مجھے پکارا ۔ سہیل بھی آج اس سے ملے ۔

"اتنے دن کہاں غائب رہیں ؟" اس نے پوچھا ۔

"امی کے ہاں تھی ۔ بہت بیمار تھیں وہ ۔ خدا کا شکر ہے اب ٹھیک ہیں ۔"

"خدا انہیں صحت دے ۔ میں دو تین دفعہ آپ کے ہاں آئی ۔"

"ہاں شیداں نے بتایا تھا ۔"

"اور سب ٹھیک ٹھاک ۔"

"بالکل ۔"

اس نے گھڑی دیکھی ۔ میں نے پوچھا "کہاں جا رہی ہو ؟"

"ائیر پورٹ ۔"

"کوئی آ . . ."

"یاد نہیں آج انتیس تاریخ ہے" ۔ وہ بڑے دلفریب انداز میں مسکرائی ۔

"آج عارف آ رہے ہیں ۔"

"اوہ ۔ واہ ۔ مبارک ہو بھئی ۔ انہیں لینے جا رہی ہو ۔"

"ہاں" اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا ۔

"جاؤ بھئی جاؤ ۔ لیٹ نہ ہو جانا ۔" میں نے کہا ۔

"اچھا خدا حافظ ۔" اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔

"عارف آئیں ۔ تو کے کر آنا ہمارے ہاں ۔" میں نے اس کے گاڑی نکالتے نکالتے کہا ۔

"ضرور۔ ضرور"۔ وہ خوشدلی سے بولی: "سہیل بھائی سے ملیں گے وہ"

"ضرور"۔ سہیل نے کہا۔ پھر خدا حافظ کا تبادلہ ہوا۔ وہ آگے نکل گئی۔ ہم اسٹریٹ میں آگئے۔

"کیسی ہے سنبی؟" میں نے سہیل سے پوچھا۔ سنبی اس وقت کے یے آسمانی لباس میں تھی۔ ہلکا ہلکا میک اپ کیا ہوا تھا۔ بہت ہی اچھی لگ رہی تھی۔

"اچھی ہے"۔ سہیل نے کہا "ہاں اس کی آنکھیں"

"کیسی ہیں"۔ میں نے بے صبری سے کہا شاید لاشعوری طور پر میں نہیں چاہتی تھی کہ سہیل سنبی کی آنکھوں کی تعریف کریں۔

وہ بولے "یوں لگتا ہے دکھ اور درد کو گوندھ کر اس کی آنکھیں بنائی گئی ہیں"۔ میں ہنس پڑی

"پتہ نہیں کیوں" میں نے سر ہلایا: "واقعی اس کی آنکھوں میں دکھ جم گیا ہوا لگتا ہے حالانکہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے"

"کچھ نہ کچھ تو خرابی ہوگی۔ شوہر کا سال بھر انتظار کرتی رہتی ہے۔ یہ کوئی خوشگوار تجربہ ہے"

"جانے اس کے ساتھ کیوں نہیں جاتی"

"ہو سکتا ہے یہیں کوئی گڑبڑ ہو"

میں نے کہا: "بظاہر تو نہیں لگتی کوئی گڑبڑ۔ سب ٹھیک ٹھاک ہی لگتا ہے۔ دیکھو نا۔ اسے لینے جا رہی ہے ائیرپورٹ"

"ہوں"

میں ہنس پڑی۔ سہیل کی طرف دیکھا۔ سہیل بھی مسکرائے اور بولے "دیکھو نا تمہاری آنکھیں ماشاءاللہ کیسی چمک رہی ہیں ہنس رہی ہیں۔ ہم جو پاس ہیں تمہارے جن کے شوہر پاس نہ ہوں۔ ان کی آنکھوں میں درد و کرب ہی بسا کرتا ہے"

ہم باتیں کرتے گھر آگئے۔

دوسری شام مجھے سنبی کا انتظار تھا۔ میں نے سہیل کو بھی کہیں جانے نہ دیا۔ خیال تھا۔

سنبی عارف کے ساتھ ضرور آئے گی۔

لیکن وہ نہیں آئی۔

تیسرے دن بھی نہیں آئی۔ میں نے یہی سمجھا کہ سال بھر کی جدائی کاٹی ہے۔ اب وہ ملن کی گھڑیاں کہاں ضائع کرنے کے متحمل ہوں گے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اپنے عزیزوں کو ملنے چلے جاتے ہوں۔

لیکن جب سات آٹھ دن گزرنے پر بھی وہ نہ آئی۔ تو میں نے سہیل سے کہا۔

"سنبل اور عارف ہمارے ہاں آئے نہیں۔ شاید سنبی چاہتی ہے مدعو کریں"

"بات ویسے ہے تو ٹھیک"۔ سہیل نے کہا۔ "گو پہلے انہیں ہیلو ہیلو کرنے آنا ہی چاہیئے تھا پھر بھی۔ تمہیں ان دونوں کو مدعو ضرور کرنا چاہیئے"

"میں کل ہی دعوت دے آؤں گی"

"کل رات کا کھانا کرلو۔ کچھ اور لوگوں کو بھی بلا لیں گے۔ محلے کے دو تین لوگ بھی آجائیں گے اچھی گیدرنگ ہو جائے گی"

"بالکل ٹھیک۔ لیکن کل رات نہیں پرسوں رات اتنے آدمیوں کا کھانا بنانا پڑے گا۔ کل سارا دن کھانا بناتے چیزیں لاتے ہی گزرے گا"

"ٹھیک ہے"۔ سہیل نے کہا۔

میں اور سہیل، عارف اور سنبی کے اعزاز میں دیئے جانے والے ڈنر کا مینو اور لوگوں کی فہرست بنانے لگے۔

کوئی بارہ چودہ لوگ بنے۔

میں نے پُرتکلف کھانے کا مینو بنایا۔ ویسے بھی سنبی کے ہاں برتھ ڈے پارٹی اور کینڈل ڈنر کی آن بان دیکھ چکی تھی۔ کچھ نہ کچھ برابری کے لیے مجھے بھی کرنا تھا۔

دوسرے دن کام سے فارغ ہو کر دس ساڑھے دس بجے تیار ہو کر میں سنبی کے ہاں گئی۔

بلبے چوڑے شکوے کا پروگرام تھا۔اس کے بعد کھانے کی دعوت دینا تھی۔

اس کے خوبصورت لان پر تحسین بھری نگاہیں ڈالتے میں آگے بڑھ گئی۔اور برآمدے میں آ گئی۔جس پر پھولوں سے لدی بیلوں کے گچھے جھکے ہوئے تھے۔

لاؤنج کی شیشے کی دیوار کے پردے سمٹے ہوئے تھے۔اور ایک صوفے پر اس کی امی بیٹھی تھیں۔

ان کی لاؤنج بھی ڈرائینگ روم ہی کی طرح سجی تھی۔منی پلانٹ، ربڑ پلانٹ اور کیکٹس کی کئی اقسام کے پودے لاؤنج میں تازگی کا احساس بھر رہے تھے۔

"آؤ بیٹی!" میرے سلام کے جواب میں انہوں نے بڑی شفقت سے کہا۔ان کا خوبصورت چہرہ آج کچھ زیادہ ہی سوگوار لگا مجھے۔

رسمی سی احوال پرسی کے بعد میں نے سبنی پر اپنی دوستی کا پورا حق جتاتے ہوئے مصنوعی غصے سے کہا "کہاں ہے سبنی۔اتنے دن سے انتظار کر رہی ہوں کہ عارف کو لے کر آئے گی۔ ہمارے ہاں۔لیکن ..."

"عارف ..." اس کی امی نے اک گہری آہ بھری۔

"ہے کہاں سبنی کی بچی" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہوسپٹل۔" وہ دکھ سے جیسے کراہیں۔

"کیا؟" میں غصہ وصہ بھول گئی۔جلدی سے بولی "خیریت تو ہے"

وہ گہری ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے بولیں "ان دنوں۔ہر سال وہ چند دن ہوسپٹل میں ایڈمٹ ہوتی ہے۔"

"میں۔میں کچھ سمجھی نہیں۔" میں نے ان کی طرف تجسس سے دیکھا۔

وہ دکھی آواز میں بولیں "سبنی نے تمہیں کچھ سمجھنے کا موقع ہی کب دیا ہوگا۔میری بدنصیب بچی۔"

میں صوفے سے اٹھ کر ان کے پہلو میں بڑے صوفے پر آ بیٹھی۔ان کا بازو پکڑ کر پریشانی

کے عالم میں بولی "آنٹی آپ کیا کہہ رہی ہیں۔عارف ..."

"عارف اس دنیا میں کہاں ہے بیٹی۔"

مجھے اک جھٹکا سا لگا۔گھبرا کر بولی "کیا۔کیا کوئی حادثہ ہو گیا ہے کیا؟"

"آج نہیں چار سال پہلے ہوا تھا۔" انہوں نے اک گہری سانس چھوڑی۔

"عارف نے انتیس کو یہاں آنا تھا۔لیکن ریاض میں ائیرپورٹ پر پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی کے حادثے میں ختم ہو گیا تھا۔"

"لیکن لیکن۔" میرے منہ سے ڈھنگ کا کوئی لفظ نہ نکل سکا۔اس کی امی نے کلیجے پہ ہاتھ رکھ لیا۔ان کی آنکھوں کے گوشے گیلے ہو گئے۔دکھ سے ڈوبتی آواز میں بولیں۔

"بھلاوے ہی ہیں بیٹی۔سبنی ان بھلاووں کے سہارے ہی جی رہی ہے۔عارف بہت پیارا انسان تھا۔دونوں میں بچپن کی دوستی اور پیار تھا۔کوکب کی پیدائش کے لیے سبنی پاکستان آئی تھی۔کچھ بیمار پڑ گئی۔جس کی وجہ سے وہاں جا نہ سکی۔پورا ایک سال اس نے جس طرح انتظار میں کاٹا۔تمہیں کیا بتاؤں بیٹی۔انتیس کی شام اس نے ایک ماہ کی چھٹی پہ یہاں آنا تھا۔اور سبنی کو ساتھ لے جانا تھا۔"

وہ چند لمحے رکیں۔میں آنکھیں پوری کی پوری کھولے صرف انہیں تکے گئی۔

"سبنی ائیرپورٹ اسے لینے گئی۔لیکن وہ اس دنیا میں ہوتا تو آتا۔چند دن بعد اس کی لاش آ گئی۔" وہ آنکھیں رومال سے صاف کرتے ہوئے بولیں "یہ بات نہیں کہ سبنی نے اس کی موت کو تسلیم نہیں کیا۔لاش اس کے سامنے آئی۔کفن دفن سب کچھ اس نے آنکھوں سے دیکھا۔غم سے نڈھال بھی ہوئی۔غش پر غش آئے۔بیمار بھی پڑ گئی۔"

میں نے سر ہتھیلی پر ٹکا لیا۔مجھ میں تو کوئی سوال کرنے کی ہمت ہی نہ رہی تھی۔

وہ خود ہی بولیں "میری بدنصیب بچی نے اک انوکھا ہی فلسفہ گھڑ لیا۔اپنے ذہن میں یہ بات بٹھا لی کہ عارف سعودی عرب ہی میں ہے اور اسے اس کا انتظار کرنا ہے۔اسی طرح جس

طرح سال بھر کیا ہے۔ سارا سال وہ پل پل انتظار کی کوفت و لذت سے دوچار ہوتے گزارتی ہے یہ سوچ آنے ہی نہیں دیتی کہ وہ اس دنیا میں نہیں۔ اسی لیے زندگی سے پوری طرح نبھاہ کرتی ہے۔ ہر کام میں حصّہ لیتی ہے۔ گھر کی دیکھ بھال بچے کی تعلیم و تربیت اس کی برتھ ڈے اور اپنی شادی کی سالگرہ دھوم دھام سے مناتی ہے۔ میرا کلیجہ کٹتا ہے بیٹی۔ لیکن کیا کروں۔ اس کا ساتھ دیئے جاتی ہوں۔"

وہ سانس لینے کو رکیں۔ پھر بولیں: "ہر سال انتیس کی شام کو وہ عارف کو ائیر پورٹ لینے جاتی ہے۔ اور اکیلی واپس لوٹ آتی ہے۔ اس دن اس کے صبر و ضبط کے بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ سال بھر دل کو دیے جانے والے بہلاؤں کا حوصلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ بالکل بکھر جاتی ہے۔ اس طرح کہ اسے پھر سے مجتمع کرنے کے لیے ہوسپٹل میں ایڈمٹ کروا کے ڈاکٹروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔"

وہ بول رہی تھیں اور میری ہتھیلیاں آنسوؤں سے بھیگی جا رہی تھیں۔ میں سسکیوں میں رونے لگی۔ تو انہوں نے میری پشت پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "تمہیں اس کی روداد سن کر یقیناً دکھ ہوا ہے۔ لیکن خدا کی یہی رضا ہے۔ سنبی چند دنوں تک گھر آ جائے گی۔ ٹھیک ہو کر پھر سے عارف کے انتظار میں لمحوں کو دھکیلنے کے لیے ان بہلاووں میں لگ جائے گی۔ بالکل نارمل ہو کر۔ سارا دکھ ساری کوفت آنکھوں میں جو جمع کر لیتی ہے۔"

وہ جانے کیا کہتی رہیں۔ میں آنسو دوپٹے کے آنچل سے پونچھتے ہوئے سنبی کی آنکھوں میں موت کے سکوت کے گھلاؤ کا راز جان کر دکھی ہونے لگی۔

رات میں جب یہ سارا سانحہ سہیل کے گوش گزار کر رہی تھی تو بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ سہیل بھی سنبی کے عجیب و غریب فلسفے سے متاثر ہوئے تھے۔

اک رنجیدہ سی سانس لیتے ہوئے بولے۔

"کیا کیا فریب دل کو دیے اضطراب میں' والی بات ہے۔"

"عجیب و غریب کردار ہے۔" میں نے ان سے کہا۔

"عجیب و غریب۔ لیکن واجب الاحترام اور انتہائی عظیم۔" سہیل نے پورے خلوص سے کہا۔ اور میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

یہ سنبی کی شخصیت اور کردار کو خراج عقیدت تھا۔

چاہتیں کیسی

حُسن کی رعنائی اور دلکشی کو جانچنا یا پرکھنا محسوسات کی ڈوری سے بندھا ہوتا ہے۔ فضا میں کتنی ہی رنگینی ہو۔ ماحول میں کیسی ہی خوبصورتیاں رچی بسی ہوں۔ اور گرد و پیش میں کتنا ہی فسوں پھیلا ہو۔ انسان ان سب سے اس وقت تک متاثر نہیں ہوتا۔ جس وقت تک اس کے اندر انہیں جانچنے پرکھنے اور محسوس کرنے کی امنگوں کا پھیلاؤ نہ ہو۔ شوق اور زندہ دلی نہ ہو۔ من میں سکون ہو تو ہر چیز ہنستی مسکراتی لگتی ہے۔ خوب صورت شاداب اور رعنائیوں سے بھرپور دکھائی دیتی ہے۔ فضا ماحول اور گرد و پیش کا نکھار آپوں آپ متاثر کرنے لگتا ہے۔ جی اس رعنائی اور شادابی میں ڈوب ڈوب جانے کو مچلتا ہے۔ اس نکھرے حُسن کو من میں سمو لینے اور احساس کی قید میں جکڑ لینے کو من چاہتا ہے لیکن جو طبیعت میں الجھاؤ ہو۔ ذہن بے چین ہو۔ من تفکرات کے گھیرے میں ہو۔ تو نہ فضا کا حُسن متاثر کرتا ہے۔ نہ ہی ماحول کی خوب صورتیاں دکھائی دیتی ہیں۔ جی ان سے اُوبھ اُوبھ جاتا ہے۔

اس رات بھی موسم بے حد حسین تھا۔ بارش اب تھم چکی تھی۔ آسمان دھل کر نکھر آیا تھا۔ بدلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر آوارہ پھر رہی تھیں۔ سینۂ چرخ پر چاند ستاروں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ کبھی سمٹ کر غائب ہو جاتیں۔ تو دھلی ہوئی چاندنی ہر سُو پھیل جاتی اور کبھی پھیل جاتی تو ستاروں کی چمکتی آنکھیں ردا۔۔۔ اوڑھ لیتیں۔

ہواؤں کا زور بارش ختم ہونے کے ساتھ ٹوٹ چکا تھا اور اب ہولے ہولے دھیرے دھیرے پھوار کا لطیف بوجھ.. اٹھائے چل رہی تھیں. پھولوں کی مہک اس پھوار میں رچی بسی تھی. جب یہ مترنم ہوائیں سرسراتے ہوئے کھڑکی کے پردوں سے چھیڑ چھاڑ کرتیں، تو پھوار کا ہلکا سا ریلا فضا میں پھولوں کی.... مہک بکھیر دیتا. کمرے کی فضا مترنم اور متبسم ہو اٹھتی.

لیکن

موسم کی خوب صورتی اور حسن کا اس وقت زوبی کو احساس ہو رہا تھا نہ شہباز خان کو. زوبی نرم وگداز بیڈ پہ چت پڑی تھی. آراستہ پیراستہ خوابگاہ میں گھٹن کا احساس ہو رہا تھا. روشنی اندھی لگ رہی تھی. ان گنت سوچوں نے ذہن کو جکڑا ہوا تھا. لمحوں لمحوں کے وقفوں سے اس کے نازک سے وجود کو جھٹکے لگ رہے تھے. اندر ہی اندر جیسے ہچکیاں ٹوٹ رہی ہوں. سسکیاں دم توڑ رہی ہوں اس کا پرکشش خوب صورت چہرہ پریشانی اور اداسی سے دھندلا رہا تھا. وہ کھلی آنکھوں سے ٹوٹتے بکھرتے اور اجڑتے سپنے دیکھ رہی تھی. کچھ یہی حال شہباز کا بھی تھا.

وہ خوابگاہ میں ٹہل رہا تھا. کبھی ٹہلتے ٹہلتے رک جاتا... سوچنے لگتا. سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا چلا جا رہا تھا. وہ گرانڈیل، خوب صورت اور باوقار سا نوجوان حالات کے سامنے جھک جانے کی کیفیت سے دوچار دکھائی دے رہا تھا.

اور اس کی اسی کیفیت سے زوبی کے وجود کے اندر موت کی کپکپاہٹ اتر رہی تھی. وہ بے جان سے مجسمے کی طرح بیڈ میں بے حس و حرکت پڑی تھی. اس کی آنکھیں متورم تھیں. لیکن اب ان میں آنسو نہیں تھے، سارا پانی بہہ گیا تھا.

دونوں کے دل وقت کے ساتھ ساتھ جیسے دھڑکنا بھولتے جا رہے تھے. گاہے گاہے دونوں کی نگاہیں وال کلاک کی طرف اٹھتیں اور پھر سائیڈ ٹیبل پہ رکھے فون پہ جا اٹکتیں.

خان بابا نے شہباز گل کو دو دن کی مہلت سوچنے کو دی تھی.

اور آج رات دس بجے انھوں نے فون پر اس کا آخری فیصلہ سننا تھا.

یہ دو دن کیسے گزرے تھے. زوبی اور شہباز ہی جانتے تھے.

اور اب گھڑی کی سوئیاں دس بجے کی طرف سرک رہی تھیں. فیصلہ کن لمحہ ہولے ہولے قریب آ رہا تھا. اور دونوں کے دل کبھی تھم تھم جاتے اور کبھی گھڑی کی ٹک ٹک سے ہم آہنگ ہو کر دھڑکنے لگتے.

ان کی شادی کو ابھی صرف تین ماہ ہوئے تھے. جنوں خیز خوشیوں اور بہار آفریں مسرتوں کے دن جیسے پلک جھپکتے گزر گئے تھے. دو ماہ تو دونوں گھومتے پھرتے ہی رہے تھے. ماہ عسل کی دلفریبیوں میں جکڑے آزاد پرندوں کی طرح کبھی کاغان، کبھی سوات اور کبھی مری کے مرغزاروں میں اڑتے پھرے تھے. دس پندرہ دن زوبی کے ممی، پپا کے خوب صورت گھر میں گزارے تھے. دوستوں رشتہ داروں کی دعوتیں ہی ختم نہ ہو پائی تھیں.

مہینہ بھر پہلے ہی دونوں اس گھر میں آئے تھے. شہباز خان نے تین بیڈ روم کا یہ خوبصورت بنگلہ کرائے پہ لیا تھا اور زوبی کی باذوق ممی نے ان کی عدم موجودگی میں اسے نفاست سے سجایا تھا. وہ اس گھر میں آئے تھے تو گھر گرہستی کی ہر چیز موجود تھی. کچن خانساماں کے سپرد تھا. گھر کی دیکھ بھال کے لیے معمر نوکرانی موجود تھی. ہر کمرہ آراستہ پیراستہ تھا. نفیس ذوق کی علامت تھا.

دونوں اپنے نئے گھر میں آ کر بہت خوش تھے.

لیکن یہ خوشیاں دیرپا نہ تھیں.

دو دن پہلے خان بابا کا فون آیا تھا. اور یہ خوشیاں اس فون سے بے موت ہی مر گئی تھیں. دو دن بڑے کرب اور بڑی اذیت میں گزرے تھے. زوبی نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا. شہباز گل بھی پہلے بھڑکا تھا. زوبی کو بازوؤں میں بھر بھر کر تسلیاں دی تھیں. اٹوٹ وعدوں کا یقین دلایا تھا. لیکن جوں جوں سوچا تھا. مایوسی اور پریشانی نے گھیرا تھا. وہ جانتا تھا. اچھی طرح جانتا تھا کہ دو دن کی مہلت کا کوئی مطلب نہیں. کوئی

فائدہ نہیں۔ کوئی اہمیت نہیں۔

دو دن بعد بابا وہی فیصلہ سنا چاہیں گے۔ جو انہوں نے کیا ہے۔

شہباز خان نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے اک نگاہ زروبی پر ڈالی۔ جلتا ہوا سگریٹ جھک کر ایش ٹرے میں مسلا۔ دونوں ہاتھ۔۔۔ پیچھے باندھ کر سیدھے کھڑے ہو کر کچھ کہنے کو لب کھولنا چاہے۔ لیکن کوئی موزوں لفظ ہی نہ ملا جیسے۔ ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔

وہ صوفے پر بے جان سا ہو کر گر گیا۔ کہنی صوفے کے بازو پر ٹکاتے ہوئے سر ہاتھ پر گرا دیا۔ سوچوں کا بہاؤ اسے بہت پیچھے لے گیا۔

اس کا تعلق سرحد کے ایک معتبر اور معزز خاندان سے تھا۔ چارسدہ کے اک نواحی گاؤں میں اس کے دادا خوشحال خان کی بہت بڑی حویلی تھی۔ وہ اپنے علاقے کے مانے ہوئے زمیں تھے۔ بے شمار سونا اگلتی زمینیں تھیں باغات تھے، مکانات تھے، حجرے تھے ان کا دبدبہ اور رعب اتنا تھا کہ کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ علاقے کے چھوٹے بڑے تنازعات ان کے حجرے میں ہی طے ہوتے، جرگے وہیں بیٹھتے۔ ان کا فیصلہ حرفِ آخر تسلیم کیا جاتا۔ کبھی کسی نے ان کے سامنے ان کے فیصلے میں ردّ و بدل کرنے کی جرأت نہیں کی۔ ایک دفعہ ایک سرپھرے چھوٹے زمیندار نے ان کے فیصلے پر معمولی سی تنقید کی تھی۔ تو تلواریں کھنچے میانوں سے باہر آ گئے تھے۔ خوشحال خان کے دلیروں اور جانثاروں نے صرف مخالفت کرنے والوں ہی کو نہیں اس کے سارے خاندان کو گولیوں کی بوچھاڑیں موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اس پہلے اور آخری واقعے نے خوشحال خان کے خاندان کی ہیبت اور دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بٹھا دیا تھا۔

خوشحال خان اپنے علاقے اور اپنی حویلی پر اک بے تاج بادشاہ کی طرح حکمرانی کرتے تھے۔ ان کے دونوں بیٹے دلبر اور صبور اور ان کی بیوی آغا بی بی سبھی انھیں اپنا حکمراں تسلیم کرتے تھے۔ آغا بی بی کو تو کبھی ان کی کسی بات سے اختلاف ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ جو کہتے

آغا بی بی سرِ تسلیم خم کر دیتی۔ اسی لیے وہ اس بے تاج بادشاہ کی طرح تھی گھر کی لونڈیاں باندیاں، نوکر، عزیز رشتے دار مزارع سبھی خوشحال خان کی اس چہیتی بیگم کی بھی اسی طرح عزت کرتے تھے۔ وہ بھی تو خان ہی کی زبان بولتی تھیں نا۔ گھر کے ماحول اور فضا کا اثر بھی تھا اور آغا بی بی کی تربیت بھی تھی۔ دلبر خان اور صبور خان بھی باپ ہی کے نقشِ قدم پہ چل رہے تھے۔ بات ایک بار زبان سے نکل جاتی تو پتھر پر لکیر ہو جاتی۔ فیصلہ ایک دفعہ ہو جاتا تو بدلنے کی کسی کو مجال نہ ہوتی۔ دلبر میں تو باپ کی ساری سخت گیری سمائی ہوئی تھی۔ صبور خان کا اپنا انداز تھا۔ لیکن وہ بھی باپ اور بھائی سے مختلف نہ تھا۔ اس نے پشاور رہ کر تعلیم پائی تھی جب کہ دلبر خان نے گاؤں ہی میں تھوڑا بہت پڑھ لکھ لیا تھا۔ تعلیم نے صبور خان کے طور و اطوار نہیں بدلے تھے۔ ہاں شہر کی فضا اسے اچھی لگتی تھی۔ اور شادی کے دو سال بعد وہ اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ پشاور آ گیا تھا۔ یہاں اس نے کاروبار شروع کیا تھا۔ جسے اپنی محنت اور اصول پرستی سے بہت بڑھا لیا تھا۔ قسمت بھی مہربان تھی مٹی میں ہاتھ ڈالتا تو سونا ہو جانے والی بات تھی۔

شہری زندگی اپنا کر بھی اس کا ذہن وہی تھا۔ سخت گیری اپنا فیصلہ مسلط کرنے کی خو۔ رعب دبدبہ سب وہی تھا۔ وہ دوستوں کا بہترین دوست اور دشمنوں کا بدترین دشمن تھا۔ خوبیوں اور خامیوں سمیت وہ قول کا سچا اور زبان کا پکا تھا۔ وعدہ کرتا تو پابندی لازمی تھی۔ وعدہ ایفا کرنے کے لیے اسے آگ و خون کے دریا سے بھی گزرنا پڑتا تو گزر جایا کرتا تھا۔ اس کے چاک و چوبند گن مین اس کی ایما اس کی آنکھوں ہی میں پڑھ لیتے تھے۔

صبور خان نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ اسے پسند تھا۔ اس لیے گھریلو ماحول وہی تھا۔ اس کی بیوی تمکینے اپنی ساس آغا بی بی کے نقشِ قدم پر چلتی تھی۔ صبور خان کے ہر حکم اور فیصلے کی تابع تھی۔ اس نے کبھی بھول کر بھی صبور خان کے کسی حکم کو نہیں ٹالا تھا۔ گاؤں میں اس کا رابطہ اسی طرح تھا اور شوہر کے حکموں کی تعمیل کے ساتھ ساتھ سسر ساس

اور جیٹھ جٹھانی کے سامنے بھی دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ خوشحال خان یا دلبر خان کی
سوچ کے ساتھ ساتھ ان کی سوچ بھی چلتی تھی۔

دونوں بھائی الگ الگ ماحول میں رہ رہے تھے۔ لیکن رابطے کی ڈوریاں کٹی نہیں تھیں۔
کچھ بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ سوائے اس کے کہ انداز رہائش بدلا تھا۔ صبور خان چار کنال کی
کوٹھی میں رہتا تھا۔ جس کی آرائش و زیبائش مشرقی اور مغربی دونوں طریق سے ہوئی تھی یہاں
ڈرائنگ روم تھا۔ ڈائننگ روم تھا اور الگ الگ بیڈ روم تھے۔ کھانا ٹیبل پر کھایا جاتا تھا
اور نشست صوفوں اور کرسیوں پر ہوتی تھی۔ جب کہ گاؤں میں بڑی سی حویلی کے دالان تھے
جن کے فرش سرخ قالینوں سے ڈھکے تھے۔ کچی دیواروں کی چار دیواری میں پکے کچے بے شمار
کمرے تھے۔ حجرہ بہت کشادہ اور بہت بڑا تھا۔ جس میں رنگین موٹے موٹے پایوں والے بان
کے پلنگ پڑے ہوتے تھے۔ دیواروں پر طبنچے ٹنگے تھے۔ جانوروں کی کھالیں تھیں بیسیوں کام
کرنے والے تھے۔ چلمیں تھیں۔ چائے پانی کے لیے برتن تھے۔ فرش موٹے موٹے قالینوں
سے ڈھکے ہوتے تھے۔ حجرہ اپنی تمام تر روایات کے ساتھ زندہ و آباد تھا۔

شہباز ان دنوں پانچ چھ سال کا تھا۔ اس سے چھوٹی شاہینہ کی عمر تقریباً ساڑھے
تین سال تھی۔ دونوں بہن بھائیوں کا آپس میں بے حد پیار تھا۔ صبور خان اور تمکینے ان
بچوں کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔

اس رات دونوں بچے کھیل رہے تھے۔ تمکینے نے کھانا میز پہ لگوایا تھا۔ اور صبور خان
کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں گئے تھے۔

"اے شہباز خانا!" تمکینے نے بیٹے کو پکارا۔

"کیا ہے بی بی جان" شہباز نے اپنے کھلونے شاہینہ کے سپرد کرتے ہوئے
جواب دیا۔

"بچے جاؤ خان بابا کو بلا لاؤ۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"میں بلاؤں گی خان بابا کو" شاہینہ کھلونے پرے پھینکتے ہوئے اٹھی۔

"میں بلاؤں گا" شہباز دوڑا۔ شاہینہ بھی اس کے پیچھے بھاگی۔ دونوں باپ کے کمرے
میں جا پہنچے۔

"خان بابا" دونوں ہی ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔

"کیا ہے بچو" خان بابا، صبور خان نے بچوں کو پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

"بی بی جان کھانے کے لیے بلا رہی ہیں" شہباز بولا۔

"اچھا بھئی اچھا۔ ہم ادھر ہی آ رہے ہیں" صبور خان نے جھک کر شاہینہ کو اٹھا لیا۔
شہباز نے باپ کی انگلی پکڑ لی۔

سب ڈائننگ روم میں آ گئے۔

"کیا پکا ہے؟" کھانے کی اشتہا بڑھانے والی خوشبو نتھنوں میں گھسی تو صبور خان نے
کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا اور شاہینہ کو انھوں نے گود میں بٹھا لیا۔

"اسے اس کی کرسی پر بٹھا دیں۔ کھانا ٹھیک سے کھانے نہیں دے گی" تمکینے نے دائیں
ہاتھ کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے خان کی طرف دیکھا۔

انھوں نے اس کے سرخ دہکتے پھولے پھولے رخساروں پر پیار کرتے ہوئے کہا
"کوئی بات نہیں۔ کھا لیں گے"

تمکینے نے شہباز کو پیار کرتے ہوئے برابر والی کرسی پر بٹھا لیا۔ اور اس کی چوڑی پیشانی
پر بوسہ دیتے ہوئے بولی "آپ بہت اچھے ہیں۔ خان بابا کو تنگ نہیں کرتے۔"

"ہاں میں بہت اچھا ہوں بی بی جان" شہباز نے سینے پہ ہاتھ مارا۔

اس کی حرکت پر صبور خان اور تمکینے مسکرا دیئے۔

تمکینے نے کھانے کے ڈونگے اور ڈشیں صبور خان کے سامنے سرکائیں۔ انہوں نے
اپنا کھانا نکالا۔ پھر تمکینے نے شہباز کی پلیٹ میں سالن اور چاول نکالے۔

"بس بی بی جان" شہبانہ نے کہا۔

"کیا بات ہے بھوک کیوں نہیں لگتی تمہیں" تمکینے نے قدرے متفکرانہ انداز میں کہا۔

"شاہینہ تم سے زیادہ کھاتی ہے گوشت ۔۔"

"اوں ہوں ۔ ہماری بیٹی کے کھانے کو نظر نہ لگا دینا" صبور خان نے تمکینے کی بات کاٹتے ہوئے روسٹڈ چکن کی ٹانگ شاہینہ کو پکڑا دی۔

صبور خان کو بیٹی سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔ اس کا اظہار وہ ہمہ وقت کرتے رہتے۔ شہباز یہ بات محسوس کرتا تھا۔ لیکن تمکینے یہ کمی پوری کرتی رہتی تھی۔ صبور خان سے اس سلسلے میں بات کرنے کا کئی بار اس نے سوچا تھا۔ لیکن حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ ان کے کسی رویے کی خامی کو ان کے سامنے لائے۔

"باہر کھانا بھیج دیا" صبور خان نے گوشت کا پیس اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں" تمکینے نے جواب دیا۔ "عادل خان لے گیا ہے سب کے لیے کھانا"

"ہوں" صبور خان نے لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے آواز نکالی۔ اپنے ملازموں اور کارندوں کے کھانے پینے کا وہ خود خیال رکھتے تھے۔

بچوں کی پیاری پیاری باتوں میں کھانا کھایا جانے لگا۔

لیکن ابھی پوری طرح ختم بھی نہ کر پائے تھے کھانا کہ عادل خان جو اس گھرانے کا معتمد اور پرانا ملازم تھا گھبرایا ہوا اندر آیا۔

"خان" اس نے آتے ہی کہا۔

"کیا ہے عادل خان ؟" صبور خان نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

"خان ۔ گاؤں سے سرور خان آیا ہے"

"خیریت ؟"

"نہیں خان ۔ آغا جان ۔ کی حالت ۔"

آغا جان ! صبور اور تمکینے کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ وہ بیمار تھے۔ پچھلے ہفتے دونوں انہیں دیکھ کر آئے تھے۔ صحت گر چکی تھی۔ لیکن وہ اپنی بیماری سے بڑے شان شایان طریقے سے لڑ رہے تھے۔ صبور خان اور تمکینے کو تسلی ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ واپس لوٹ آئے تھے لیکن

اب بطور خاص ایک آدمی گاڑی سے انہیں اطلاع کرنے آیا تھا۔ صبور خان کھانا وہیں چھوڑ کر بچی کو کرسی پر بٹھا کر باہر آ گئے۔

خوشحال خان کی حالت نازک تھی۔ آج شام تک وہ خاصے اچھے دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن اچانک ہی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ صبور خان کو اسی وقت بلایا تھا۔ دلبر خان نے کہلوایا تھا کہ اطلاع ملتے ہی وہ چل پڑے۔

صبور خان نے واپس آ کر تمکینے کو صورت حال بتائی۔ "فوراً چلنا ہے۔ آغا جان کی حالت نازک ہے"

تمکینے رونے لگی۔ صبور خان کے اوسان بھی خطا ہو رہے تھے۔ انہوں نے ڈرائیور کو جیپ نکالنے کا آرڈر کیا اور خود اپنے دوست ڈاکٹر عمر کو فون کرنے لگے۔ اسے فوری طور پہ گاؤں پہنچنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا" ہو سکتا ہے آغا جان کو پشاور لا کر ہوسپٹل میں ایڈمٹ کروانا پڑے۔ اس لیے تمہارا وہاں پہنچنا ضروری ہے"

اس نے ایک گھنٹے کے اندر اندر روانہ ہونے کا وعدہ کیا۔

تمکینے نے جلدی جلدی بچوں کے کپڑے بیگ میں ڈالے اپنے اور صبور خان کے دو دو تین تین جوڑے رکھے گھبراہٹ اور پریشانی سے جو کپڑا ہاتھ لگا وہی رکھ لیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب گاؤں جانے والی سڑک پر جا رہے تھے۔

خوشحال خان کی حالت بہت خراب تھی۔ وقفوں سے بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ زندگی ہار رہی تھی۔ موت اپنی فتحیابی پر مسکرا رہی تھی۔

صبور خان جیپ سے کود کر اترے اور حویلی کے کچے صحن کو پھلانگتے اندر دوڑے۔ صحن میں کھڑے ملازمین اور دوسرے لوگوں کے سلاموں کا جواب بھی نہ دے پاتے۔

وہ آغا جان کہہ کر خوشحال خان کے سینے پہ سر رکھ کر بے اختیار سے ہوگئے۔ آغابی بی سرہانے ہی بیٹھی تھیں دلبر خان اس کی بیوی صابرہ اور رشتے کی کئی عورتیں اور مرد وہاں جمع تھے خوشحال خان اس وقت ہوش میں تھے۔ بیٹے کی خوشیوں کی تمنا آنکھوں میں جوت جگا گئی تھی۔ بہت دیر تک وہ انھیں پیار کرتے رہے۔ صبور سر جھکا کر پٹی پہ بیٹھ گئے۔ دلبر خان نے ان کی پشت پہ ہاتھ پھیرا۔ لیکن کچھ کہا نہیں۔ غم اندوہ نے انھیں گنگ کر رکھا تھا۔ باپ سے انھیں بہت الفت تھی۔ بچھڑنے کا مرحلہ قریب دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہ پا رہے تھے کہ کیا کریں۔

تمکینے اور بچے بھی آغا جان کے پلنگ کے قریب آئے۔ خوشحال خان نے اپنا نحیف سا ہاتھ اٹھا کر سب کے سروں پر پھیرا۔

ڈاکٹر بھی کچھ ہی دیر کے بعد پہنچ گیا۔ اس نے خوشحال خان کو دیکھا۔ معائنہ کیا۔ اس نے مایوسی ظاہر کی۔ اب انھیں ہوسپٹل لے جانے کی ضرورت نہ تھی۔ دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔

خوش حال خان نے آنکھ کھولی۔ وہ دو گھنٹے کی بے ہوشی کے بعد ہوش میں آئے تھے۔ سب گھر والے ان کے پلنگ کے گرد ہی بیٹھے بے خواب آنکھوں سے انھیں تکے جا رہے تھے۔ دونوں بہوئیں بھی قالین پر گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھی تھیں۔ کچھ قریبی عزیز بھی اونگھ رہے تھے۔ دو ایک سو بھی رہے تھے۔

خوشحال خان نے دلبر اور صبور کے سر سینے پر رکھ کر انہیں لپٹا لیا۔ دونوں کی آنکھیں جلنے لگیں۔ خوشحال خان نے ٹوٹتی بیٹھتی آواز میں انھیں صبر کی تلقین کی۔ پھر گردن گھما کر سرہانے بیٹھی آغابی بی کو دیکھا۔ وہ ان پر جھک گئیں۔

"صابرہ اور تمکینے۔ کو۔ بھی بلاؤ۔"

آواز سنتے ہی دونوں لپک کر ادھر آگئیں۔ آغا جان نے اپنے تکیے اونچے کرنے کو کہا۔ وہ اس وقت پورے ہوش و حواس میں تھے۔

"میرے بچو۔ مجھے تم پر فخر ہے۔" انھوں نے کمزور آواز میں کہا۔ پھر دونوں بھائیوں اور بہوؤں کے پیار اور سلوک کی تعریف کی۔ آغابی بی کی عمر بھر کی وفادارانہ رفاقت کو خراج تحسین پیش کیا۔ آغابی بی بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ بہوئیں البتہ آنسو چادروں کے کونوں سے پونچھنے لگیں۔

تھوڑی سی تمہید کے بعد آغا جان نے کہا: "میرے مرنے کے بعد اس خاندان کا اتحاد اور سلوک اسی طرح رہے۔ شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔"

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔

"شاباش۔" آغا نے کہا: "میری ایک خواہش ہے۔ وہ بھی امید ہے تم ضرور پوری کرو گے۔ صابرہ اور تمکینے کو بھی اعتراض نہ ہوگا۔"

"آپ حکم کریں آغا جان۔"

اور آغا جان نے حکم کر دیا۔ "دلبر اور صابرہ کے دونوں بچے زرگل اور زری گل۔ صبور خان اور تمکینے کے دونوں بچے شاہینہ اور شہباز خان۔۔۔ ان کی شادیاں۔۔"

"ہم آپ کا مطلب سمجھ گئے آغا جان۔" دلبر بولا۔

"ہمیں خوشی ہوگی۔" صبور خان بولا۔ "بلکہ ہماری تو دلی خواہش یہی تھی۔ آپ نے حکم فرمایا۔ ہمارے سر آنکھوں پہ۔"

دلبر خان نے بھی یہی کہا: "یہ بندھن ہم دونوں بھائیوں کو اور مضبوط کر دے گا۔"

"بہوؤں سے بھی کہہ دو آغابی بی۔ تمہاری بھی تو یہی مرضی ہے نا۔"

آغابی بی نے سر اثبات میں ہلایا۔

تمکینے اور صابرہ گلے ملیں۔ یہ ان کی خوش دلی سے رضامندی کا اظہار تھا۔

"کل اس بات کا باقاعدہ اعلان ہوجائے۔" آغا جان نے کہا۔ "کل میں زندہ رہا، تو ان کی منگنی بھی کردوں گا۔"

اور اگلے دن واقعی چاروں بچوں کی منگنی کردی گئی۔ خاندان کے لوگ جمع ہوئے، دعوت دی گئی۔ خوشی منائی گئی۔ لڑکے دولہا بنے۔ ننھی منی دلہنیں کپڑے زیور پہن کر اٹھلاتی پھریں۔ دلبر اور صبور بار بار گلے ملتے۔ تمکینے اور صابرہ نے دوپٹے بدلے۔ یوں دوپٹہ بدل بہنیں بن گئیں۔

خدا نے خوشحال خان کو اپنی زندگی کی یہ آخری خوشی دیکھنے کی مہلت دے دی۔

دو دن بعد وہ راہیٔ ملک عدم ہوگئے۔ آغا بی بی کو سفید چادر اوڑھا دی گئی۔ اور کفن دفن اور کئی دن کے سوگ کے بعد دلبر خان کو باپ کا جانشین بنا دیا گیا۔ صبور خان کا جائیداد میں پورا حصہ تھا۔ لیکن یہ سارا دلبر خان ہی کی زیرِ نگرانی رہا۔ کیونکہ صبور خان گاؤں میں نہیں رہتے تھے۔

چالیسویں کے بعد صبور خان نے بھائی سے واپسی کی اجازت چاہی۔ آغا بی بی سے بھی اجازت لی۔ تمکینے اور دونوں بچوں کو لے کر جیپ میں آبیٹھے۔ روتی آنکھوں سے سب جدا ہو رہے تھے۔

لیکن

اس وقت ایسا تماشہ ہوا کہ سب ہنس پڑے۔ ان دنوں میں چاروں بچے آپس میں بہت بہت مانوس ہو چکے تھے۔ شہباز، زری گل کو ساتھ لے جانے کے لیے جیپ سے کود گیا تھا۔ اور زرگل نے شاہینہ کو کھینچ کھینچ کر جیپ سے اتارنا چاہا تھا۔

بچپن کے یہی جذبات وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتے گئے۔ زرگل شاہینہ اور شہباز گل زری سے مانوس اور وابستہ ہوگئے۔ صبور خان جب بھی گاؤں جاتے بچے ان کے ساتھ جانے کو تیار ہوتے اور دلبر خان تو اکثر شہر آتے رہتے تھے زرگل اور زری ان کے ساتھ ہوتے بچے آپس

میں گھل مل کر کھیلتے۔ تو والدین خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ پیار کے بندھن مضبوط ہوتے گئے۔

اب بچے شعور کی حدوں کو پہنچ رہے تھے۔ انھیں نئے رشتوں کا پتہ چل رہا تھا۔ معصوم اور... ٹھنڈے ٹھنڈے پیار میں حدت بھر رہی، معصومیت چالاک ہوشیار ہوتی جارہی تھی۔

شہباز اور شاہینہ شہر میں رہتے تھے۔ شہری فضا ان پر اپنا رنگ جما رہی تھی۔ گھریلو فضا تو وہی تھی اس لیے کہ وہ خان بابا کے تابع تھی۔ لیکن اسکول کالج میں وہ گھریلو گھٹن سے آزاد ہوتے تھے۔ شہباز کے کئی دوست تھے۔ شاہینہ کی بہت سی سہیلیاں تھیں۔ یہ سب لوگ تعلیم یافتہ اور آزاد خیال لوگوں کے بچے تھے۔ ان کا اثر شہباز اور شاہینہ پر بھی ہو رہا تھا۔

زرگل نے بھی زرعی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ اس کے خیالات میں بھی وسعت آگئی تھی۔ گو وہ ہوسٹل میں رہتا تھا کہ آغا بی بی اور آغا جی کو پسند نہیں تھا۔ وہ اپنی منگیتر کے گھر پر رہے۔ خالی چچا کا گھر ہوتا تو بات اور تھی۔ اس لیے وہ ہوسٹل میں تھا۔ لیکن چھٹی کے دن گھر جانا ہوتا۔ تو شاہینہ کی قربت میسر آجاتی۔ شاہینہ بھی ہفتے بھر اس کی آمد کی منتظر رہتی۔ دونوں ملتے تو یوں لگتا صدیوں کی مفارقت جھیل کر ملے ہیں۔ محبت کا نازک پودا لہلہا رہا تھا۔ اس کی جڑیں تنومند ہوتی جارہی تھیں۔ کبھی کبھی دونوں گھر سے باہر بھی مل لیتے تھے۔ کسی ریسٹورانٹ یا ہوٹل کے نیم تاریک مہکتے اور مترنم گوشے میں بیٹھ کر چائے پیتے یا کھانا کھاتے اپنی اپنی بے تابیوں کا ایک دوسرے پر اظہار بھی کر لیتے تھے۔

زری گاؤں ہی میں رہتی تھی۔ مڈل کے بعد آغا بی بی نے گھر بٹھا لیا تھا۔ اسے بھی پڑھنے کی لگن تھی۔ اور وہ بھی پشاور کے کسی اچھے اسکول میں پڑھنے کی متمنی تھی لیکن گھر میں آغا بی بی اور دلبر خان کا حکم چلتا تھا۔ اسے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے پشاور نہیں بھیجا گیا۔

"شاہینہ بھی تو پڑھ رہی ہے۔" زری شاکی انداز میں کہتی۔

"تم ان کے ہاں رہ سکتیں تو تمہیں بھی پڑھنے کا موقع مل سکتا۔ لیکن تمہیں وہاں نہیں

رکھا جا سکتا۔"

"ہوسٹل تو ہیں۔ خان سہراب چاچا کی بیٹی ریشمے بھی تو ہوسٹل میں رہ کر پڑھ رہی ہے"

"لڑکیوں کو ہوسٹلوں میں رکھنا ہمیں پسند نہیں۔"

زری چپ ہو جاتی۔ ماں سے لڑتی جھگڑتی تو وہ بے بسی سے کہتی: "میرا بس کہاں چلتا ہے بیٹی۔"

زری کو پڑھائی کا شوق تھا۔ زرگل نے اس کا بندوبست یوں کیا کہ ایک ٹیچر رکھ دی اور میٹرک کے کورس کی کتابیں لا دیں۔ یوں زری نے میٹرک کر لیا۔ اس کے بعد اس طرح ایف اے بھی پاس کیا۔

آغا بی بی نے کہہ دیا: "بس اتنی تعلیم کافی ہے۔ اب کچھ گھر گرہستی سیکھو۔ شادی کے بعد یہی چیزیں کام آتی ہیں۔"

ان کے حکم کے آگے دم مارنے کی کسے مجال تھی۔ زری کیا کرتی۔ گھر کے کام کاج کرنا شروع کر دیے۔ نوکرانیوں کی کھیپ کے باوجود وہ کھانا پکانا، کمرے ترتیب دینا اور کپڑے سینا سیکھنے لگی۔

شاہینہ اور زرگل کی طرح زری اور شہباز کو ملنے کے مواقع نہیں ملتے تھے۔ کبھی کبھار شہباز خان گاؤں چلا جاتا تو زری کی جھلک نظر آ جاتی۔ سیدھی سادی سی لڑکی شرم و حیا کا مجسمہ تھی۔ شہباز کے نام پر ہی کانوں تک سرخ ہو جاتی۔ لیکن چاہتیں اور محبتیں پروان چڑھ رہی تھیں۔ شہباز من مندر کا دیوتا تھا۔

شہباز کے لیے بھی بڑی کشش انگیز تھی زری کی ذات۔ جب بھی وہ گاؤں جاتا، زری کی جھلک دیکھ لیتا۔ کئی کئی دن سرشاری اور نشے کی سی کیفیت رہتی۔ بہت بے تابی ہوتی تو وہ اس سے ملنے کا موقع نکال ہی لیتا۔ کئی مکانوں پہ پھیلی حویلی کے کئی گوشے ایسے تھے ہی جہاں تنہائی میسر آ سکتی تھی۔ چاہے چند لمحوں ہی کی سہی۔

زری تو اس کے سامنے گونگی ہی ہو جاتی تھی۔ چہرے پر شہابی رنگ دوڑ جاتے۔ ہونٹ کپکپاتے۔ آنکھوں پر پلکوں کی سیاہ چلمنیں گر جاتیں۔

شہباز بے تکلفی سے باتیں کرنے کی کوشش کرتا۔ ہنستا بولتا چھیڑتا۔۔۔ ستاتا۔ لیکن وہ فری نہ ہو پاتی۔ گھبرائے گھبرائے لہجے میں کبھی کوئی بات کر لیتی اور بس۔ شہباز اس کے اس انداز پہ لوٹ پوٹ ہو جاتا۔

کبھی کبھار وہ آغا بی بی کے ساتھ شہر بھی آ جاتی۔ صبور چاچا کے ہاں ہی ٹھہرتی۔ یہاں بھی کھلنے ملنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ شہباز کی کوشش کے باوجود بھی نہیں ملتا تھا۔ اس لیے کہ ساتھ آغا بی بی جیسی کڑی نگران ہوتی تھی۔

اس کے باوجود بھی محبت پروان چڑھ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو پانے کے لیے بے چین رہتے تھے۔

"ماہ و سال کا چکر چلتا رہا۔"

زرگل زرعی یونیورسٹی سے گریجویشن کر رہا تھا۔ اس نے اپنی زمینداری سنبھالنا تھی۔ زمینوں سے سونا اگلوانا تھا۔ بے شمار اراضی تھی۔ زرگل کو اپنی مٹی سے پیار تھا۔ اپنی تہذیب سے انس تھا۔ گاؤں کی زندگی سے بیزار نہیں تھا۔ گاؤں میں رہ کر اپنے لوگوں کی معیت میں وہ تہذیب کی مہک اور تعلیم کی روشنی اپنے لوگوں میں پھیلانا چاہتا تھا۔ گاؤں میں لوگوں کی اکثریت ایسی تھی جو زندگی کو بس گزارے چلے جا رہے تھے۔ اپنی روایات کے تحفظ اور دوستی و دشمنی جیسے جذبوں سے نبرد آزما ہونا ہی ان کا مقصد تھا۔ زرگل کی دلی خواہش تھی کہ یہ لوگ اپنی ذہنی و جسمانی توانائیاں کسی اچھے مقصد کے لیے صرف کریں۔ انھیں زندگی کی اعلیٰ اقدار سے شناسائی ہو۔ جانوروں کی طرح کھانا پینا اور سونا جاگنا ہی مقصد حیات نہ ہو۔ وہ باپ دادا کی طرح لوگوں پر صرف حکمرانی ہی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ انھیں انسان ہونے کے ناتے ان کے سارے حقوق لوٹانا چاہتا تھا۔

شہباز خان اس کے بالکل برعکس تھا۔ گاؤں میں زری نہ ہوتی تو شاید وہ کبھی لوٹ کر دیکھتا

بھی نہیں اور صرف شہر میں پلا بڑھا تھا۔ شہری آداب خود بخود کردار کا حصہ بن گئے تھے۔ اس نے مصنوعی اور کھوکھلی نمائشی زندگی کو سوچے سمجھے اپنا لیا تھا۔ جوش، ولولے، جرأت اور بہادری کو جو اس کے خاندان کی شناخت تھی، پہچان تھی اسے شائستگی کے لبادے تلے چھپا دیا تھا۔

ایف ایس سی کے بعد اس نے لاہور انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ لاہور آکر اس نے نئی دنیا دیکھی تھی۔ ماں، باپ کے کڑے اصولوں تلے وہ اب تک ڈرا سہما سا زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن یہاں آکر وہ مادر پدر سے آزاد تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اب تک وہ کنوئیں میں مینڈک کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ کنوئیں سے باہر تو وہ اب آیا تھا۔

نئی زندگی اسے بہت پسند آئی۔ یہاں نہ خان بابا کی گونج گرج تھی۔ نہ ہی بی بی جان کی پوچھ گچھ۔

"کہاں رہے اتنی دیر۔"

"وقت پر گھر آجایا کرو۔"

"دوستی صرف کالج تک ہی محدود ہونا چاہیئے۔"

"تمہارے خان بابا کو شتر بے مہار کی طرح پھرنا پسند نہیں۔"

"مانا کہ تم ماشاءاللہ بہت لائق ہو۔ پھر بھی یہ وقت پڑھائی کی طرف دھیان دینے کا ہے۔"

"تمہیں شہر ضرورت سے زیادہ ہی راس آگیا ہے، میں دیکھ رہی ہوں۔ تم گاؤں سے دور ہوتے جا رہے ہو اور یہ اچھی بات نہیں۔ ہماری جڑیں گاؤں ہی کی مٹی میں ہیں۔"

"آغا بی تم سے نالاں ہیں، پیشتر اس کے کہ ان کا عتاب ٹوٹ پڑے۔ اپنی اصلاح کر لو۔ باقاعدگی سے انھیں سلام کرنے جایا کرو گاؤں۔"

"وہ تمہیں زرگل جیسا دیکھنا چاہتی ہیں۔"

بی بی جان سے وہ قطعاً نہیں ڈرتا تھا۔ ہاں خان بابا سے جان جاتی تھی۔ ان کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ ان کا حکم ٹالنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

لاہور آکر اس نے سکون کا سانس لیا۔ شروع شروع میں تو کچھ اکھڑا اکھڑا ضرور رہا۔

گھر یاد آتا۔ بی بی جان اور شاہینہ یاد آتیں۔ خان بابا کی سخت گیری میں بھی ان کے پیار کی مہک کا احساس ہوتا اور سب سے بڑی بات زری بے طرح یاد آتی۔ سنہری رنگت، سیاہ آنکھوں اور گھنگھریالے سیال چمکیلے ریشمی بالوں والی چپ چاپ سی زری۔ جس کی خاموشی بولا کرتی تھی۔ وہ اسے بے حد یاد آتی۔

لیکن رفتہ رفتہ وہ نئے ماحول میں گھلنے لگا۔ اسے دو تین اچھے دوستوں کی قربت میسر آگئی۔ اس کا وقت بہت اچھا گزرنے لگا۔ وہ ایک امیر کبیر باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ یوں بھی صبور خان نے بچپن ہی سے دونوں بچوں کے بینک اکاؤنٹ الگ الگ کھلوا دیے تھے۔ اب تک دونوں بہن بھائیوں کے اکاؤنٹ میں کافی روپے جمع ہو چکا تھا۔

شہباز کو خوش قسمتی سے اچھے دوستوں کی صحبت میسر آگئی تھی۔ وہ ان کے ساتھ گھومنے پھرنے اور سیر و تفریح میں روپیہ تو خرچ کرتا تھا۔ لیکن یہ خرچ اسراف نہیں تھا۔ نہ ہی کسی غلط کام پر کبھی پیسہ لگایا تھا۔ اس کے دو دوست عثمان اور تسنیم تو خود بھی امیر کبیر تھے۔ راشد متوسط طبقے کا تھا۔ راشد اور تسنیم سے دوستی فرسٹ ائیر سے ہی تھی۔ عثمان سے دوستانہ مراسم انجینئرنگ کے آخری سال میں ہوئے تھے۔

عثمان کے ڈیڈی امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتے تھے۔ تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھے۔ اس کی ممی نے بھی ایم۔ اے کیا ہوا تھا۔ اور کچھ عرصہ لاہور کالج میں پڑھاتی بھی رہی تھیں۔ بڑے نفیس ذوق کی مالک تھیں۔ ان کی نفاست طبع کا عثمان نے تو کچھ زیادہ اثر نہیں لیا تھا۔ ہاں ان کی بیٹی زوبیہ نے ماں کی یہ خوبی ضرور اپنائی تھی۔ وہ ان دنوں ہوم اکنامکس کالج میں تھی۔ بی۔ اے کا آخری سال تھا۔ شکل و صورت تو واجبی سی تھی۔ لیکن بے حد اسمارٹ تھی۔ ملاحت و دلکشی بھی قدرت کی دین تھی۔ ماڈرن گھرانے کی لڑکیوں کی طرح وہ بھی اپنے اصول و آدرش رکھتی تھی۔ والدین نے ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی لیکن آزادی کے ساتھ غیر محسوس سی پابندی بھی تھی۔ جس سے آزادی بے راہ روی نہیں بنی تھی۔

زوبیہ ہنس مکھ سی لڑکی تھی۔ بے تکلفی سے باتیں کرتی تھی، دل نشیں انداز میں ہنستی تھی، اور آزادی سے گھومتی پھرتی تھی۔ ڈرائیونگ اسے آتی تھی۔ تیراکی سیکھی تھی۔ دبلی پتلی اور نازک سی لڑکی کو گھڑسواری کا بھی شوق تھا۔ ممی کی طرح اسے باورچی خانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بیرے خانسامے موجود تھے۔ اسے کچن میں جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہاں گھر کو ڈیکوریٹ کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ پاپ میوزک اس کی کمزوری تھی۔

وہ اپنی سہیلیوں میں کچھ اپنی امارت اور کچھ نفیس ذوق کی وجہ سے بہت مقبول تھی۔

شہباز سے پہلی ملاقات یونیورسٹی ہی میں ہوگئی تھی وہ اپنے کسی فارم کے سلسلے میں عثمان کے پاس آئی تھی۔

عثمان نے جو اس وقت شہباز کے ساتھ گیٹ کے قریب ہی کھڑا، کسی پروفیسر کے محنت سے پڑھانے کی باتیں کر رہا تھا، زوبیہ کو گیٹ سے اندر آتے دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ کر ادھر بڑھ گیا۔

شہباز نے شوخی سے اس پر کوئی آوازہ کسنا چاہا تھا۔

لیکن منہ سے کوئی لفظ نکلا بھی نہ تھا کہ عثمان نے کہا۔ ”آؤ شہباز۔ اس سے ملو۔ یہ میری چھوٹی بہن زوبیہ ہے۔“ شہباز نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے منہ سے مذاق سے کوئی غیر شائستہ بات نہیں نکل گئی۔

زوبیہ گاڑی سے باہر نکل آئی۔ عثمان نے شہباز کے متعلق بھی اسے بتایا۔ ”بہت اچھے، بڑے عمدہ انسان ہیں۔ مجھے ان کی دوستی پر فخر ہے۔“

زوبیہ نے عثمان کی بات سنی بھی کہ نہیں وہ ایک ٹک اسے تکے گئی۔

شہباز کچھ خفت سی محسوس کرتے ہوئے ہولے سے کھنکارا، زوبی کی محویت ٹوٹی تو بھائی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اور بے تکلفی سے بولی۔ ”بڑے گرانڈیل قسم کے دوست ہیں، مانی تمہارے۔“

”پٹھان جو ہیں۔“ عثمان نے ہنس کر کہا۔

”واقعی۔“ زوبی بولی۔

”ہاں۔“ عثمان نے یقین دلایا۔ ”ایک دم پٹھان ہیں بھاری بھر کم قسم کے پٹھان۔“

شہباز ہنسنے لگا۔ زوبی کو اس کی مردانہ پروقار مسکراہٹ بہت اچھی لگی۔ چند منٹ وہ باتیں کرتے رہے۔ پھر زوبی نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

مانی ہنس کر بولا۔ ”مجھے پتہ تھا تم میرے پیچھے آؤ گی..... بلا کہیں کی۔“

زوبی نے بھائی کا منہ چڑایا۔ چابی انگلی کے گرد گھماتے ہوئے بولی۔ ”ابھی چل سکتے ہو۔“

”پیریڈ تو فری ہے، کتنی دیر لگے گی۔“

”تم آؤ تو سہی۔“ زوبی نے بھائی کا بازو پکڑ کر گھسیٹا۔ شہباز کو بہن بھائی کی بے تکلفی بہت اچھی لگی۔

”میں ابھی آتا ہوں۔“ عثمان نے گاڑی کی طرف جاتے ہوئے شہباز سے کہا۔

”فری ہیں تو آپ بھی آجائیں۔“ زوبی نے نگاہوں سے پُرزور دعوت دیتے ہوئے کہا

شہباز کو اس کی بے تکلفی عجیب لگی۔ مانی نے بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”تھوڑی دیر کا کام ہے۔ ابھی آجائیں گے آجاؤ۔“

وہ خاموشی سے آگے بڑھا اور گاڑی کا دروازہ کھولا۔

زوبی نے چابی بھائی کو دی اور خود پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ یوں شہباز فرنٹ سیٹ پر عثمان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ تینوں جتنی دیر ساتھ رہے باتیں کرتے رہے، زوبی پٹ پٹ باتیں کیے جا رہی تھی۔ شہباز کو کچھ کچھ حیرانگی بھی ہو رہی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں لڑکی کا اس قدر بے تکلف ہونا اس نے کب دیکھا تھا۔

لیکن حیرت کے باوجود اسے اچھا بھی لگ رہا تھا۔

چند دنوں بعد زوبیہ، شہباز کو ایک اسٹور کے کاؤنٹر پر ملی۔ وہ شاید شاپنگ کر چکی تھی۔ دو تین پیکٹ اٹھا رکھے تھے۔ اور اب بل ادا کر رہی تھی۔ شہباز نے تین چھٹیوں میں پشاور

جانا تھا۔ اس لیے بی بی جان، شاہینہ اور خان بابا کے لیے چھوٹے موٹے تحائف خریدنا تھے۔ اس دفعہ گاؤں جانے کا بھی ارادہ تھا۔ اس لیے تحفوں کی فہرست میں آغا بی بی اور زری کا نام بھی شامل تھا۔

اس کی نگاہ زوبیہ پر پڑی اس کی شاید کوئی سہیلی بھی ساتھ تھی۔ زوبیہ نے اسے دیکھا۔ دیکھتے ہی پلٹی اور بڑی بے تکلفی سے بولی۔ "ہیلو۔"

"ہیلو!" اس نے بھی شائستگی سے کہا۔

"کیسے ہو؟"

"فائن۔"

"اکیلے آئے ہو!"

"ہاں۔"

"میرا مطلب ہے مانی ساتھ نہیں۔ کیسے چھوڑ دیا اکیلے اس نے۔ وہ تو پتہ نہیں رات بھی کیسے گزارتا ہے تمہارے بغیر!"

شہباز ہنس کر بولا۔ "محبت ہے اس کی۔ بہت پیارا انسان ہے۔"

"وہ یار۔ تم۔" زوبیہ نے اس کی آنکھوں میں شوخی سے جھانکا۔ شہباز گڑبڑا سا گیا۔

زوبی جھٹ سے بولی۔ "میں یہ سامان گاڑی میں رکھ آؤں۔ آپ یہیں ٹھہریئے گا۔ آؤ نمی!"

اس کی دوست نے شہباز پہ اک نگاہ ڈالی مسکراتے ہوئے بولی۔ "یہ ہی مانی کے نئے دوست ہیں۔ جن سے ایک بار ملو اور ہزار بار ملنے کی تمنا جاگی ہے!"

وہ ہنس پڑی۔ "ہاں نمی۔ خود ہی دیکھ لو۔ کیا میں نے غلط بات کہی!"

"نہیں۔"

دونوں ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ شہباز وہیں کھڑا کچھ حیران حیران سا انہیں تکتا رہا۔ وہ اپنا سامان گاڑی میں رکھ کر واپس آگئیں۔ شہباز ان کا منتظر ہی تھا۔

دونوں لڑکیوں نے شاپنگ میں اس کی مدد کی۔ عورتوں کی پسند نہ پسند کا اسے کوئی

خاص تجربہ بھی نہیں تھا۔ اس نے زوبیہ کا شکریہ ادا کیا۔

"خالی خولی شکریہ۔" وہ ہنسی۔

"جی!" حیرانگی سے شہباز نے کہا۔

"بھئی ایک کپ چائے ہی ہو جائے!" نمی نے ہنس کر کہا۔

"بالکل۔ بالکل!" زوبیہ بولی۔ "وہ سامنے ہی تو ریسٹورانٹ ہے۔" آیئے!"

"شہباز کٹھ پتلی بنا تھا۔ دونوں لڑکیوں کے ساتھ اس خوبصورت ریسٹورانٹ میں چائے کے لیے آنا پڑا۔ اس کے لیے یہ تجربہ نیا تھا۔ نیا اور سنسنی خیز!"

نمی زوبیہ سے بھی زیادہ باتونی تھی۔ دونوں بے تکلفی سے ہنس بول رہی تھیں۔ اور شہباز من ہی من میں ان کا موازنہ اپنے ماحول کی پروردہ لڑکیوں سے کر رہا تھا۔ شاہینہ جسے وہ خاصی موڈ سمجھتا تھا۔ وہ اب بھی ان جیسی نہ تھی اور زری۔ زری کا خیال آتے ہی اسے جھرجھری سی آگئی۔ یہ لڑکیاں بہتی اچھلتی گاتی ناچتی چنچل ندیوں کی طرح تھیں اور زری جھیل کا ٹھہرا ہوا پانی۔ جس میں کبھی کبھار ہلچل ہوتی ہے۔ کبھی کبھار۔ جب آندھیوں کے طوفان اٹھتے ہیں یا کوئی کشتی اس کا سینہ چیرتے نکل جاتی ہے۔

اگلے ہی ہفتے شہباز رات کے کھانے پر مانی کے ہاں مدعو تھا۔ وہ اسے اپنے ممی ڈیڈی سے ملوانا چاہتا تھا۔ زوبیہ ہی نے ڈنر پر بلانے کی تجویز پیش کی تھی۔

بہت خوب صورت اور بڑا ہی آراستہ گھر تھا ایک ایک چیز نفاست کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ تصاویر اور پینٹنگز کا انتخاب تو لاجواب تھا۔ پتھر کے مجسمے خوب تھے۔ پھولوں کی آرائش بھی قابل دید تھی۔ مانی کے ممی، ڈیڈی بڑے خوش خلق اور زندہ دل تھے۔ یہاں حکمرانی ممی کی تھی۔ ڈیڈی تو ہر کام سے لاتعلق تھے۔

شہباز نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ مرد ہی کو گھر میں حکمرانی کرتے دیکھا تھا حکمرانی بھی سخت گیری کی حد تک۔ عورت تو صرف حکم کا بندہ تھی۔ مرد کے حکم سے سرتابی کی مجال

توکیا۔ شاید کسی نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اس گھر میں دوستانہ فضا تھی۔ باپ، ماں اور بچے سب آپس میں بے تکلف تھے۔ ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ڈیڈی ممی کی حکمرانی مان رہے تھے۔ اور تفاخر سے سب کو احساس دلا رہے تھے۔ زوبیہ اور مانی باپ سے جس بے تکلفی اور شوخی سے باتیں کر رہے تھے۔ شہباز نے تو اپنے خان بابا سے اتنا فری ہونے کا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اپنے گھر کی گھٹن کا اسے اب احساس ہو رہا تھا۔ وہ اس ماحول میں خوش تھا۔ اسے یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ اچھا بہت اچھا۔

کھانے کے بعد تھوڑی دیر گپ شپ رہی۔ پھر ممی ڈیڈی تینوں کو بے تکلفی سے باتیں کرنے کے لیے چھوڑ کر اٹھ گئے۔ ڈیڈی ناول پڑھنے لگے اور ممی اپنی پسند کا میوزک دھیمے سروں میں سننے لگیں۔

وہ تینوں ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئے۔ خوبصورت لان میں کرسیاں بچھی تھیں۔ چاندنی کا سحر پھیلا تھا۔ ہوائیں مہک رہی تھیں۔ فضا مترنم تھی۔ موڈ آپوں آپ رومینٹک ہو رہا تھا زوبیہ پر تو سرشاری کی کیفیت طاری تھی۔ مانی اپنے کسی ادھورے رومانس کی باتیں کرنے لگا۔ شہباز بڑے شوق سے زوبیہ کو دیکھ رہا تھا اور مانی کی خوبصورت باتیں سن رہا تھا۔

شہباز واپس جانے لگا تو زوبیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا" پھر کب آؤ گے؟"

"جب تم بلاؤ گی۔"

"کل ہی بلالوں تو۔"

"چلا آؤں گا۔"

"سچ۔"

"بالکل۔"

زوبیہ نے واقعی اسے دوسرے دن ہی چائے پہ بلالیا۔

یوں شہباز، زوبیہ سے ملنے لگا۔ زوبیہ تو اس کی اسیر پہلی ہی ملاقات میں ہو چکی تھی شہباز ہی اپنے آگے بند باندھنے کی کوشش کیے جا رہا تھا لیکن پانی کے بہاؤ میں زور آ جائے اور راستے ڈھلانی ہو جائیں تو پھر بھلا کون روک سکتا ہے؟ پانی کو سر کے بل گرنے سے۔

زوبیہ اک نشے کی طرح شہباز کے حواس پر چھا رہی تھی۔ وہ اس نئے تجربے اور خوش کن تبدیلی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ وہ تین دن کے لیے پشاور گیا۔ گاؤں جانے کا ارادہ تھا لیکن آغا بی بی اور زری دونوں آئی ہوئی تھیں۔ زری سے تھوڑی ہی دیر کے لیے سامنا ہوا۔ شہباز کے ذہن میں پلک جھپک زوبیہ آ گئی۔ شوخ چنچل باتوں اور قہقہوں کی پھوار برسانے والی۔ یہ پھوار شہباز کے من کو گیلا کر گئی۔ اس کا من تو جیسے خشک بنجر اور ویران تھا۔

اس نے زری کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی تو زری کی خوبصورت کشادہ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں وہ اس کا سامنا نہ کر سکی۔ پھر دو دن شہباز نے زری کو نہیں دیکھا۔ ہاں کھڑکیوں اور کواڑوں کے پیچھے اس کی جھلک ضرور نظر آئی۔

وہ واپسی کے لیے بے چین تھا۔ رات کی فلائیٹ سے بھی واپس آ سکتا تھا۔ لیکن وہ اسی دوپہر واپس آ گیا۔ شام اس نے زوبیہ کے لیے چھوڑ دی۔

وہ اس کے ہاں گیا۔ زوبیہ کہیں جا رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھنے ہی کو تھی۔ شہباز کو دیکھا تو خوشی سے پاگل ہو گئی جیسے دوڑ کر اس کی طرف آئی۔ رکتے رکتے بھی وہ شہباز کے سینے سے آ ٹکرائی۔

"اوہ۔ تم کہاں چلے گئے تھے شہباز۔ میں نے تمہیں کتنا مس کیا۔ تم نے کیا کر دیا ہے۔ میں۔ میں تمہارے بغیر بور ہوتی رہی ہوں۔"

شہباز آہستگی سے اسے الگ کرتے ہوئے بولا۔ "میں بھی تو تمہاری خاطر جلدی چلا آیا دل ہی نہیں لگا وہاں۔"

"اوہ شہباز۔ تم کتنے پیارے ہو۔" وہ اس کے بازو کو دونوں ہاتھوں سے لپٹتے ہوئے جھول سی گئی۔

شہباز اس کے بالوں کی مہک سے مدہوش ہونے لگا۔

"کہاں جا رہی تھیں؟" شہباز نے ممی ڈیڈی اور مانی کی احوال پرسی کرنے کے بعد پوچھا۔

"یونہی۔ وقت گزاری کے لیے ایک سہیلی کے ہاں۔" وہ بولی۔

"جاؤ۔" شہباز نے شوخی سے اسے دیکھا۔

"چلو۔" وہ بھی شوخی سے بولی۔

"سہیلی کے ہاں۔"

"نہیں۔"

"تو۔"

"کہیں گھومنے پھرنے۔۔"

"چائے نہیں پلاؤ گی۔"

"باہر ہی پئیں گے۔"

"گڈ۔"

"آؤ۔"

دونوں گاڑی میں آ بیٹھے۔ پھر یہ گاڑی آباد سڑکوں سے ہوتی لمبی چوڑی سرمئی اور سنسان سڑکوں پر ہوتی۔ دونوں ایک دوسرے کی مہکتی قربتوں سے مدہوش ہوتے جا رہے تھے۔

پھر

یہ قربتیں پھیلتی گئیں۔ مدہوشیاں بڑھتی گئیں۔ دونوں محبتوں کی حلاوتوں لطافتوں میں ڈوبتے چلے گئے۔

زوبیہ نے اپنا جیون ساتھی چن لیا کر اسے چننا ہی تھا۔ وجیہہ وباوقار اور بقول اس کے گرانڈیل قسم کا محبوب پانا اس کی تمنا تھی ضرورت تھی۔ وہ آزاد تھی اپنے معاملے میں اپنے انتخاب میں۔ لیکن شہباز تو آزاد نہیں تھا۔ اس کی ٹھیکرے کی منگ موجود تھی۔ اور بے کا رشتہ بھی ہو چکا

تھا جس خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ اس کی روایات سے بھی آگہی تھی۔

پھر بھی

وہ پھسل گیا تھا تھا۔ زوبیہ کے دامِ محبت میں اسیر ہو گیا تھا۔ محبت شوریدہ سر آندھی اور طوفان کی طرح اٹھی تھی اور اس کے ڈر خوف اندیشے اڑا کر لے گئی تھی۔

زوبیہ تھی اور وہ تھا۔

وہ تھا اور زوبیہ تھی۔

زوبیہ کے والدین کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بیٹی کو اپنی آئندہ زندگی کے لیے جیون ساتھی کا انتخاب کرنے کی انہوں نے اسے پوری پوری آزادی دے رکھی تھی۔ اس لیے شہباز کے ساتھ ملنا جلنا گھومنا پھرنا ان کے لیے قابلِ اعتراض نہیں تھا۔ اور پھر شہباز بھی تو اپنی شخصیت اپنی حیثیت میں منفرد تھا۔ اعتراض کی گنجائش کہاں نکلتی۔ اس کے ماں باپ آج آ کر رشتہ طلب کریں تو وہ بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کو تیار تھے۔

زوبیہ بھی ان دنوں یہی سوچ رہی تھی۔ شہباز فائنل میں تھا۔ امتحان قریب تھے۔

اس شام دونوں ایک ریسٹورنٹ کے گوشے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سرخ اندھیرا سا غبار پھیلا تھا۔ ہلکی ہلکی موسیقی سے فضا معمور تھی۔ بہت دلکش دلفریب سماں تھا۔

اچانک ہی زوبیہ نے پوچھا: "امتحانوں کے بعد کیا کرو گے"؟

شہباز چونکا۔ آہستگی سے بولا: "کیا بے وقت سوال کیا ہے؟"

"بہت اہم ہے شہباز۔"

"ہوں۔"

"امتحانوں کے بعد کیا ارادہ ہے؟"

"ابھی تو صرف امتحانوں کی تیاری پر زور دے رہا ہوں۔"

"ٹالو نہیں۔ کیا واپس پشاور چلے جاؤ گے؟"

"جانا تو پڑے گا۔"

"پھر کس نے کے لیے!"

شہباز نے ایک گہری نگاہ اس پہ ڈالی اور بولا "ضرور زوبیہ۔ میں ضرور آؤں گا۔ خواہ بغاوت کر کے ہی آنا پڑے۔"

"بغاوت!"

"ہاں۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

اس نے کہا تو شہباز کو اسے پوری طرح سمجھانا پڑا... کچھ بھی نہیں چھپایا۔

زوبیہ خوف زدہ سی نظر آئی سہم کر اسے دیکھا۔ اور میز پہ رکھا اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں سختی سے پکڑ کر بولی "یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا دیا۔ مجھے اندھیرے ہی میں رہنے دیتے۔"

"نہیں۔ زوبیہ۔ تمہیں یہ سب کچھ بتانا ضروری تھا۔ میں تمہیں دھوکے میں رہنے نہیں دینا چاہتا۔ میرا راستہ کٹھن ہے۔ اور اس کی کھٹنائیاں پاٹنے میں تم نے میرا ساتھ دینا ہوگا۔"

"میں تمہاری ہوں شہباز۔ تمہاری۔" اس نے بڑے دل گرفتہ جذباتی لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے ہر رکاوٹ سے ٹکرا جاؤں گا۔"

شہباز واقعی ٹکرا گیا۔ اس نے اپنے خاندان سے بغاوت کر دی روایات سے بغاوت کر دی۔ خان بابا اور بی بی جان سے بغاوت کر دی... اور... اور... بچپن کی معصوم محبتوں سے بغاوت کر دی۔

زوبیہ کے ممی اور ڈیڈی کو اعتراض ہوا۔ انھوں نے زوبیہ کو سوچنے سمجھنے کی تلقین کی۔ پٹھانوں کی دشمنیوں کا قصہ سنایا۔ خون خرابے سے ڈرایا۔

لیکن

وہ تو شہباز کی محبت میں پاگل ہو چکی تھی۔ جذبات کی پُرزور آندھی کو روکنا اس کے

بس میں نہیں تھا۔ اس نے ممی اور ڈیڈی کو صاف صاف کہہ دیا۔ اگر انہوں نے شہباز کے ساتھ اس کی شادی نہ کی تو وہ خود یہ فرض انجام دے لے گی۔ اس نے شہباز کو ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے۔ ہر قیمت پہ۔

"اور یہ قیمت تمہاری خوشیوں کی موت بھی ہو سکتی ہے۔" ڈیڈی نے سگار کی راکھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

"شہباز کی قربت کے ایک دن پہ میں اپنی ساری زندگی قربان کر سکتی ہوں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

"یہ سب باتیں ہوتی ہیں بیٹی۔" ممی نے کہا "شہباز کو پا کر کھونے سے ابھی کھو دینا سہل ہو گا۔ وہ اپنے رسم و رواج سے بغاوت کر کے بھی ان کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور ہوگا تم ان لوگوں کو نہیں جانتیں۔"

"جان لوں گی۔"

"جانو گی تب نا جب وہ تمہیں قبول کریں گے۔"

"نہ کریں۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ مجھے شہباز قبول کر رہا ہے میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔"

بیٹی کی ضد کے سامنے انہیں جھکنا ہی پڑا۔ شہباز کو بلا کر انھوں نے سنجیدگی سے بات کی۔

"انکل۔ اگر آپ ساتھ دیں تو میں زوبیہ سے خود شادی کر سکتا ہوں۔" اس نے مؤدبانہ کہا۔

"اور تمہارے گھر والے..."

"وہ تو پاگل پن کی حد تک قدامت پسند ہیں۔"

"ان سے کیسے نپٹو گے۔"

"نپٹنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے زورِ بازو پہ یہ ہمت کر دوں گا۔ میرے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں۔ پھر نتیجے کے بعد کہیں جا کر بھی حل ہی جائے گی۔"

"سوال پیسے کا نہیں۔ وہ تو زوبیہ کا بھی اتنا حصّہ ہے ہمارے پاس کہ زندگی گزارنے کا وسیلہ بن سکتا ہے، صرف تمہارے والدین سے ڈر لگتا ہے۔"

شہباز بھی اندھا بہرہ ہو رہا تھا۔ چاروں اور زوبیہ ہی نظر آتی تھی۔ اتنی خوف ناک اور تلخ حقیقتوں کو نظر انداز کر رہا تھا۔

دونوں نے ممی ڈیڈی کو اتنا مجبور کیا کہ وہ انہیں ازدواجی بندھن میں باندھنے کو تیار ہو گئے۔

شہباز نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ چپکے چپکے شادی کرے گا۔ والدین کو اس کی ہوا نہیں لگنے دے گا۔ اور ایک بار شادی ہو جائے تو پھر والدین کو پتہ بھی چل جائے تب بھی انھیں اس شادی کو قبول کرنا ہوگا۔

شادی ہوگئی۔

زوبیہ دلہن بن کر ہوٹل کے اس سوئٹ میں آ گئی۔ جو شہباز نے بک کروایا تھا۔

بیڈ پر وہ سونے موتی اور پھولوں سے لدی پھندی بیٹھی تھی۔ جھلمل کرتا لباس گوری سی بدن پر سجا تھا۔ شہباز مستانہ انداز میں چلتا اس کے قریب آیا۔ پٹی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے حسن و عشق کے آداب و نیاز چلے۔ پھر شہباز نے زوبیہ کا گھونگھٹ... الٹ دیا۔

زوبیہ نے نرگیس ادا سے اسے دیکھا، وہ دل تھام کر رہ گیا۔

پھر اس نے رونمائی کے طور پر چھوٹا سا لاکٹ زوبی کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "زوبیہ نہیں میرے والدین اگر باقاعدہ طور پر بیاہ کر کے لاتے تو آج میں اس چھوٹے سے لاکٹ کی بجائے اپنا بڑے سے خاندانی ہیرے والا ہار تمہیں تحفتاً دے رہا ہوتا۔"

"میرے لیے یہی بہت بڑا ہے شہباز۔ تم مجھے مل گئے تو سب کچھ مل گیا۔"

شہباز نے وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

دونوں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

تیسرے دن دونوں ہنی مون کے لیے چلے گئے۔ گھوم پھر کر واپس آئے تو زوبیہ کے ممی ڈیڈی

ان کے منتظر تھے۔ آتے ہی پیار سے دونوں کو بازوؤں میں بھر لیا۔

"خیریت رہی نا؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"خوش رہے ہو نا؟" ممی نے سوال کیا۔

دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور ممی ڈیڈی کو ان کی مسکراہٹ نے مطمئن کر دیا۔

شام سب لان میں بیٹھے تھے کہ شہباز نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ممی سے پوچھا۔ "ممی میرے لیے کوئی فون دو دن تو نہیں آیا تھا؟"

"کہاں سے آنا تھا؟" زوبیہ نے ممی کے نفی میں سر ہلاتے ہی پوچھا۔

وہ پیار سے زوبیہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "سارا وقت مجھے دھڑکا ہی لگا رہا کہ خان بابا کو کہیں پتہ نہ چل گیا ہو۔"

"شادی کا؟" ممی بولی۔

"جی۔" وہ مسکرایا۔

"پتہ تو کسی نہ کسی دن انہیں چلے گا ہی۔"

"وہ تو ہے۔"

"اس وقت ہوشیاری دکھانا ہوگی۔ بغاوت تو کر لی ہے۔ آئندہ..."

"چھوڑیں ممی۔ دیکھا جائے گا۔ ہمیں ابھی سے ہراساں نہ کریں۔"

"تم میری بیٹی ہو۔ اک ماں کے ناتے میں اگر فکرمند ہوں تو کوئی بڑی بات نہیں۔"

"فکر نہ کریں۔ شہباز میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔" وہ شان سے بولی۔

"خدا کرے۔" ممی نے ہنس کر کہا۔

وہ چند دن وہیں رہے۔ پھر اپنے گھر آ گئے۔

اپنا گھر جسے ممی نے بڑی محنت سے ان کے لیے ڈیکوریٹ کیا تھا۔

لیکن

اس ارضی جنت میں وہ بمشکل چند دن ہی سکھ کا سانس لے پائے تھے۔ کہ افتاد آن پڑی۔

دو دن پہلے۔

ہاں، صرف دو دن پہلے خان بابا کا فون آیا۔ انہیں شادی کی خبر ملی تھی۔ ظاہر ہے اس خبر سے طوفان اٹھنا تھا۔

لیکن صرف طوفان ہی اٹھتا تو اس کے گزر جانے کا جان لیوا انتظار کر لیا جاتا۔ کٹھن سے کٹھن وقت بھی گزر جاتا ہے۔ رکتا نہیں ٹھہرتا نہیں۔

لیکن خان بابا نے تو اس طوفان کو اور ہی شکل دے دی تھی۔ اسے فوری طور پر واپس پشاور بلایا تھا تاکہ اس کی شادی زری سے کی جائے۔ زری کو کسی طور نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اسے چھوڑنے سے زرگل اور ریشماں کے بندھن ٹوٹنے کے علاوہ دونوں بھائیوں میں کبھی نہ ختم ہونے والی دشمنی کی بنیاد پڑ سکتی تھی۔ یہ دشمنی آگ و خون کی ہولی بھی کھیل سکتی تھی۔

بابا نے صرف دو دن کی مہلت دی تھی۔

اور آج دس بجے انہوں نے فون کر کے شہباز کا آخری فیصلہ معلوم کرنا تھا۔

آخری فیصلہ۔

جو ان کی مرضی کے تابع نہ ہونے کی صورت میں شہباز اور زوبیہ پہ تباہی و بربادی بن کے ٹوٹ سکتا تھا۔ شہباز کی موت بھی بن سکتا تھا۔ اور زوبیہ کے والدین کی تباہی بھی۔

اور اب دس بجے کی طرف گھڑی کی سوئیاں اپنی مخصوص رفتار سے بڑھ رہی تھیں۔ چپ چاپ۔ بڑے سکون اور بڑے اعتماد سے دس بجنا ہی تھے نا۔

دس بجنے میں پانچ چھ منٹ باقی تھے۔ زوبیہ نے نگاہ گھڑی پہ ڈالی تو تڑپ کر بیڈ سے اٹھی اور دوڑ کر شہباز سے لپٹ گئی۔ خوفزدہ اور سہمی ہوئی بولی "شہباز۔ شہباز دس بجنے والے ہیں۔ آؤ اس وقت کی قید سے کہیں دور بھاگ جائیں۔"

شہباز نے اسے بازوؤں میں جکڑ کر پیار کیا اور پھر بولا "ہمت نہیں ہارو زوبی۔ خان بابا

کے حکم کی تعمیل مجھے کرنا پڑے گی۔ نہیں تو۔ نہیں تو۔ اُف خدایا۔ تم خان بابا کو نہیں جانتیں۔"

"تمہیں نہیں مار سکتے شہباز۔ ایک باپ ہو کر بیٹے کے خون؟"

"زوبیہ یہ کرنا ان کے لیے مشکل نہیں۔ وہ بہت سخت، بڑے جذباتی اور جوشیلے آدمی ہیں انتقام لینے سے کبھی نہیں چوکتے ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔"

زوبیہ اس کی بانہوں سے نکلتے ہوئے سنگین پتھریلے لہجے میں بولی "تو تم ان کے سامنے جھک جاؤ گے؟"

وہ چند لمحے چپ رہا۔

"زری سے شادی کر لو گے؟"

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر کرب و اذیت سے ہونٹ کاٹتے ہوئے زوبیہ کو دیکھا۔ زوبیہ نے پتھریلے لہجے میں کہا "تم ایسا ہی کرو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں زوبیہ۔ یہ شادی برائے نام ہوگی۔ صرف اس لیے ہوگی کہ خان بابا کی بات رہ جائے۔ خاندان میں کوئی مشکل پیدا نہ ہو۔ شاہینہ زرگل کی ہو جائے۔ تعلقات ٹھیک ہو جائیں۔"

"ہوں۔"

"میں شادی کر کے زری کو وہیں چھوڑ آؤں گا۔ اس کا سایہ بھی تم پر پڑنے نہیں دوں گا۔ زوبیہ تھوڑی سی ہمت کرو۔ میں۔ آگ و خون کے دریا میں نہیں کودنا چاہتا۔"

وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

اور پھر دس بج ہی گئے۔

اس نے بابا سے کہہ دیا کہ وہ پشاور آجائے گا اور زری سے شادی کرے گا۔

وہ جانے اور کیا کچھ کہتا رہا۔ زوبیہ کے لیے کون کون سی مراعات مانگتا رہا۔ زوبیہ تو صوفے پر گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

جس دن وہ پشاور جا رہا تھا۔ وہ بھی دیدنی تھا۔ ممی ڈیڈی اور مانی تو حیران و پریشان تھے ہی۔ زوبیہ کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ ویسے بھی اک ننھا سا وجود اس کے اندر تخلیق کے عمل سے گزر رہا تھا۔ یہ خرابیٔ طبع اپنی جگہ۔ اس نے تو اس وجود کے ہونے کی خوشخبری بھی ابھی شہباز کو نہ سنائی تھی۔ افتاد یوں آن پڑی تھی کہ صدمے اور غم نے بالکل ہی نڈھال کر دیا تھا۔

شہباز اسے تسلیاں اور وعدے دیے جا رہا تھا۔ جیسے جیسے بن پڑتا تھا تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں جلد لوٹ آؤں گا۔ زوبیہ۔ میں اپنی زبان سے پھر نہیں سکتا۔ آزما کر تو دیکھو۔"

اس نے اسے الگ کرتے ہوئے آخری بار کہا۔ تو زوبیہ نے دھندلائی آنکھوں اور بھرائی آواز میں کہا۔" شہباز۔ میں اکیلی نہیں ہوں۔ تمہاری امانت میرے پاس ہے۔"

"امانت؟"

"ہاں۔ تم زری ہی کے ہو کر رہ گئے۔ تو میں اس امانت کے سہارے جی لوں گی۔"

"یعنی۔ یعنی۔ تم میرے بچے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ شہباز بے اختیار ہو گیا اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ نم آلود آنکھوں سے اسے دیکھا اور بولا۔" یہ خوشخبری۔ کس وقت سنائی ہے زوبیہ۔ لیکن خیر۔ اب تو ہمارے بندھن کی یہ زنجیر بن گئی ہے۔ اب تو حوصلہ کرو۔ اس زنجیر کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ خان بابا بھی۔ نہیں۔"

وہ بچھڑ کر چلا آیا۔

گھر میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ وہ ہونا ضروری بھی تھا۔ بغاوت کی سزا تو ملنا چاہیئے تھی۔ وہ سب کچھ بڑے تحمل اور خاموشی سے سہہ گیا۔ زوبیہ سے چھٹکارا دلانے کی بھی کوشش کی گئی۔ لیکن ایسا کرنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔

گھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بی بی جان اور شاہینہ بے طرح مصروف تھیں۔

نوکر چاکر سبھی بھاگ دوڑ میں لگے تھے۔

شہباز اک تماشائی کی حیثیت سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بت بنا پھرتا تھا۔ اسے کوئی شوق نہ تھا نہ دلچسپی وہ تو صرف خاندان کو دشمنی کی آگ سے بچانے کے لیے زری کو بیاہ کر لانے کو تیار ہوا تھا۔

شادیاں ہو گئیں۔ پہلے زرگل شاہینہ کو بیاہنے آیا۔

پھر شہباز، زری کا ڈولہ گھر لے آیا۔

خاندان کی عزت اور روایات کا وقار قائم رہا۔ خان بابا نے بھائی کو دی ہوئی زبان اور وعدہ پورا کر دیا تھا۔

حجلۂ عروسی بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا۔ روشنیوں اور خوشبوؤں سے کمرہ مہک رہا تھا۔ خوبصورت بیڈ پر دلہن بیٹھی تھی۔ اس نے بیش قیمت لباس پہن رکھا تھا ہیرے موتیوں سے بھی تھی۔ پھولوں سے لدی تھی۔ وہ گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی تھی۔

شہباز ذہنی اذیت سے دوچار تھا۔ زری سے اب محبت نہ سہی کبھی تو تھی۔ اور پھر ۔ پھر یہ لڑکی ۔ یہ معصوم اور بے گناہ لڑکی محبت کے آستانے پر یونہی قربان ہو رہی تھی۔ اس لڑکی سے اس نے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا۔ اسے چھونا تک نہیں تھا۔ اس کے ارمانوں کو چکنا چور کر چکا تھا۔ رہی سہی کسر آج نکالنا تھی۔ اس کا ضمیر اسے پریشان کر رہا تھا۔ شاہینہ اور دوسری خواتین اسے حجلۂ عروسی کی طرف کھینچے لیے جا رہی تھیں اور وہ پریشان پریشان سوچ رہا تھا کہ زری سے کیا بات کرے گا۔ کیوں کر اس کا گھونگھٹ اٹھے گا۔

وہ کمرے میں آیا۔

تو نگاہ بیڈ پر گئی۔

وہاں زری بیٹھی تھی۔

لیکن پتھرائی پتھرائی ۔ نہ اس نے گھونگھٹ نکالا ہوا تھا۔ نہ ہی چہرے پر حیا آلود

تبسّم اور بھیگی بھیگی سرخیاں لہرا... رہی تھیں۔

وہ چند لمحے کھڑا رہا۔ زری نے اس پر اک بھرپور نگاہ ڈالی۔ وہ کانپ گیا۔ معذرت کرنے کو لفظوں نے شکل تو اختیار کی۔ لیکن آواز نہ پائی۔

زری خود ہی بیڈ سے اتر آئی۔ اس کے عین سامنے آتے ہوئے بولی: "شہباز — یہ شادی تم نے شادی کی نیت سے نہیں کی۔ تم اس خون خرابے سے ڈر گئے۔ جو یہ شادی نہ ہونے کی صورت میں ہونا تھا۔"

وہ چند لمحے رکی شہباز کو سپاٹ نظروں سے دیکھا۔ وہ ان نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ سر جھکاتے ہوئے آہستگی سے بولا: "میں شرمندہ ہوں زری۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے رخ قدسے دائیں جانب گھماتے ہوئے کہا۔ "شادی میں نے نبھاہ کرنے کے لیے نہیں کی۔ تمہاری طرح میں بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ خاندان الگ ہو کر دشمنی کی ایسی راہ پر گامزن ہو جائیں۔ جو کہیں ختم نہیں ہوتی۔ صدیاں اور نسلیں اس کی زد میں اگر تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔"

وہ خاموشی سے سر جھکائے نادم نادم سا کھڑا رہا۔ زری نے بغیر اس کی طرف دیکھے آہستگی سے کہا۔

"دوسرے میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہاری غلطی کی سزا زرگل لالہ اور شاہینہ بھگتیں۔ وہ ایک دوسرے کو لوٹ کر چاہتے ہیں اور چاہتیں بکھر جائیں۔ شاید اس سے بڑی زیادتی اور کوئی نہیں۔"

شہباز نے نگاہ اٹھائی وزدیدہ سی نگاہ زری پر ڈالی۔ زری کی سبزی مائل نیلگوں آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

شہباز سرتاپا کانپ رہا تھا۔ کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ اس وقت وہ زوبیہ کو بھول کر صرف اور صرف زری کو تک رہا تھا۔

"شہباز" زری نے سر جھکایا۔ پھر آہستہ آہستہ سر اٹھاتے ہوئے بولی: "ہماری یہ نمائشی شادی۔ آج ہی ختم ہو جانی چاہیے۔"

"زری" شہباز بے اختیارانہ چیخا۔ اور محبوبانہ انداز میں اس کی طرف لپکا۔ لیکن

زری نے ہاتھ بڑھا کر اسے قریب آنے سے روک دیا۔ "نہیں۔ شہباز۔ وہیں کھڑے رہو۔ کسی جذباتی کمزوری کا شکار ہونے کی گنجائش نہیں۔ بھلا یہ رشتہ آج اور ابھی منسوخ ہو جانا چاہیئے۔"

"زر۔ ی"

"جو بندھن بندھا ہی نہیں اسے توڑ دینا مشکل نہیں۔ تم مجھے طلاق دے دو۔"

"زری" شہباز گہری گہری سرخ سرخ آنکھوں سے اسے تکتے ہوئے بے صبری سے بولا "جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو۔ سوچا بھی ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔"

"سب کچھ سوچ لیا ہے شہباز۔ نتیجہ بُرا اس لیے بھی نہیں ہو گا کہ طلاق کا راز ہمارے سینوں میں دفن رہے گا۔ یہ بھی صرف خاندان کی آن بان روایات اور بہتری کی خاطر۔ مجھے یقین ہے۔ تم تعاون کرو گے۔"

"لیکن زری۔ زندگی کا سفر طویل ہے یوں اکیلے مسافتیں طے کر لو گی۔"

وہ تلخ سی ہنسی ہنسی۔ شہباز نادم ہو گیا۔

زری بولی "مسافتیں تو مجھے تنہا ہی طے کرنی ہیں۔ طلاق ہو یا نہ ہو۔ میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ تم اپنی بیوی کے وفادار نہ رہو۔ تمہیں اس سے کچھ چھپانا پڑے۔ اسے دھوکے میں رکھنا پڑے۔ میں تمہارے لیے آزمائش بھی نہیں بننا چاہتی۔ کہ جب تم اپنے اس گھر آؤ۔ تو۔ تو میں۔ میں۔"

شہباز نے اک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ زری کے اندر جو ٹوٹ پھوٹ ہو

رہی تھی۔ اس سے چھپی نہ تھی وہ اس بہادر لڑکی سے مرعوب ہو رہا تھا۔ جو اپنا آپ لٹا کر اس کے لیے زندگی سہل بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"شہباز۔" زری نے آہستگی سے کہا۔ "زندگی کی راہ بڑی طویل ہے۔ لیکن دُکھ میں اسے مختصر کرنے کی کبھی کوشش نہیں کروں گی۔ تم اطمینان سے اپنی زندگی کی طرف لوٹ جانا۔ خاندان مصائب سے بچ گیا ہے۔ زرگل لالہ نے اپنی منزل پالی ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے میں اس خوشی کے سہارے جی لوں گی۔

یہ گھر میرے چچا کا گھر ہے۔ اس گھر میں مجھے طلاق پاکر بھی رہنے کا حق ہے۔ تم نے اس راز کو راز رکھا تو کوئی اُلجھن پیدا نہیں ہو گی۔ سب۔ ٹھیک۔ رہے گا۔ سب۔"

"زری۔" وہ بے اختیاری سے چیخا۔

لیکن زری نے اس بے اختیاری کو اختیاری جانا۔ اسی لیے ثابت قدمی سے اپنی بات پر قائم رہی۔ آخر شہباز نے اس سے تین بار طلاق کا لفظ کہلوا ہی لیا۔

پھر وہ شہباز کی طرف دیکھے بغیر اس کے کمرے سے نکل کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔

شہباز لٹا لٹا سا کھڑا رہا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ زری کے اس فیصلے نے اسے آزاد کر دیا ہے یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سلگتی آگ کی بھٹی میں ڈال کر کبھی نہ ختم ہونے والی سزا دے دی ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والی سزا۔

ضمیر کی سلگتی آگ کی بھٹی میں ڈال کر۔

کایا پلٹ

وہ باتھ روم میں شیو بنا رہا تھا۔ تولیہ کندھے پر تھا اور چہرے پر شیونگ کریم لگا رکھی تھی۔ آئینے میں دیکھتے ہوئے وہ اپنے گال پر ریزر چلا رہا تھا۔ کہ اچانک ہی ببلو کے زور زور سے چیخنے اور رونے کی آواز آئی۔ وہ ریزر وہیں پھینک کر جلدی سے باتھ روم سے نکلا اور کچن کی طرف لپک کر آیا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ زیبی، ببلو کو پیٹ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چمٹا تھا۔ اور اڑھائی سالہ سُرخ و سپید گول مٹول سا ببلو چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ اس کی ناک بہہ رہی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ اس کے بال زیبی نے مٹھی میں بھر رکھے تھے۔ وہ اس کا سر جھٹک جھٹک کر دوسرے ہاتھ میں پکڑے چمٹے سے بڑے وحشیانہ انداز میں پیٹے جا رہی تھی۔

"زیبی۔" وہ یہ منظر برداشت نہ کر پایا۔ اتنے زور سے چیخا کہ لگا در و دیوار ہل گئے ہیں۔ ایک لمحے کو زیبی بھی ڈر گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں خون سا اُتر آیا۔ اس نے پوری قوت سے چمٹا لہرایا لیکن ببلو کے لگنے سے پہلے ہی عمر نے اس کی کلائی پکڑ کر زور سے مروڑ ڈالی۔ چمٹا ہاتھ سے گر گیا۔ عمر نے اُسے دھکا دے کر پرے ہٹایا۔ وہ کچن کی کیبنٹ سے ٹکرائی۔

عمر نے ببلو کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگاتے ہوئے کندھے پر پڑے تولیے سے اس کا چہرہ پونچھا اور خشمناک نظروں سے زیبی کو گھورتے ہوئے بولا۔ "آئندہ تم نے اسے ہاتھ بھی لگایا۔ تو ہاتھ توڑ دوں گا۔"

"میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" وہ چلائی۔

"میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔" وہ اس سے بھی زیادہ زور سے چیخا۔ "بالکل پاگل ہی ہو جاتی ہو۔" وہ ببلو کو پیار کرتے ہوئے کچن سے نکل آیا۔ زیبی نے گلاس، پلیٹیں جو کچھ سامنے پڑا تھا غصے اور وحشیانہ پن سے توڑ ڈالے۔

عمر بکتا جھکتا اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ اس نے بچے کے گال پہ ہاتھ پھیرا اور بڑی محبت سے اس کا منہ، سر، ماتھا چومنے لگا۔

بچہ اب بھی بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ہچکیاں اس کے اندر ٹوٹ رہی تھیں اور اس کے معصوم وجود کو جھٹکے لگ رہے تھے۔

"بس، بس میرا بیٹا۔" عمر نے بچے کو بیڈ پہ بٹھا کر گلے میں پڑا تولیہ اتارا اور ببلو کا منہ ٹھیک سے پونچھنے لگا۔ وہ بے بسی سے بڑبڑا رہا تھا۔ میری غلطی کی سزا تو بھگت رہا ہے میرے بچے! بس، بس چپ ہو جا میری جان۔"

بچے نے چیخنا تو بند کر دیا تھا۔ لیکن اب بھی روئے جا رہا تھا۔ عمر اسے پیار کرنے اور چمکارنے لگا۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑی تصویر اس کو دی۔ اپنی گھڑی تکیے کے نیچے سے نکال کر اس کی کلائی پہ باندھی۔ ساتھ ساتھ وہ اس سے باتیں بھی کرتا گیا۔ بچہ بہل رہا تھا۔ لیکن ہچکیاں اب بھی لے رہا تھا۔

کتنا خوبصورت، کتنا پیارا، سرخ و سپید گول مٹول سا بچہ تھا۔ سیاہ بال اور بڑی بڑی کالی آنکھیں۔ ابھرے ابھرے سرخ ریشمی بے داغ گالوں میں دھنسی ہوئی چھوٹی سی ناک۔ سرخ ہونٹ، کپا سے ہاتھ۔ موٹی موٹی ٹانگیں۔ عمر اس کے ایک ایک عضو کو چومتے ہوئے زیبی کی سفاکی اور بے رحمی پہ کڑھ رہا تھا۔ فرشتوں کا سا تقدس تھا بچے کے چہرے پہ۔ پھولوں کی سی مہک آتی تھی اس سے۔ پھر بھی زیبی جلاد بن جاتی تھی۔

یہ پہلی بار نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی بچے کے وحشیانہ پن سے پٹنے کا نظارہ وہ کر

چکا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن زیبی کو بچے سے نفرت کا دورہ سا پڑتا تھا۔ اور وہ کسی معمولی سی بات کا سہارا لے کر اسے دھنک ڈالتی تھی۔ بچہ تو مار پیٹ کے بعد عمر کا پیار پا کر چپ ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ اذیت کے تازیانے اپنے دل و دماغ پر مسلسل برستے محسوس کرتا۔ کرب کی محرابوں تلے سے گزرتے اس کی حالت دگرگوں ہو جاتی۔ وہ اتنا دکھی ہو جاتا کہ رواں رواں درد کی ناقابل برداشت کیفیت سے دوچار ہو جاتا۔ وہ سمجھ نہ پاتا کہ کیا کرے۔ اس نے سچ بولا تھا۔ اور یہ اس سچ کی سزا تھی۔ جو معصوم بچہ اور وہ خود بھگت رہا تھا۔

وہ اکثر سوچتا کہ سچ بولنا کیا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی کڑی سزا ملے۔ اس کا سچائی پر سے اعتماد اٹھتا جا رہا تھا۔ لیکن کبھی کبھی اسے زیبی پہ ترس بھی آجاتا۔ وہ اسے حق بجانب سمجھنے لگتا سچ تاخیر سے بولا جائے تو شاید جھوٹ کی بدترین شکل بن جاتا ہے۔ اس نے بہت دیر کر دی تھی۔ اس دیر نے زیبی اور اس کے درمیان اعتماد کی جو دیوار تھی، وہ ڈھا دی تھی۔ اس گری دیوار کے ملبے تلے وہ دب گئی تھی۔ زخمی ہو گئی تھی۔ چور چور ہو گئی تھی۔

عمر بچے کو سینے سے لگائے چپ کرانے کی کوشش کرتے ہوئے سوچوں میں گم ہوا جا رہا تھا۔ جو ہو چکا تھا اسے لوٹانے پر قادر نہیں تھا۔ لیکن مستقبل کے لیے تو کوئی لائحہ عمل مرتب کیا جا سکتا تھا۔ زیبی اسی طرح سفاکی اور درندگی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ تو کیا خبر کسی وقت غصے اور جوش میں وہ بھی کوئی کارروائی کر بیٹھے۔ اس کے ہاتھ ہی توڑ ڈالے یا اس کا گلا ہی دبا دے۔

اس نے بچے کو بیڈ پہ بٹھا دیا۔ سائیڈ ٹیبل پہ پڑی تصویر اس کے سامنے رکھ دی گھڑی تکیے تلے سے نکال کر اس کے ہاتھ پہ باندھی۔ اس کے کاٹ سے چوں چوں کرنے والی چڑیا اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ رنگین بال ہاتھ میں پکڑا ئی۔ بچہ کھلونوں سے بہلنے لگا۔ وہ اب چپ تو ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی ہچکیاں اس کے اندر وقفے وقفے سے اب بھی ٹوٹ رہی تھیں۔

عمر بیڈ پر بچے کے قریب ہی چت پڑ گیا۔ اس کے دماغ کی نسیں سنسنا رہی تھیں۔ جسم بے جان سا ہو رہا تھا۔ سوچ کے زاویے بن بن کے بگڑ رہے تھے۔

زیبی ایسی تو نہیں تھی۔ کبھی بھی نہیں تھی۔ اس کے سینے میں تو ممتا کے طوفان چھپے تھے وہ تو بچوں کی دیوانی تھی، بچپن ہی سے بچوں سے پیار کرتی چلی آئی تھی۔ وہ۔ تو پیدائشی ماں تھی

عمر اور وہ چچا زاد تھے۔ ایک ہی حویلی میں پلے بڑھے تھے۔ دونوں میں شروع ہی سے بڑا پیار تھا۔ ملنے کی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ساتھ کھیلتے، لڑتے جھگڑتے، پیار کرتے وقت گزر رہا تھا۔ دونوں میں پیار بھی بہت تھا۔ لڑائی بھی بہت تھی۔ کچھ باتیں عمر کو اچھی نہ لگتی تھیں۔ کچھ زیبی کو۔ جب ٹکراؤ ہو جاتا دونوں ہی لڑ پڑتے۔ لڑتے بھی اس طرح کہ بڑوں کو بیچ بچاؤ کے لیے آنا پڑتا۔

زیبی کو شروع ہی سے ننھے منے بچوں سے پیار تھا۔ بڑی بھابی بازار جاتیں۔ تو منا اس کے حوالے کر جاتیں۔ چھوٹی آپا کا راجو تو سدا ہی اُس کے پاس رہتا۔ چھوٹی آپا کی مینا بھی زیبی کو بہت اچھی لگتی۔ جب بھی وہ میکے آتیں۔ زیبی مینا کا دودھ بنانے، ڈائپر بدلنے کا ذمہ لے لیتی۔ پیارے پیارے بچوں میں تو اُس کی جان ہوتی تھی۔

اور اسی بات سے عمر کو چڑ ہوتی۔ وہ اُسے کھیلنے کے لیے بلاتا: "زیبی آؤ نا — آج ہم سب کرکٹ کھیلیں گے۔"

"لیکن مینا کو کون اٹھائے گا۔"

"پھینکو اسے۔"

"ہائے اللہ۔ دیکھو تو کتنی پیاری ہے۔ جاؤ بابا، میں نہیں کھیلتی۔ تم راشد اصغر اور نبیلہ کے ساتھ کھیلو۔ میں نے ابھی اس کی بوتل دھونی ہے۔ دودھ کا وقت ہو رہا ہے"

"تم اس کی آیا ہو۔"؟

"واہ جی۔ آیا ہی یہ کام کرتی ہے۔"

"تو پھر اس کی اماں ہو۔!"

"بکواس بند کرو۔ بنا سوچے سمجھے منہ سے باتیں نکال دیتے ہو۔ خبردار جو ایسی بات پھر کبھی کی تو۔"

"تو کیا کر لوگی۔ بچے کھلانا کیوں نہیں چھوڑتیں تم۔ نوکرانی بنی رہتی ہو سب کی۔"

"عمر، میں تمہیں ماروں گی۔"

"ہاتھ اٹھا کر تو دیکھو۔ مینا کو فرش پر نہ پٹخ دیا تو عمر نام نہیں۔"

"بڑے آئے مینا کو پٹخنے والے۔"

اسی بات پر دونوں اُلجھ پڑتے۔ ہاتھا پائی پر اُتر آتے۔ کبھی کبھی تو دونوں کے درمیان بچہ آ کر پِٹ جاتا۔ شور شرابا مچ جاتا۔ بچے کی ماں دوڑی آتی۔ دونوں کو الگ کر کے بچے کو لینے کی کوشش کرتی۔ لیکن زیبی بچے کو الگ کندھے سے لگا کر تھپکتے ہوئے خونخوار نظروں سے عمر کو دیکھے جاتی۔

عمر چاہتا تھا زیبی زیادہ سے زیادہ وقت اُسے دیا کرے۔ اُس کے ساتھ کھیلا کرے کھایا پیا کرے۔ اسکول کا کام کیا کرے۔ جب وہ ایسا نہ کرتی تو عمر جان بوجھ کر اپنی دوسری ہم عمر لڑکیوں سے گھل مل کر کھیلتا۔ زیبی کو نظر انداز کرتا۔ زیبی کو یہ بات بہت بُری لگتی وہ غصے سے پیچ و تاب کھاتی۔ اُن کزنوں سے لڑ پڑتی۔ جو عمر کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھیں عمر کو بھی خوب کوسنے دیتی۔ اور پھر منہ پھیلائے گھومتی پھرتی۔ عمر کو اپنا غصہ دکھلانے کی کوشش کرتی رہتی۔ غصہ عمر کا دیرپا ہوتا نہ زیبی کا۔ دونوں جلد ہی گھل مل بھی جاتے زیبی ہوم ورک لے کر اس کے پاس آ بیٹھتی۔ وہ اس کا بہت سا کام خود کر دیتا۔ کھانا بھی دونوں اکٹھے ہی کھاتے۔ کبھی زیبی اُن کی میز پر جا بیٹھتی اور کبھی عمر کے اُن کے دسترخوان پر آ بیٹھتا۔

وقت پر لگا کر اُڑتا چلا جا رہا تھا۔ دونوں جوان ہو گئے تھے۔ والدین نے دونوں کی پسند اور پیار کو دیکھ کر انھیں ازدواجی بندھن میں باندھنے کا فیصلہ بھی کر دیا تھا۔ عمر انجنیئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ اور زیبی سیکنڈ ائیر میں۔ جب دونوں کی باقاعدہ منگنی کر دی گئی تھی۔ دونوں اس بندھن سے بہت خوش تھے۔

"زیبی۔" عمر اُسے اکثر چھیڑتا۔

"کیا ہے۔"

"تم پر ظلم تو نہیں ہوا۔"

"کیسا؟"

"میرے پلے ہمیشہ کے لیے بندھنے کا۔"

"ہم اپنی کہو۔"

"مجھ پر تو خاصا ظلم کیا ہے ان بزرگوں نے۔"

"تو پھر انکار کر دونا۔"

"تمہارا خیال آجاتا ہے۔ انکار کیا تو رو رو کر مر جاؤ گی۔"

"بالکل نہیں مروں گی۔"

"اچھا ایک بات تمہیں ماننا ہو گی۔"

"کیا؟"

"یہ بچے کھلانا چھوڑ دو۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ جب اپنے بچے ...."

"ہائے اللہ۔ کتنے خراب ہو تم۔"

"کیسے؟"

"عادت نہیں گئی نا تمہاری بھی۔"

"کونسی؟"

"لڑکیوں کو تاکنے جھانکنے کی۔"

"یہ تو اپنی ہوبی ہے۔ میرے تمہارے پیار میں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"تو سمجھ لو کہ ننھے منّے پیارے پیارے بچوں کو کھلانا بھی میری ہوبی ہے۔ اس سے میرے تمہارے۔"

"پوری بات کرو نا۔"

"ہٹو بھی۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ زیبی بھی ہنس پڑتی۔

یوں ہنستے کھیلتے دن گذر رہے تھے۔ عمر عیاش تو نہیں لیکن کچھ دل پھینک قسم کا نوجوان ضرور تھا۔ جہاں کہیں جوان لڑکی دیکھی۔ نظر ٹک گئی۔ فلرٹ کرنا خوب جانتا تھا۔ محبت وحبت کا تو قائل نہیں تھا۔ اس لیے کہ اسے محبت صرف اور صرف زیبی سے تھی۔ خوبصورت اور اسمارٹ سی زیبی تو اپنی تھی ہی۔ زیبی اس کی اس عادت کو جانتی تھی۔ کبھی کبھی بُرا بھی مان جاتی۔

سلمیٰ آپا کی چھوٹی نند کی شادی پر جانے کہاں سے ڈھیروں جوان لڑکیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ خوش شکل، خوش لباس۔ خوش ذوق قسم کی لڑکیاں سلمیٰ آپا کے سسرال میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھیں۔ عمر کو تو خدا ایسا موقع دے۔ پریوں کے اکھاڑے میں راجہ اندر بننے کی اُسے بڑی خواہش ہوا کرتی تھی۔ اب تو جیسے اُس کی مراد بر آئی تھی۔ لڑکیاں لڑکے مل جل کر ہلّا گلّا کرتے ہیں۔ اس پر بھی کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی تو ایسے موقعے ملتے ہیں کہ ایک ہی گھر میں پورے کا پورا خاندان برادری اکٹھی ہو جائے۔ بزرگ اپنی محفل جما لیتے ہیں۔ عورتیں لباس اور زیورات کی نمائش میں لگ جاتی ہیں اور نوجوان

اپنی دنیا بسا لیتے ہیں۔ دو چار دن بڑے رنگین بڑے حسین گزر جاتے ہیں۔

سلمیٰ آپا کی نند کی شادی میں گھلنے ملنے کا موقع سب ہی کو ملا تھا۔ عمر نے تو اس موقع کو سنہری جانا تھا۔ خدا نے شکل و صورت اچھی دی تھی۔ قد کاٹھ کا بھی خوب تھا چرب زبانی زبانی میں ماہر۔ نظر بازی کا شوقین۔ لڑکیاں اس کے دام میں بنا چوگا ڈالے ہی چلی آتی تھیں۔

وہ بھی ان کی محفل میں برابر کا شریک تھا۔ کسی سے ہنسی مذاق کر رہا ہے۔ کسی کی تعریفیں کرتے زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔ کسی کو چپکے چپکے تلے جا رہا ہے۔ لڑکیوں کے حسین جھرمٹ میں ڈھولک لیے بیٹھا ہے۔ ماہیئے کے ٹپے سنا رہا ہے۔ تاک تاک کر نشانہ لگا رہا ہے۔

شادی کے ہنگامے اور ہلا گلا میں کئی لڑکیاں اس کے قریب آ گئیں۔

"عمر بھول تو نہیں جاؤ گے ہمیں۔"

"عمر تمہارے بغیر زندگی ایک دم سُونی ہو جائے گی۔"

"میرا تو یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔"

"اب پتہ نہیں کب ملنا ہو۔"

"تم ہمارے ہاں آیا کرو نا۔ آخر تو میری کے بھانجے ہو۔ دُور کے سہی۔"

"میرا رشتہ تو بہت قریب کا۔ امی ابو دونوں کے رشتے دار ہو۔"

"عمر یہ دن میری زندگی کا حاصل ہیں۔"

"مجھے تو رونا آ رہا ہے واپس گھر جاتے ہوئے۔"

"میں تمہیں پسند ہوں نا!"

"میری آنکھوں کی تم نے اتنی تعریف کی ہے کہ جی چاہتا ہے آئینے میں ہر وقت اپنی آنکھیں ہی دیکھتی رہوں۔"

"ہائے اللہ! پلک جھپکتے میں چار دن گزر گئے۔ ہم آج واپس جا رہے ہیں عمر۔"

"میں تمہیں کیسے بھلا سکوں گی عمر۔ تم میری رُوح میں سما گئے ہو۔"

ہر لڑکی عمر سے جُدا ہوتے وقت اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ کنول اور نجّو تو رو بھی پڑی تھیں۔ بڑی دل گرفتہ تھیں۔

زیبی جانتی تھی کہ عمر کسی کے متعلق بھی سنجیدہ نہیں۔ پھر بھی اُسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ شادی کے یہ چار دن اُس نے بڑی کوفت اور ذہنی اذیت میں مبتلا رہ کر گزارے تھے۔ عمر بھی تو ان لڑکیوں کے حسین جھرمٹ میں یوں غائب ہوا تھا کہ زیبی کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ زیبی نے عمر کی پسند کے کپڑے پہنے تھے۔ لیکن اُسے ایک بار بھی اُن کی تعریف کرنے کا موقع نصیب نہ ہوا تھا۔ زیبی اسی لیے تو اس سے روٹھ گئی تھی۔

شادی کا ہنگامہ ختم ہوا۔ مہمان چلے گئے۔ عمر اور زیبی بھی اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ گھروں کو واپس لوٹ آئے تو زیبی منہ پھلائے پھرتی رہی۔

"اے!" عمر کو جیسے اب اُس کا خیال آیا۔

"کیا ہے؟" وہ درشتی سے بولی۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"کچھ نہیں۔"

"یہ موڈ کیوں آف ہے؟"

"شکر ہے! تمہیں یہ جاننے کی فرصت تو ملی۔"

عمر نے قہقہہ لگایا۔ زیبی کو غور سے تکتے ہوئے بولا۔ "ناراض ہو؟"

"میں کیوں ناراض ہونے لگی۔"

"جل بھُن گئیں نا۔"

"جی۔ نہیں۔"

"وہ بیر الڑکیوں سے گھلنا ملنا تمہیں اچھا نہیں لگا۔"

"میں کون ہوتی ہوں تمہیں۔ روکنے والی۔" زیبی کی آواز بھر آ گئی۔ دوسرے لمحے وہ منہ

ہاتھوں میں چھپا کر اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

"اوہو۔ ہو۔ سوری زیبی" عمر جلدی سے بولا۔ وہ رونے لگی۔ عمر اسے بہلانے پھسلانے لگا۔ اس نے اپنے رویے کی کئی بار معافی مانگی۔

"مجھے تمہاری یہ عادت زہر لگتی ہے"۔ زیبی دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"کیا کروں۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ لیکن زیبی۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے نا، وقتی ہوتا ہے۔ اب دیکھو نا، سب لڑکیاں چلی گئیں۔ قسم لے لو۔ جو مجھے کسی ایک کا نام بھی یاد ہو"۔

"فلرٹ کہیں کے"۔

"تمہیں فلرٹ نہیں کرنا کم از کم"۔

"کیا پتہ!"

"بکواس بند کرو"۔

"عمر"۔

"میرے جذبات کو ایسی باتوں سے ٹھیس نہ پہنچایا کرو۔ جانتی ہو مجھے اچھی طرح"۔

زیبی مرعوب و متاثر ہو کر اسے تکنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

وقت کا چکر چلتا گیا۔ ہر گھاؤ دونوں کو قریب لاتا گیا۔ زیبی، عمر کی اس خامی کی عادی ہو گئی تھی اور عمر زیبی کی بچوں کی آیا گیری کرنے سے مانوس ہو گیا تھا۔

"زیبی"۔ ایک دن اس نے زیبی سے کہا۔

"ہوں!"

"میں پاس ہو جاؤں گا تو تم مجھے کیا تحفہ دو گی!"

وہ ہنس کر بولی "اپنی دو ایک حسین اسمارٹ سہیلیوں سے چند دن دوستی کرنے کی اجازت"۔

وہ کھکھلا کر ہنس پڑا۔ پھر اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھر کر بولا۔ "کیسی اچھی ہو تم"۔

"منہ دھو رکھیے۔ میں نے تو مذاق کیا ہے"

"اور میں نے بھی مذاق سمجھا ہے۔ جانتا ہوں اتنے دل گردے کی نہیں ہو تم"۔

"تمہیں سیدھا کر لوں گی"۔

"کب!"

"کب۔ کیا"۔

"شادی کے بعد نا!"۔

"یہ ساری عادتیں ایک دم چھوڑنا پڑیں گی، سمجھے جناب"۔

"یہ پابندی مت لگانا زیبی"۔

"کیوں؟"

"میں بھی پابندی لگا دوں گا"۔

"کس بات پہ"۔

"اس بات پہ کہ تمہارے دور و نزدیک کوئی شیر خوار بچہ نظر نہ آئے"۔

زیبی شرما لجا کر بولی۔ "ایسا تم نہیں کرو گے"۔

"کیوں نہیں کروں گا"۔

"اس لیے کہ شادی کے بعد۔ ہمارے۔ ہمارے اپنے بچے"۔

"اوں ہوں۔ قطعاً نہیں۔ اپنے بھی نہیں ہوں گے"۔

زیبی نے بے اختیارانہ اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ کر گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ "ایسی بری باتیں مت نکالو زبان سے"۔

وہ اس کے ہاتھ پر دانت سے ہولے سے کاٹتے ہوئے بولا۔ "تم بھی الٹی سیدھی پابندیاں لگانے کی باتیں نہ کیا کرو"۔

زیبی نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ عمر شوخ پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے ہنس پڑا۔
عمر نے امتحان پاس کر لیا۔
گھر میں خوب خوشی منائی گئی۔ تعلیم کا مرحلہ مکمل ہو گیا تھا۔ زیبی بھی بہت خوش تھی۔
اس نے ایک خوبصورت پل اوور اُسے دیا۔ اور یہ پل اوور اُس نے خود اُس کے لیے بڑی محنت اور نفاست سے تیار کیا تھا۔
عمر بہت خوش ہوا۔ "کہاں چھپ چھپ کر بناتی رہیں۔ میں نے تو ایک دن بھی تمہیں بناتی کرتے نہیں دیکھا۔"
"رات کو بناتی تھی۔ تم پہلے سے دیکھ لیتے تو اتنے خوش نہ ہوتے۔"
"واقعی!"
"پسند آیا؟"
وہ ہنس کر بولا: "تم پسند آ گئی ہو تو تمہاری ہر چیز بھی پسند ہے۔"
وہ فخر سے مسکرا دی۔
پھر اسی شام کو شرارت سوجھی۔ زیبی سے بولا۔ "زیبی۔"
"ہاں۔"
"بھئی تم نے مجھے پاس ہونے کا تحفہ دیا۔"
"تو پھر"۔
"تمہیں بھی تحفہ ملنا چاہیے۔"
"مجھے۔ مجھے کیوں!"
"تمہیں اس لیے کہ تمہارا منگیتر پاس ہوا ہے۔ منگیتر۔ جو نوکری ملتے ہی تمہارا شوہر نامدار بن جائے گا۔"
وہ خوش دلی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ "بڑی فراخدلی ہے، لائیے دیکھیے تحفہ۔ اس حوالے

سے میں تحفہ لینا کیوں نہ چاہوں گی۔"
"ابھی لاتا ہوں۔ دیکھ کر خوش ہو جاؤ گی۔"
"لائیے۔"
عمر لپک کر گیا۔ اور زری بھابی کا تین دن کا منا جو ہلکے نیلے کمبل میں لپٹا تھا اُٹھا لایا۔
زیبی برآمدے کی سیڑھیوں پر گول ستون سے ٹیک لگائے بیٹھی شاید اس تحفے کے متعلق قیاس آرائیاں کر رہی تھی۔ جو عمر لینے گیا تھا۔
عمر ٹہلتے ہوئے چلتا ادھر آیا۔ اور زیبی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ پھر جھکا اور زیبی کی گود میں منا ڈال دیا۔
زیبی نے منے کو دیکھا پھر گردن گھما کر پیچھے نظر ڈالی۔ عمر ہنس رہا تھا۔
"یہ۔ یہ۔ اسے کیوں اُٹھا لائے۔ باہر سردی ہے۔ ابھی تین دن کا ہوا ہے بے چارہ" وہ بچے کو ساتھ چمٹا کر پیار کرتے ہوئے بولی۔
"تحفہ لایا ہوں تمہارے لیے"۔ وہ شوخی سے اُسے تکتے ہوئے ہنسا۔ "کیسا ہے؟"
"بہت پیارا، بہت اچھا"۔ زیبی نے بچے کے گلابی گال پر ہونٹ رکھتے ہوئے کہا۔
"جب تک ہماری شادی نہیں ہو جاتی نا۔ اس تحفے کو سینے سے لگائے رکھنا۔ آیا گیری کی تمہیں پوری آزادی اور اجازت ہے۔"
زیبی مسکراتے ہوئے شوخ نظروں سے اسے دیکھنے لگی پھر بولی "اللہ بچوں میں تو میری جان ہے عمر۔ تمہیں بتا نہیں سکتی کہ چھوٹے چھوٹے یہ معصوم اور مقدس بچے مجھے کتنے اچھے لگتے ہیں۔"
"لگتا ہے پیدائشی ماں ہو تم"۔ وہ تمسخر سے بولا۔
"ہر عورت پیدائشی ماں ہی ہوتی ہے عمر"۔ وہ بچے کو پیار سے سمیٹتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عمر بڑا متاثر ہوا۔ اُسے بڑی تعظیم سے تکنے لگا۔

عمر نے مکینیکل انجینئرنگ کی تھی۔ رزلٹ آتے ہی نوکری کی تلاش شروع کردی۔ جہاں کہیں خالی جگہ ہوتی وہ درخواست دے دیتا۔ بہت دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ پورا سوا سال اسی تگ و دو کی نظر ہوگیا۔ پھر آبا کے ایک ایم پی اے دوست کی وساطت سے اُسے واپڈا میں ایس ڈی او کی پوسٹ مل گئی۔

اِدھر نوکری ملی اُدھر شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

عمر ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سال دو سال کما کر کچھ اثاثہ بنا لینے کی خواہش تھی۔ زیبی اپنی ہی تو تھی۔ نہ وہ کہیں بھاگی جاتی تھی نہ وہ خود۔ اس نے اس بات کا اظہار امی سے کیا۔ "امی چار پیسے تو پاس ہو جائیں۔ شادی بھی کر لوں گا۔"

"تنخواہ کافی نہیں ہے کیا!"

"ناکافی ہی ہے۔ اتنے پیسوں میں ڈھنگ سے جیا جائے گا۔!"

"کیوں نہیں۔ کمی کس بات کی ہے۔ شروع شروع میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ گھر چلانا سیکھو گے اس طرح۔"

"امی نئی نئی نوکری ہے۔ چھوٹے چھوٹے شہروں میں رکھیں گے ابھی۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ چھوٹے شہروں میں گزر بسر آسانی سے ہو جاتی ہے۔ پھر پریشانی کی کیا بات ہے۔ ضرورت کی ہر چیز تمہیں جہیز کی صورت میں مل جائے گی۔ روپے پیسے کی تنگی بھی تمہیں نہیں ہوگی۔ ہم جو ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ بعد میں باتیں نہ بنایئے گا۔ ضرورت کے وقت آجایا کریں گے آپ سے پیسے مانگنے۔"

"شادی تو ہو لینے دے۔ سارے طریقے سلیقے آجائیں گے خود ہی۔ زیبی بڑی سگھڑ اور سیانی بیٹی ہے۔"

"ہوں۔"

"فکر کی کوئی بات نہیں بیٹے۔ الگ گھر چلانے میں اگر دقت محسوس کرو گے۔ تو زیبی ہمارے پاس ہی رہا کرے گی۔"

"اوں ہوں۔ یہ بات غلط ہے امی۔ شادی کروں گا تو زیبی میرے ساتھ ہی رہے گی۔"

"تیری خوشی۔ میں تو یونہی بات کر رہی تھی۔ یہ گھر تمہارا اپنا ہے۔ کوشش کرنا تمہاری پوسٹنگ یہاں ہی ہو جائے۔ اپنے گھر میں رہنے سے سو طرح کی بچت ہوتی ہے۔"

"مشکلوں سے نوکری ملی ہے امی۔ جہاں محکمے والے رکھیں گے۔ وہیں رہنا ہوگا۔ شاید مجھے کچھ عرصہ خوشاب میں رہنا پڑے۔ پھر سرگودھا۔"

"چلو جہاں بھی رہو خوش رہو۔ شادی التواء میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ تیرے چچا چچی اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ اب تو زیبی نے بھی بی اے کر لیا ہے۔ گھر تو نہیں بٹھائے رکھنا اُسے۔ اُن کی اور بھی بچیاں ہیں۔"

امی نے اُسے سمجھا بجھا کر اُسے راضی کر لیا۔ راضی تو وہ تھا ہی صرف یہی چاہتا تھا کہ مالی طور پر اپنے آپ کو کچھ مستحکم کر لے۔

امی کے خیال سے متفق ہو کر وہ زیبی کے پاس آیا۔ زیبی ان دنوں اس سے بہت شرمانے لجانے لگی تھی۔ کچھ تیاریوں میں لگی تھی۔ خریداری میں ماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ سلائی کی کئی چیزیں خود تیار کرنا تھیں۔ گھرر گھرر مشین چلاتی رہتی۔ دوپٹوں میں گوٹا پلّہ ٹانکتی رہتی۔ کئی کام سہیلیوں کے سپرد کیے تھے انہیں دینے لینے آتی جاتی رہتی۔ یوں عمر سے بہت کم آمنا سامنا ہوتا۔ عمر کی بھی نئی نئی نوکری تھی۔ خوب جُت کر کام کر رہا تھا۔ زیبی اپنی ہی تو تھی۔ اور اب تو مستقلاً اپنا ہو جانا تھا۔ اس لیے اُسے کترانے شرمانے کی چھٹی دے رکھی تھی۔

اُس دن وہ اُس کے کمرے میں چلا آیا۔ زیبی مشین پر گلابی رنگ کا پیٹی کوٹ سی رہی تھی۔ ارد گرد ریشمی رنگا رنگ کپڑے تہہ شدہ اور کھلے پڑے تھے۔ دس بارہ جوڑے درزی سے سل کر آئے تھے۔ رنگ ساز دوپٹے رنگ کر دے گیا تھا۔ ایک طرف لوہے کے دو بکس

پڑے تھے۔ دوسری طرف چمڑے کے سوٹ کیس رکھے تھے۔ جو چیزیں تیار ہو چکی تھیں وہ ان بکسوں اور سوٹ کیسوں میں رکھی جا رہی تھیں۔

"زیبی!" عمر کمرے میں آتے ہی زیبی کے گرد و پیش نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا درزی خانہ کھول رکھا ہے!"

زیبی نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ مشین کی ہتھی پہ ہاتھ رک گیا۔ شرمیلی ادا سے اُسے دیکھا۔

"یہ کیا بکھیڑا ڈال دیا ہے" وہ اس کے سامنے بکس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کیا!" زیبی بولی۔

"بہت جلدی ہے تمہیں شادی کی!"

زیبی نے شرمیلی ادا سے اُسے دیکھا۔

"کیا ڈاکر دوگی میرا"۔

وہ مسکرا کر بولی "کباڑا تو ہمارے والدین کا ہو رہا ہے!"

وہ اسے چھیڑنے کو بولا۔ "مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ تمہیں اتنی جلدی کس بات کی تھی!"

"مجھے!"

"ہاں تمہیں"

"تم!"

"بھئی شادی تو ہماری ہونا ہی تھی کیا حرج تھا جو دو چار سال بعد ہو جاتی"۔

زیبی نے حیرانی سے اُسے دیکھا۔

"حرج تھا کوئی؟" عمر نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

"ہاں تھا"۔

"کیا!"۔

"تم بالکل ہی مادر پدر آزاد ہو جاتے!"

وہ اُس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ زیبی مسکراتے ہوئے پلکیں جھپکانے لگی۔

"تو گویا تم میری آزادی پہ پابندی کی مُہر بن جاؤ گی!"

"بالکل!"

"بہت خوش ہو"۔

"تم نہیں ہو کیا!"۔

"ہوں تو۔ لیکن فکرمند بھی ہوں!"

"وہ کیوں!"

"زیبی۔ بات یہ ہے کہ میری تنخواہ جو ہے نا ابھی اتنی نہیں کہ۔۔۔"

زیبی ہنس پڑی: "ابھی سے فکر ستانے لگی!"

"فکر کی بات تو ہے ہی۔ کرائے کا گھر لینا پڑے گا۔ نوکر رکھنا پڑے گا۔ بجلی پانی کا خرچہ ہوگا۔ کھانے پینے۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔ تنخواہ تمہیں لا کر دے دیا کروں گا۔ تم جاننا اور تمہارا کام۔ پیسوں کے لیے لڑنا جھگڑنا نہیں مجھ سے۔ بڑی بھابی اور بھیا کی طرح سمجھیں۔ لڑائی جھگڑے سے میری جان جاتی ہے!"

وہ ہنسنے لگی۔ پھر بولی: "یہی کہنے آئے تھے۔؟"

"نہیں۔ آیا تو تمہیں دیکھنے تھا چھپتی تو پھرتی ہو مجھ سے!"

زیبی نے شرما کر سر جھکا لیا۔

"چند دنوں تک خوشاب جا رہا ہوں"۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولا۔

"واقعی!"۔

"ہاں۔ چھوٹی سی جگہ ہے رہ لو گی وہاں"۔

"جگہ چھوٹی ہو یا بڑی کیا فرق پڑتا ہے"۔

"سچ ؟"۔

"ہاں"۔

"تم بہت اچھی ہو زیبی۔"

"اب پتہ چلا"

عمر نے پیار سے بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ زیبی کے گالوں پر شفق پھوٹ پڑی۔

شادی کی گہما گہمی کئی دن رہی۔ عمر کی پوسٹنگ خوشاب ہو گئی تھی۔ شادی کے ہنگامے اور ہلا گلا میں شریک ہونے کی حسرت ہی رہی۔ چند دن کی چھٹی ملی تو وہ اُس نے شادی کے بعد ہنی مون منانے کے لیے سنبھال رکھی۔ مہندی کی رات وہ خوشاب سے گھر پہنچا۔

شادی بڑے چاؤ بڑے ریت ورواج سے ہوئی۔ دونوں طرف سے اچھے شگون کے لیے چھوٹی بڑی رسمیں ذوق وشوق سے ادا کی گئیں۔

زیبی نے باہر تو کہیں جانا نہیں تھا۔ حویلی کے ایک حصّے سے دوسرے حصّے میں دلہن بن کر آنا تھا۔ لیکن رافیہ چچی اور چھوٹی بڑی بھابیوں کا اصرار تھا کہ زیبی دلہن بن کر ڈولی میں ضرور بیٹھے۔ گھر کے مردوں کو یہ بات مضحکہ خیز لگتی تھی۔

لیکن عورتیں اسے بدشگونی قرار دے رہی تھیں۔ ڈولی کے بغیر دلہن کا تصور ہی ادھورا لگتا تھا۔ چنانچہ زیبی کو ڈولی میں بٹھایا گیا۔ گلی کا چکر لگا کر ڈولی سسرال کے دروازے پر آئی پھر دلہن اس دروازے پر اُتری۔ صدقے اتارے گئے پھول برسائے گئے۔ خوشبوئیں چھڑکی گئیں۔ پورے اہتمام کے ساتھ دلہن کو اندر لایا گیا۔ جہاں چھوٹی موٹی بے شمار رسمیں ہوئیں۔ خوشی ومسرت سے چہرے دمک رہے تھے۔ قہقہے اُبل رہے تھے۔ ہنسیوں کی مترنم پھوار برس رہی تھی۔ سب بہت خوش تھے۔ اس خوشی میں سب اتنے مگن تھے کہ کسی کو خیال تک نہیں آیا کہ دلہن بے چاری کی کمر تختہ ہو چکی ہوگی۔ گردن اکڑ گئی ہوگی۔ اور اس کا سواگت کرنے والا دلہا

انتظار کرتے کرتے تھک چکا ہوگا۔ حجلۂ عروسی میں رنگ ونور کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور خوشبوؤں کی مہک بھی جان لیوا انتظار سے شدت کھو رہی ہوگی۔

رات کا بہت سا خوبصورت حصہ رسموں کی نذر ہو گیا۔ جانے رات کا کونسا پہر تھا جو دلہن کی خلاصی ہوئی۔ اور سہاگنیں سہاگ گیت گاتے ہوئے اسے حجلۂ عروسی میں لے آئیں۔

زیبی سُرخ زرنگاری گٹھڑی بنی چھپرکھٹ پر بیٹھی تھی۔ کمرہ نیا تھا نہ عمر اجنبی پھر بھی دنیا بدل گئی تھی۔ عمر بھر کے دیکھتے ہوئے خواب تعبیر کے سانچوں میں ڈھل گئے تھے۔

خواب جو خوبصورت تھے۔ رنگا رنگ تھے۔ مکمل تھے۔

کچھ ایسی ہی کیفیت عمر کی تھی۔ لگتا تھا ادھوری زندگی کی آج تکمیل ہو گئی ہے۔

محبتوں نے عروج کو چھو لیا ہے۔ رفاقتیں قربتوں میں بدل گئی ہیں۔

دونوں خوش تھے بے انتہا خوش۔

دونوں شروع ہی سے ایک دوسرے کو چاہتے چلے آرہے تھے۔ لیکن یہ چاہتیں ڈھکی چھپی تھیں۔ آج ان چاہتوں کے اظہار ہو رہے تھے۔ محبتوں کے اقرار ہو رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے میں گم تھے۔

ولیمے کے بعد دونوں ہفتہ بھر کے لیے مری چلے گئے۔ مری کے سبزہ زاروں میں کوہساروں میں دونوں شاداں وفرحاں گھومتے پھرتے رہے۔ تنہائیاں یکجائیوں کے لیے سازگار تھیں۔

"زیبی"۔ اس دن جب بادل بہت نیچے جھک آئے تھے۔ اور اُن کا دھواں سا ہوٹل کے کمروں میں بھی گھس آیا تھا۔ بانہوں میں لپٹی زیبی سے عمر نے والہانہ انداز میں کہا۔

"ہوں"! وہ ہمہ سپردگی کے عالم میں تھی۔

"زیبی۔ ازدواجی زندگی کی ابتدا کتنی حسین ہے"!

"ہاں"

"خدا کرے یہ حسن سدا برقرار رہے"!

"یقیناً رہے گا۔"

"تم سدا سے مجھے اپنی لگتی تھیں۔ لیکن اپنی ہو جانے کا... احساس جتنا حسین ہے بتا نہیں سکتا۔ تم بھی ایسا ہی محسوس کرتی ہو نا؟"

"ہاں عمر"۔

دونوں خمارِ محبت میں سرشار باتیں کر رہے تھے۔

"زیبی!"

"ہاں!"

"اب تو تم سے ایک دن بھی جُدا ہونے کی ہمت نہیں۔"

"ہم جُدا ہوں گے ہی کیوں؟"۔

"میرے ساتھ ہی چلوگی نا خوشاب"۔

"ہاں!"

"چھوٹا سا گھر ملا ہے۔ رہ لوگی نا وہاں"۔

"مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے عمر چھوٹا سا گھر ہماری چھوٹی سی جنت ہوگی!"

"اس چھوٹی سی جنت میں ہم دونوں چہکتے پھریں گے،

"ہاں عمر"۔

"زیبی!"۔

"ہوں!"

"ہمارا چھوٹا سا گھر بہاروں کا امین ہوگا۔ فردوسی رعنائیوں سے بھر جائے گا۔ پھول مہکیں گے"۔

"ہاں عمر۔ ننھے منّے پھول۔ شاداب تر و تازہ"۔

عمر نے اس کے بالوں میں منہ چھپا کر دھیرے سے سرگوشی کی "تمہیں ننھے منّے بچے

بہت پیارے لگتے ہیں نا؟"

"ہاں"۔

"بھر لینا آنگن ان پھولوں سے"۔

"ہٹو۔ شریر"۔ وہ اس کے گلے میں بازو ڈال کر اُس کے سینے میں چھپتے ہوئے بولی۔

"نہیں چاہئیں بچے"۔ وہ شوخی سے کہنے لگا۔

زیبی نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پہ رکھ دیا۔

عمر نے ہنستے ہوئے اس کا سر بازو پہ رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا چہرہ تھام کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔ "کتنے بچے ہوں گے ہمارے"۔

زیبی نے شرما کر آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔

"صرف دو"۔۔۔ عمر بولا۔

"اوں ہوں"۔ زیبی نے آنکھیں بند کیے کیے سر نفی میں ہلایا۔

"پھر کتنے؟"

"بہت سارے"۔ زیبی نے پھر اُس کی چھاتی میں منہ چھپا لیا۔

"سنبھال لوگی بہت ساروں کو"۔

"کیوں نہیں"۔

"نہ بابا۔ اس دور میں دو بچے"۔

"چپ رہو جی"۔

"اچھا بابا۔ تمہاری مرضی۔ درجن بھر ٹھیک رہیں گے"۔

دونوں ہنس پڑے۔

چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ عمر کو واپس جانا تھا۔ زیبی کو ساتھ لے جا رہا تھا۔ اُس سے جُدا رہنے کا تو اب تصور بھی محال تھا۔ اس سلسلے میں ماں سے بات کی۔ تو امّی پیار سے بولیں

"بھئی ساتھ ہی رہنا ہے تم دونوں نے۔ ابھی چند دن سے اور یہاں رہنے دو۔ ہمارے چاؤ تو تم نے پورے ہونے ہی نہیں دیئے۔"

"نہیں امی!" وہ مسکرا کر بولا "زیبی میرے ساتھ ہی جائے گی۔"

"گھر تو ٹھیک کرے پہلے۔"

"زیبی ہی کرے گی۔"

"لو اور سنو۔ ابھی تو اس کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں اتری اور تم اسے کام پر لگا دو گے۔"

وہ ہنس کر بولا "کام سے مہندی اتر گئی تو اور لگا لے گی۔"

"گویا تیرا آخری فیصلہ ہے۔"

"دراصل امی وہاں کھانے پینے کی بڑی تکلیف ہے۔ جب گھر لے لیا ہے تو گھر والی کا بھی وہاں رہنا ضروری ہے۔ روٹی کی تکلیف"۔

امی اس کی بات پر دل کھول کر ہنسیں، پھر بولیں۔ "ٹھیک ہے بیٹے ٹھیک ہے۔ لے جاؤ دلہن کو ساتھ ہی۔ ویسے یہ روٹی کا بہانہ بہت ہی پرانا ہے۔"

عمر شوخی سے بولا "یقیناً جب ابا آپ کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے تو یہی بہانہ بنایا ہوگا۔"

"بالکل بالکل!" امی خوش دلی سے ہنسنے لگیں۔ پھر انہوں نے ڈھیر ساری دعائیں دیتے ہوئے زیبی کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی۔

عمر نے پیار سے اُن کے گلے میں بانہیں ڈال کر انھیں پیار کر لیا۔ "اوہ میری امی۔ آپ کتنی اچھی ہیں۔"

"بس بس!" امی بولیں۔ "چاپلوس کہیں کا۔ بات اپنی ہی منوائی۔ خیر۔ جا زیبی سے کہہ دے تیاری کر لے۔"

وہ زیبی کے پاس آیا۔ شرارت سوجھی۔ منہ پھلا کر مُسمسی سی صورت بنائے زیبی کے قریب آ بیٹھا۔

"کیوں جی۔ کیا ہوا؟" زیبی اُسے حیرانی سے تکتے ہوئے بولی۔ وہ اپنے کپڑے سوٹ کیس میں پیک کر رہی تھی۔

"وہ امی ہیں نا"۔

"ہاں۔ کیا ہوا انہیں۔؟"

"اُن سے میں نے تمہیں ساتھ لے جانے کی بات کی تھی۔"

"تو؟"۔

"وہ کہتی ہیں۔ زیبی کچھ عرصہ یہیں رہے۔"

"اچھا" زیبی نے نگاہیں گھماتے ہوئے کہا۔ اس کے لبوں میں مسکراہٹ تھرک رہی تھی۔

"ہاں۔ وہ کسی طور پر تمہیں میرے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دے رہیں۔ کہتی ہیں۔ ہمیں ابھی دلہن کے چاؤ چونچلے دیکھنے ہیں۔ وہ یہیں رہے گی۔ تم اکیلے چلے جاؤ۔"

"تو پھر!"۔

"میں کیا کروں زیبی۔ امی کی عدول حکمی کی تو سب کہیں گے۔ چار دن ہی میں بیوی کا غلام بن گیا۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "اس میں شک ہے کوئی"۔

"یعنی"۔

"یعنی یہ کہ تائی امی کی باتیں میں بھی سن چکی ہوں۔ ابھی ابھی میں ادھر ہی سے آ رہی ہوں۔"

وہ کھسیانا سا ہو کر ہنس پڑا۔ اور زیبی کو بانہوں میں بھر کر کئی چکر دے ڈالے۔ زیبی ہولے ہولے پیٹنے لگی۔ "چھوڑو نا کیا کر رہے ہو۔ ابھی کوئی آ جائے تو"۔

وہ پیار سے اُسے کھڑا کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بہانے وہاں تو نہیں چلیں گے۔ اکیلے گھر میں۔ پورا پورا میرا ہی اختیار ہوگا"۔

"اوں ۔ بڑے آئے"۔ وہ اٹھلا کر الماری کی طرف بڑھ گئی۔

عمر سازو سامان کے ساتھ زیبی کو لے آیا۔ وہ ایک چھوٹا سا بنگلو نما گھر تھا۔ صفائی ستھرائی چپڑاسی نے دو ایک مزدور لگا کر کروا رکھی تھی۔ جہیز کا نیا فرنیچر، نیا سامان زیبی نے چپڑاسی ہی کی مدد سے سیٹ کر لیا۔ چھوٹا سا گھر سچ مچ ہی چھوٹی سی جنت بن گیا۔

دونوں نے بڑے پیار اور اہتمام سے اس جنت کو سجایا۔ اور بسایا۔ زندگی بھرپور رعنائیوں اور توانائیوں سے ہمکنار تھی۔

عمر دفتر جانے لگا۔ زیبی اس چھوٹی سی جنت کو محبتوں کے رنگ سے نکھارنے لگی۔ گھر کی سجاوٹ اور سج دھج میں لگی رہتی۔ عمر کی پسند کے کھانے بناتی۔ اُس کی الماری ٹھیک کرتی۔ کپڑے تیار رکھتی۔ اس کے چھوٹے موٹے کام زیبی نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ وہ دفتر سے تھکا ہارا آتا تو زیبی کی حسین مسکراہٹ اس کی تکان ایک لمحہ میں دور کر دیتی۔ صاف ستھرا گھر گوشۂ عافیت نظر آتا۔

اُسے لگتا کہ اب تک وہ ادھوری اور بے ربط سی زندگی گزار رہا تھا۔ زیبی نے اس بے رنگ و بے کیف زندگی میں بڑے خوبصورت رنگ بھر دیے تھے۔ اس پر مخموری اور سرشاری کی کیفیت طاری رہنے لگی تھی۔ وہ زیبی کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ چاہنے اور پیار کرنے لگا تھا۔

"زیبی"۔ وہ اکثر اُسے باہوں میں سمیٹ کر کہتا۔

"ہوں"۔ زیبی کی آواز میں نغموں کی گنگناہٹ ہوتی۔

"زندگی کتنی خوبصورت ہو گئی ہے"۔

"ہاں"۔

"یہ حُسن برقرار رہے گا نا"۔

"اور حسین ہو جائے گا عمر"۔

"سچی"۔

"ہاں"۔

"یہ حُسن صرف ہمارے ہی حصے میں آیا ہے۔ یا۔ یا ہر شادی شدہ جوڑا ایسا ہی محسوس کرتا ہے"۔

"ہو سکتا ہے یہ حسن صرف ہمارے حصے میں آیا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ہر شادی شدہ جوڑے کا مقدر ہوتا ہو"۔

"نہیں یہ صرف ہمارے حصے میں آیا ہے زیبی۔ اس لیے کہ یہ حُسن میری زیبی کے وجود کا حصہ ہے۔ دنیا کی کوئی عورت میری زیبی جیسی حسین نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف تم ہو۔ جو خوشیوں کی پھوار بن کر میری زندگی میں برس رہی ہو"۔ وہ بے حد جذباتی ہو جاتا۔

زیبی اتراتی اٹھلاتی اور اپنے آپ پہ مان کرتے ہوئے اُس کے سینے میں سما جانے کی کوشش کرتی۔

شادی دو جسموں کے اتصال کا نام ہے۔ اگر روحیں بھی مل جائیں تو زندگی شراب دو آتشہ بن جاتی ہے۔ ویسے شروع شروع کے دن جذباتی دھاروں پر بہتے گزرتے ہیں۔ تلاطم ہی تلاطم ہوتا ہے۔ زندگی ٹھہراؤ کی طرف آنے سے پہلے خوب مچلتی اچھلتی ہے۔

زیبی اور عمر شاہراہ زندگی پر رواں دواں تھے۔ دن اُڑتے چلے جا رہے تھے۔ شادابیاں نکھرتی جا رہی تھیں۔ دونوں دو تین ہفتے کے بعد گھر کا چکر بھی لگا آتے۔ دونوں کے والدین انہیں خوش و خرم دیکھ کر فرحت و تسکین محسوس کرتے۔ زیبی اپنے ماں باپ کے سامنے عمر کی تعریفیں کرتے نہ تھکتی۔ اور عمر ہر ایک کے سامنے زیبی کے قصیدے پڑھتا رہتا۔ دونوں کو ان دنوں واقعی ایک دوسرے میں کوئی خامی نظر نہ آتی تھی۔ پیار کا خمار چڑھا ہوا تھا۔

کچھ دنوں سے زیبی کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ سُستی سی چھائی رہتی۔ پنڈلیاں دکھتی رہتیں۔ صبح صبح اُبکائیاں آنے لگتیں۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں زیبی۔"؟ عمر نے اس دن پریشان ہو کر کہا۔

"پتہ نہیں"۔ وہ بیڈ پر کروٹ بدل کر بولی۔

"ڈاکٹر کے پاس چلو گی"؟ وہ اُس پر جھک گیا۔

"ہاں"۔ اُس نے ہولے سے کہا۔

"ڈاکٹرز بہت ہیں میرے واقف"۔ وہ بیڈ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے بازو اُس کے اوپر سے لے جاکر دوسری طرف ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"نہیں عمر۔ کسی لیڈی ڈاکٹر۔ کو۔ دکھاؤں گی"۔ زیبی اُس کی ٹائی سے کھیلتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے"۔ اُس نے کہا اور پھر ایک دم ہی چونک کر زیبی کو دیکھا۔ زیبی کے چہرے پر بڑی ہی حیا آلود مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکراہٹ نئے معنی اور نئی جہتیں لیے ہوئے تھی۔ عمر نے غور سے زیبی کو دیکھا۔

"تو کیا زیبی ؟"۔ وہ بے پناہ خوشی محسوس کرتے ہوئے اس پر جھک گیا۔

"لگتا ہے"۔ زیبی نے ہولے سے سرگوشی کی۔

"ہُرّا"۔ وہ خوشی سے چلایا۔

"ابھی نہیں"۔ وہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مسکرائی۔ "ڈاکٹر کو دکھالیں"۔

"ابھی چلو"۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

زیبی بولی: "کل چلیں گے"۔

"جی نہیں ۔ ابھی"۔

"بھئی نہیں۔ کل صبح۔ ٹیسٹ ویسٹ صبح ہی ہوگا نا"۔

دوسرے دن وہ زیبی کو لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ خوش خبری متوقع تھی۔ ڈاکٹر نے اُمید ظاہر کی۔ یورین ٹیسٹ کروانے کے لیے کہا۔

رپورٹ پوزیٹو تھی۔ زیبی کے وجود میں ایک نئے وجود نے خلق ہونا شروع کر دیا تھا۔ دونوں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

"زیبی"۔ عمر احساسِ تفاخر سے سرشار ہو کر کہتا۔ "ہمارا بچہ ہوگا۔ میں باپ بنوں گا۔ تم ماں بنو گی۔ یہ نیا احساس کتنا جانفزا ہے"۔

زیبی کے چہرے پر شرمیلی نشیلی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ خوشی کے سوتے اس کے انگ انگ سے پھوٹتے تھے۔ بچے کا تصور اتنا شیریں اور دلنواز تھا کہ وہ پھولا نہ سماتی۔ طبیعت خراب رہنے کے باوجود مسرتوں کے ہنڈولے میں جھولتی رہتی۔ ممتا اُس کے اندر طوفانی صورت میں موجزن تھی۔ وہ تو دوسروں کے بچوں پر اس ممتا کو نچھاور کرتی رہتی تھی۔ اب تو اس کا اپنا بچہ اس کے وجود میں ڈھل رہا تھا۔ اپنے اس اَن چھوئے اَن دیکھے بچے پر اُسے ٹوٹ ٹوٹ کر پیار آتا۔ عمر کی تو جذباتی کیفیت کچھ عرصے میں توازن کی طرف لوٹ آئی تھی۔ لیکن زیبی ۔ زیبی تو پل پل گن کر گزار رہی تھی۔ ایک ایک لمحے کو والہانہ پن سے دھکیل رہی تھی۔

"عمر، ہماری بیٹی ہوگی"۔ وہ کہتی "تمہیں بیٹی پسند ہے نا"۔

"بیٹا ہوگا"۔ وہ کہتا "تمہیں بیٹا پسند ہے نا"۔

"مجھے تو بچہ پسند ہے عمر، بیٹا ہو یا بیٹی"۔

"خدا کرے بیٹا ہو"۔

"نام کیا رکھیں گے ۔ ؟"

"جب تشریف لے آئے گا تو نام بھی رکھ لیں گے"۔

"نہیں عمر۔ میں تو ابھی سے نام سوچ رہی ہوں"۔

"لڑکا سوچا اور لڑکی ہو گئی تو"۔

"میں دو نام سوچ رہی ہوں۔ ایک لڑکے کا دوسرا لڑکی کا"۔

"یہ ٹھیک ہے"۔

دونوں ڈھیروں نام اکٹھے کر لیتے۔ پسند کرتے۔ پھر ناپسند کر دیتے نئے نام ڈھونڈتے کبھی نام بے معنی تلاش کرتے کبھی معنی والے۔

نام معنی والا ہو یا بے معنی یہ تو کسی وجود کو تشخیص کرنے کا ایک صوتی اشارہ ہوتا ہے۔ دونوں ہی اس بات کے قائل تھے اس لیے نام وہ رکھنا چاہتے تھے جس میں خوبصورتی ہو،

نغگی ہو، پیار ہو۔

وہ جب ڈھیر سارے ناموں میں بھی کوئی نام منتخب نہ کر پاتے تو عمر کہتا: "زیبی! ابھی بڑا وقت پڑا ہے۔ رکھ لیں گے کوئی نہ کوئی نام"۔

تو زیبی سر ادھر اُدھر ہلاتے ہوئے کہتی۔ "نام کا انتخاب ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ وقت تو بہت پڑا ہے ابھی۔ لیکن یہ فیصلہ کر لینے سے میں مطمئن ہو جاؤں گی نا پھر انتظار سہل ہو جائے گا۔ جانتے ہو عمر! اس انتظار میں کتنا لطف ہے، خوشی ہے۔ میں تو پل پل گھڑی گھڑی گن گن کر گزار رہی ہوں"۔

"ہاں زیبی، مجھے تمہاری خوشی اور تمہارے انتظار کی لذت کا پورا پورا احساس ہے۔ تم تو بچوں کی دیوانی ہو نا۔ اب تو ہمارا اپنا بچہ۔۔۔"

"اوہ عمر۔ میرے بازوؤں میں کپکپی سی ہوتے لگتی ہے، میری گود میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ میں اپنے ان دیکھے بچے کو اپنے بازوؤں میں ہمکتا محسوس کرتی ہوں، گود میں مچلتا پاتی ہوں۔ لطف و انبساط کی لہریں میرے وجود کو ڈھانپ لیتی ہیں۔ میری خوشیوں کا تم اندازہ نہیں کر سکتے"۔

عمر اُس کی والہانہ اور بے پایاں خوشی کو دیکھ کر بڑا متاثر ہوتا۔ اُسے پیار کر لیتا۔ بازوؤں میں بھر لیتا اور پھر ہولے سے سرگوشی کرتا۔ "زیبی۔ مجھے تو تمہارے بچے سے حسد محسوس ہونے لگتا ہے"۔

"کیوں جی"۔

"بچہ آگیا تو مجھے بالکل نظر انداز کر دو گی"۔

"ہائے نہیں عمر"۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔ تمہارا بچہ۔ تمہیں مجھ سے چھین نہ لے"۔

وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہتی۔ "وہ صرف میرا بچہ نہیں، تمہارا بھی تو ہوگا۔

ہم دونوں کا۔ عمر ہم دونوں کا۔ وہ ہمیں الگ نہیں کرے گا۔ باندھ دے گا ہمیں مضبوطی سے۔ بچہ تو ڈوری ہوتا ہے۔ جو ماں باپ کو بہت ہی مضبوط بندھن میں باندھ دیتا ہے"۔

"یہ بات ہے"۔

"ہاں"۔

"بندھے تو ہم ازل سے ہیں زیبی"۔

"ہمارا بچہ ہمیں ابد تک باندھے رکھے گا"۔

"زیبی۔ میری جان"۔

"عمر"۔

دونوں بے پناہ مسرتوں میں ڈوب جاتے۔

دن گزرنے لگے۔ عمر زیبی کی ناز برداریوں میں لگ گیا۔ زیبی کی طبیعت خراب رہتی تھی۔ پھر بھی بچے کا انتظار بڑا کیف افزا تھا۔ ناز اٹھوانے میں بھی اک لطف تھا۔ تفاخر تھا۔ زندگی کا یہ موڑ بڑا ہی دلفریب تھا۔

عمر تو کام کاج میں لگ جاتا۔ لیکن زیبی سارا وقت اپنے ان دیکھے بچے کو تصور کی آنکھ سے دیکھنے میں مگن رہتی۔ گول مٹول سا بچہ قلقاریاں کرتا۔ پیاری پیاری باتیں کرتا۔ اسکول جاتا پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا۔ برسوں کا عمل اس کے ذہن میں چھپا کے لیتا گزر جاتا۔ وہ خوشی سے بہک بہک جاتی۔ ممتا کا طوفان سینے میں اٹھتا۔ پیار اُمنڈ اُمنڈ آتا۔ اور اس کا جی چاہتا وقت کو تیزی سے دھکیل دے۔ نو ماہ پلک جھپکتے میں گزر جائیں۔ اور وہ بچے کو جنم دے کر اپنی آغوش میں آباد کر لے۔

لیکن

انسان جو کچھ سوچتا ہے۔ وہ کبھی کبھی تقدیر کی سوچوں سے مطابقت نہیں کھاتا۔ کوئی چیز بھی انتہا کو پہنچ جائے تو ابتدا کی طرف لوٹ آتی ہے۔ کبھی ایک دم ہی، کبھی ہولے ہولے۔

خوشی اور غم بھی اسی اصول کے پابند ہوتے ہیں۔

زیبی اور عمر کی خوشیاں بھی شاید نقطۂ عروج پر بے وقت جا پہنچی تھیں۔ تنہا کو چھو کر پلٹ آنے کے عمل کے تابع تھیں۔ ساری احتیاطوں اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھنے کے باوجود وہ.... سیڑھیوں سے پھسل کر گری۔ روزانہ انہی سیڑھیوں پر چڑھتی اُترتی تھی۔ لیکن اس دن تقدیر کی ہولناکی نے اپنا رُخ دکھانا تھا یا پاؤں تلے کوئی چیز آ گئی۔ جانے پھل کا چھلکا تھا۔ یا ٹافیوں کا کوئی کاغذی ٹکڑا۔ پاؤں پھسلا۔ اس نے سیڑھی کا جنگلا جلدی سے پکڑ لیا۔ اور دھم سے اگلی سیڑھی پہ بیٹھ گئی بظاہر پھسلی بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ لیکن نقصان اتنا زیادہ ہو گیا کہ جسے برداشت کرنے کی وہ متحمل نہ تھی۔

اس وقت تو کوئی خاص تکلیف نہ ہوئی۔ وہ خود ہی اُٹھ کر بیڈروم میں آئی۔ بستر پہ چت لیٹ گئی۔ صرف کمر میں درد محسوس ہوا۔

عمر دفتر سے آیا تو وہ بیڈروم ہی میں تھی معمول کی طرح اس کا استقبال کرنے دروازے پر نہ پہنچی۔ عمر کو عجیب سا لگا۔ نوکر سے پوچھا "بی بی کہاں ہیں۔ ؟"

"اپنے کمرے میں ہیں صاحب۔"

"خیریت۔ ؟"

"سیڑھیوں سے پھسل پڑی تھیں آج۔"

"اوہ میرے خدا۔ خیریت سے تو ہیں نا۔ ؟"

نوکر کا جواب سننے سے پہلے ہی وہ کمرے کی طرف لپکا۔ "زیبی زیبی۔ کیسے گریں چوٹ تو نہیں آئی۔ ٹھیک تو ہو۔"

وہ تیزی سے آ کر زیبی پہ جھکتے ہوئے مسلسل سوال کیے گیا۔ زیبی نے دھیمی سی مسکراہٹ سے اُسے دیکھا اور بولی۔ "بس خیریت ہی رہی۔ صرف کمر میں درد ہے۔ تم گھبراؤ نہیں ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کوئی اور تکلیف تو نہیں نا۔ ؟"

"نہیں۔ سب ٹھیک ہے"

"ڈاکٹر کے پاس لے چلوں ؟"

"ضرورت تو نہیں۔ پھر بھی شام کو ہو آئیں گے۔ تم پریشان نہ ہو۔ ٹھیک ہی ہوں۔ شام کو چلیں گے ڈاکٹر کے پاس۔ تم جا کر کھانا کھا لو۔"

"تم نے کھا لیا ؟"

"نہیں"۔

"یہیں منگوا لوں ؟"

"میرا جی نہیں چاہ رہا۔"

"لگتا ہے تکلیف زیادہ ہے۔"

"نہیں۔ اتنی زیادہ نہیں بس کمر دُکھنے لگی ہے۔"

"اٹھو اور۔ چلو پھرو۔ شاید ٹھیک ہو جائے۔"

عمر کے کہنے پر وہ اٹھی۔ لیکن دو قدم بھی نہ چل پائی۔ درد بڑھ گیا۔ تیز تیز سی لہریں اٹھنے لگیں۔ وہ جلدی سے بیٹھ گئی۔ "عمر مجھے کیا ہو رہا ہے۔ سخت درد۔ اُف۔"

زیبی درد کی اذیت سے تڑپنے لگی۔ عمر کے ہاتھ پاؤں ٹھر گئے۔ وہ سخت گھبرا گیا۔ زیبی کو اسپتال لے جانا ضروری تھا۔ اُس نے دفتر سے گاڑی منگوائی اور بمشکل زیبی کو اسپتال لے گیا۔ زیبی کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی۔

بدقسمتی سے بڑی ڈاکٹر چھٹی پر تھی مس منزہ اور دو تین نرسیں ہی تھیں۔ ڈاکٹر منزہ ہی کی طرف رجوع کیا گیا چھوٹی سی جگہ تھی۔ اسپتال میں بھی بڑے بڑے شہروں کی سی سہولتیں میسر نہ تھیں۔ مس منزہ نئی نئی ڈاکٹر آئی تھی کچھ زیادہ تجربہ بھی نہ تھا۔ کچھ زیبی کی بدقسمتی کا دخل تھا کہ یہ سانحہ وقوع پذیر ہو ہی گیا۔ زیبی کی حالت مخدوش ہو گئی۔

صبح جب سورج طلوع ہو رہا تھا۔ عمر اور زیبی کی اُمیدوں کے اُجالے اندھیروں میں بدل گئے تھے۔

صدمہ تو عمر کو بھی بہت ہوا لیکن زیبی کی تو دنیا ہی اندھیرا ہو گئی۔ عمر اور زیبی دونوں کی مائیں آ گئیں۔ وہ تسلی اور تشفی دینے کی بہت کوشش کرتیں مگر زیبی کی پریشانی دیکھی نہ جاتی۔

"اللہ کی یہی رضا تھی۔ صبر کرو۔"

"خدا اور دے گا۔ گھبراؤ نہیں۔"

"تمہاری صحت اور زندگی ہے تو بچے بھی ہو جائیں گے۔"

"مر کے بچی ہو۔ ہمارے لیے یہی بہت ہے۔ خدا نے چاہا تو پھر دے گا بچہ۔"

سب تسلیاں دیتے۔ لیکن زیبی غم سے نڈھال تھی۔

عمر نے چھٹی لے لی۔ اور زیبی کو سب گھر لے آئے۔ چھوٹے شہر میں کوئی قابل ڈاکٹر اُن کی نظر میں نہ تھی۔ اس لیے عمر اور زیبی کی ماؤں نے یہی سوچا کہ اسے گھر لے جایا جائے۔ جہاں کسی اچھی ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔

سب چلے آئے۔ زیبی کی طبیعت سنبھلنے نہ پا رہی تھی۔ بچے کی مفارقت کا صدمہ جھیلنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا۔ ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ خون تو جیسے سارا ہی نچڑ گیا تھا۔ اُسے ذہنی اور جسمانی آرام کی سخت ضرورت تھی۔ وہ چارپائی پر پڑ گئی۔

زیبی کافی عرصہ بیمار رہی۔ علاج معالجہ ہوتا رہا۔ لیکن اس نے من میں جو روگ پال لیا تھا۔ اس کا علاج تو تب ہی ہوتا جب پھر اُمید کی کوئی کرن نظر آتی۔

ایک سال گزر گیا

پھر دوسرا اور اس طرح تیسرا بھی گزر گیا۔ لیکن زیبی کا دامن اُمید نہیں بھرا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں سے علاج کروایا۔ ٹونے ٹوٹکے کیے گئے درباروں مزاروں پہ حاضریاں دی گئیں حکیموں

سے رجوع کیا گیا۔ ہومیو پیتھک علاج آزمایا گیا۔ لیکن سوکھی کوکھ ہری نہ ہوئی۔ گائناکالوجسٹ مسز جمیلہ چوہدری نے تو شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ اب زیبی کے ماں بننے کے امکانات نہیں رہے۔ یہ بات عمر جانتا تھا لیکن زیبی کو یہ بات نہیں بتائی گئی تھی۔

زیبی کے اس طرح ذہنی اور جسمانی طور پہ بیمار ہونے سے گھریلو زندگی بڑی متاثر ہوئی۔ وہ بہت چڑچڑی ہو گئی تھی۔ ہر وقت سوگوار پڑی رہتی۔ لگتا تھا زندگی سے ساری دلچسپیاں گویا خارج ہو چکی ہیں۔ ہنسنا مسکرانا تو چھوٹ ہی گیا تھا۔ عمر کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُس کی دلچسپی گھر میں کم ہونے لگی تھی۔ پھر بھی ایک دن اُس نے زیبی سے کہا۔ "زیبی! کب تک سوگ مناؤ گی"۔

"عمر میں کیا کروں۔"

"میں تمہارا دکھ جانتا ہوں۔"

"میں شاید اب کبھی ماں نہیں بن سکوں گی۔"

"تو کیا ہوا۔ دنیا میں بہت سی ایسی عورتیں ہیں۔"

"عمر!"

"زیبی"۔

"جی"۔

"رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔"

زیبی کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ اُس نے عمر کو دیکھا اور بے اختیارانہ بولی۔ "عمر۔ تم مجھے چھوڑ تو نہیں دو گے۔"

"کیا؟"۔

"عمر شاید میرے بچے نہ ہو سکیں۔"

"تو کیا ہوا؟"

"تمہیں بچوں کی ضرورت ہوگی۔ کیا۔ کیا تم دوسری شادی کرلوگے۔؟"

"اوہ خدایا" عمر نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ "گم صم یہی باتیں سوچتی رہتی ہو"۔

"ہاں۔ یہ سوچیں بھی مجھے بھی پریشان کرتی ہیں۔ ایک تو میرا بچہ ضائع ہوگیا۔ دوسرے تم نے ساتھ چھوڑ دیا تو؟"

"دیکھو زیبی"!

"ہاں"۔ وہ گھگیاتے ہوئے بولی

"زیبی مجھے بھی بچے اچھے لگتے ہیں۔ لیکن میں اُن کے لیے تمہاری طرح پاگل نہیں ہوؤں گا۔ دوسری شادی کا خیال ہی ذہن سے نکال دو۔ تم شاید مجھے اب تک ذرا پھینک سمجھتی رہیں زیبی، وہ تو عمر کے اُس دور کے مشغلے تھے۔ اب میرے لیے تم ہو۔ پہلی اور آخری عورت۔ بچے ساری عمر بھی نہ ہوسکیں تو پروا نہیں"۔

"عمر"۔ زیبی رودی۔

"لیکن ایک بات یاد رکھو"۔

"کیا؟"۔

"تم اس طرح مجھ سے الگ تھلگ محرومی کے انداز اپنائے گھربار سے بے تعلق اور مجھ سے بے پروا رہیں۔ تو پھر۔"

"پھر؟"

وہ ہنس کر اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھرتے ہوئے بولا "تو پھر۔ اپنی دلچسپیوں کا سامان ضرور پیدا کرلوں گا"۔

زیبی اُس کی بات پر مسکرادی۔ روتی سی مسکراہٹ دیکھ کر وہ خوب ہنسا۔ پھر اُس نے زیبی کو اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔ زیبی کو خوب ڈرایا۔ تسلیاں دیں۔ زندگی کی طرف لوٹ آنے کا حوصلہ دیا۔

زیبی نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ عمر کی دیکھ بھال پہلے کی طرح کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

انہی دنوں عمر کی تبدیلی خوشاب سے سرگودھا ہوگئی۔ سارا سامان سمیٹا گیا۔ عمر نے وہاں گھر لے لیا۔ نیا گھر نسبتاً اچھا تھا۔ زیبی یہاں آکر مصروف ہوگئی۔ بچہ اس کی کمزوری تو تھا۔ لیکن اب وہ جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کرتی تھی۔

انہی دنوں اس علاقے میں واپڈا ٹیوب ویل لگا کر زمین کی سیم تھور ختم کرنے کے منصوبے پر عمل ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ ٹیوب ویل لگا کر زمین کے اندر کا فاضل پانی باہر نکال کر زمین کو قابل کاشت بنانے کی کوشش ہو رہی تھی۔ عمر کی ڈیوٹی بھی یہیں لگی تھی۔ اس سلسلے میں اُسے فیلڈ میں بھی رہنا پڑتا تھا۔ کئی کئی دن وہیں رکنا پڑتا۔ کبھی ٹینٹوں میں رکنا پڑتا۔ کبھی کسی ریسٹ ہاؤس میں ہفتہ عشرہ قیام کرنا ہوتا۔ زیبی گھر میں اکیلی ہوتی۔ اُس کا گھر میں اکیلے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔

"زیبی۔ میری یہ ڈیوٹیاں اب لگتی رہیں گی"! ایک دن عمر نے باتوں کے دوران اس سے کہا۔

"میں اکیلی کیسے رہوں گی"! وہ بولی "تم تو کئی کئی دن فیلڈ ہی میں رہتے ہو"۔

"ساتھ تو لے جا نہیں سکتا تمہیں۔ تم کئی کئی دن اکیلی رہتی ہو۔ مجھے تمہاری فکر لگی رہتی ہے"!

"گھر سے بلا لیں کسی کو یہاں"۔

"کون آئے گا"؟

"تائی امی"۔

"مشکل ہوگا۔ دو چار دن تو رہ لیں گی۔ لیکن یہ کام تو شاید دو تین برس کا ہے"۔

زیبی نے متفکرانہ اُسے دیکھا تو وہ بولا۔ "یوں کرو۔ تم واپس چلی جاؤ۔ میں ہر ہفتے گھر آجایا کروں گا۔ تم بھی سب لوگوں میں بہلی رہو گی۔ اور مجھے بھی فکر نہیں رہے گی"۔ دونوں نے صلاح مشورے سے یہی فیصلہ کیا۔

زیبی گھر چلی گئی۔ عمر کو جب بھی موقع ملتا یا چھٹی ہوتی وہ چکر لگا آتا۔

دن گزرنے لگے۔

یوں چھوٹا سا گھر چھوٹی سی جنت والا سلسلہ تو منقطع ہو گیا لیکن زیبی واقعی بہل گئی۔ بھرا پُرا گھر تھا۔ چھوٹی آپا بڑی آپا اور بھابی کے بچے دل بہلاوے کا سامان بن گئے۔ چھوٹی آپا کی تیسری بچی میں تو اس کی جان تھی۔ گل گوتھنی سی یہ بچی ہر وقت اُس کی گود میں رہتی۔

"چھوٹی آپا"۔ وہ اکثر اُس سے کہتی۔

"ہوں"۔

"یہ بچی مجھے دے دیں"۔

"تمہارے پاس ہی تو ہوتی ہے"۔

"نہیں آپا۔ اکا مکا مجھے دے دیں"۔

"نہیں زیبی۔ خدا تمہیں اپنے بچے دے دے گا"۔

"نہیں دے گا"۔

"مایوسی گناہ ہے"۔

"ڈاکٹر حمیرا نے مجھے بتا دیا ہے پچھلی دفعہ میں چیک اپ کے لیے گئی تو اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ عمر کو تو اس نے بہت پہلے بتا دیا تھا۔ عمر نے مجھ سے یہ بات چھپائے رکھی۔ اس ڈر سے کہ شاید یہ صدمہ میں جھیل نہ پاؤں"۔

"ڈاکٹر نا اُمید بھی نہیں"۔

"لیکن اُمید بھی نہیں دلاتے۔ اسی لیے تو کہتی ہوں یہ مجھے دے دیں"۔

"جب تک تم یہاں ہو۔ یہ تمہارے پاس ہی ہے"۔

"کوئی اپنا بچہ دینا نہیں چاہتا"۔

"قدرتی بات ہے زیبی"۔

"تو آپا"۔

"ہوں"۔

"میرے بچے نہ ہوئے اور مجھے کوئی بچہ گود لینا پڑا تو کہاں سے لوں گی؟"

"اللہ مالک ہے۔ اتنی فکر مند نہ رہا کرو۔ ذہنی طور پہ پریشان رہتی ہو اس لیے بچے نہیں ہوتے تمہارے"۔

زیبی فکر مند کیسے نہ رہتی۔ اب تو اُسے یہی فکر ستا رہی تھی کہ بچہ گود لینا پڑا تو کہاں سے لے گی۔ یہ باتیں۔۔ عمر جب بھی آتا تو اس سے بھی کرتی۔ وہ اکثر چڑ جاتا۔ اور اب اسے تسلی دلاسا دینے کے بجائے جھڑک بھی دیتا۔ اس کے جانے کے بعد وہ اکثر رو دیا کرتی۔

عمر اپنے کام میں مصروف تھا۔ فیلڈ کی ڈیوٹی بڑی سخت تھی۔ آٹھ آٹھ گھنٹے ٹنگے آسمان تلے تپتی دھوپ میں کام کرنا پڑتا۔ اجڑی ویران زمین کو پھر سے قابلِ کاشت بنانا تھا۔ وہ یہ کام شوق اور لگن سے کر رہا تھا۔

ان دنوں وہ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں کافی آرام تھا۔ محمد دین چوکیدار اور اس کی بیوی ماجاں اُس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وقت پہ کھانا تیار کر دیتے۔ کپڑے دھو دیتے وقت بے وقت چائے کی طلب ہوتی تو بنا دیتے۔ اور جب اُسے فرصت ہوتی تو اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُسے محظوظ کرتے۔

ایک شام عمر کام سے واپس آیا۔ جیپ سے اُتر کر اندر جا رہا تھا کہ اُسے محمد دین کے گرجنے برسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ماجاں بھی کچھ بول رہی تھی اور کسی کے رونے کی آواز بھی آرہی تھی۔ وہ اندر جانے کے بجائے ادھر ہی چلا آیا۔

محمد دین سخت غصے میں تھا۔ ماجاں بھی خشمناک نظروں سے اس لڑکی کو گھور رہی تھی۔ جو روتے ہوئے اپنے میلے سے دوپٹے سے بار بار ناک پونچھ رہی تھی۔ لڑکی خوبصورت نہیں تھی لیکن جوان تھی۔ میلے کچیلے کپڑے پہنے تھی اور بال بے ترتیبی سے بکھرے تھے۔ لڑکی نے روتے روتے عمر

کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے محمد دین۔ یہ کون ہے۔ کیا ہو رہا ہے؟" اُس نے پوچھا۔ تو محمد دین بمشکل غصیلے لہجے میں بولا۔

"یہ میری بھتیجی ہے صاحب جی۔ بھائی مر کھپ گیا۔ اس کی ماں نے دوسرا خصم کر لیا۔ وہ تو اس کے پیچھے پڑا ہے۔ اب یہ میرے پاس چلی آئی ہے۔ بتائیں اس کا کیا کروں میں؟"

محمد دین لڑکی کے متعلق اسے بتا رہا تھا۔ ماجان بھی باتیں کرنے لگی۔ لڑکی کا کوئی والی وارث بننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ روتے روتے عمر کو دیکھ کر بولی۔ "میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ کس کھوہ میں ڈوب مروں۔"

پھر وہ ایک دم ہی جوش میں آ کر بولی "مر جاؤں گی لیکن سوتیلے باپ کے پاس نہیں، جاؤں گی"

عمر کچھ نہیں بولا۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا۔

وہ کمرے میں چلا آیا۔

محمد دین بے آسرا لڑکی کو پناہ دینے پر مجبور تھا۔ وہ پہلی بار تھوڑا ہی آئی تھی۔ ہر چوتھے چھٹے مہینے یہی کچھ ہوتا تھا۔ لڑکی کو اپنے پاس رکھنا اس کے لیے بھی مشکل تھا۔ ایک تو اپنی دال روٹی بمشکل چلتی تھی۔ دوسرے ڈاک بنگلے میں رنگا رنگ قسم کے لوگ آ کر ٹھہرتے تھے۔ لڑکی پر پہرے داری کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

لڑکی خوبصورت نہیں تھی، جوان تھی اور جوانی بذاتِ خود خوبصورتی ہے۔ ایسی خوبصورتی جو جوان مردوں کے لیے کھلا چیلنج بن جاتی ہے۔

عمر کے لیے بھی گوری کھُلا چیلنج بن گئی۔ وہ کام پر آتے جاتے اسے دیکھتا۔ اکثر مذاق کرتا۔

"منہ تو دھواں کھائی لکڑی۔ لیکن نام ہے گوری"۔

گوری ایسی نگاہوں سے اُسے دیکھتی کہ اس کا ایمان متزلزل ہو جاتا۔ پھر مسکراہٹ ہوں

پر پھیلا کر کہتی "من تو میرا گورا ہے نا صاحب جی"۔

"کیا پتہ"۔

"مجھے تو پتہ ہے"۔

ایک دن عمر بڑے موڈ میں تھا۔ بولا "گوری، تیرا باپ تجھ پر مرمٹا۔ تو ہے ہی ایسی"۔

"اے صاحب"۔ گوری کو غصہ آ گیا "وہ میرا باپ نہیں ہے۔ بھیڑیا ہے بھیڑیا۔ میری ماں کی بوٹیاں بھی کھاتا ہے اور مجھ پر دانت بھی نکوستا ہے"۔

"جو وہ ابھی تجھے لینے آ جائے تو؟"۔

"آ کے دیکھے"۔

"کیا کرو گی؟"

"سر پھاڑ ڈالوں گی اُس کا"۔

"قاتل بنو گی۔ ویسے قاتلہ تو تم ہو ہی"۔

"کیا صاحب جی"۔

"کچھ نہیں"۔

"صاحب جی"

"ہاں۔"

"ایک بات کہوں۔ برا تو نہ مانو گے؟"

"کہو"۔

"مجھے تمہاری نظر بھی کھوٹی لگتی ہے"۔

اُجڈ گنوار لڑکی کے منہ سے یہ بات سُن کر عمر گھبرا سا گیا۔ واقعی اُس کی نظر کھوٹی ہو رہی تھی۔ یہ لڑکی اس کے حواس پر چھا رہی تھی۔ وہ بھُولتا جا رہا تھا کہ وہ ایک ذمے دار شوہر ہے مگر وہ بھٹکنے لگا تھا۔

"گوری"۔

"ہوں"۔

"تم نے میری نظر کو کھوٹی کیونکر کہا؟"

"میں بچی نہیں ہوں صاحب جی۔ نظر پرکھنے کا تجربہ ہے میرا۔ فٹ سے بتا دیتی ہوں۔ ٹیڑھی نظریں میرے بدن میں سوئیوں کی طرح چُبھنے لگتی ہیں"۔

"تیرا بدن اَن چھوا تو نہیں ہوگا۔ پھر"۔

عمر کی بات پر وہ تڑپ اُٹھی۔ ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا عمر کے مار دینے ہی کو تھی۔ آنکھوں میں خون سا اُتر آیا۔ عمر جلدی سے پرے ہٹ گیا، ہنستے ہوئے بولا "میں نے تو مذاق کیا تھا"۔

"مذاق کیا ہے نا تو اب آزما کے بھی دیکھو"۔ وہ غرائی۔

"کیا مطلب؟" وہ بھونچکا سا اُسے دیکھنے لگا۔

"شادی کرو میرے ساتھ تب پتہ چلے گا"۔

"کیا بک رہی ہے"۔

"ایسی باتیں کیوں کی ہیں تم نے؟"

"مذاق تھا سب"۔

"میرے کو اتنی گری پڑی سمجھا ہے"۔ وہ ایک دم ہی پھک پھک رونے لگی۔ عمر کو اس پر بیک وقت ترس بھی آیا اور غصّہ بھی۔

گوری پتہ نہیں کیوں عمر کی کمزوری بن گئی تھی۔ یہ جذبہ وقتی تھا۔ لیکن تھا بڑا اتنومند عمر جیسا دل پھینک جوان اس کے سامنے بند نہ باندھ سکا۔ یہ بات انہونی سی ضرور تھی لیکن کبھی کبھی اَن ہونی بھی ہو جاتی ہے۔

یہ اَن ہونی یہاں بھی ہو گئی۔

عمر کو یہ خیال نہ رہا کہ وہ کون ہے۔ کس خاندان کا فرد ہے۔ اس پر کتنی ذمّے داری ہے۔ بیوی کے حق میں یہ بات ڈاکے کے مترادف ہے۔ اس وقت تو وہ اندھا بہرا ہو چکا تھا۔ گوری اُس کی طلب تھی۔ یہ طلب، یہ حاجت، یہ مانگ جیسے بھی ہوتا پوری ہونا چاہیئے تھی۔ یونہی پوری ہو جاتی، چاہے نکاح کے بندھن باندھ کر اُسے اس بات کی فکر نہ تھی۔ محمد دین اور ماجاں کچھ کہہ نہ سکے، کر نہ سکے۔ کہا تو صرف یہی کہ گوری کی ضرورت ہے تو نکاح کے دو بول پڑھوا لو۔ بھلے بیوی بنا کر نہ رکھنا۔ ساری عمر خدمتگار بنی رہے گی۔ عمر کے سر تو جادو چڑھا تھا۔ نشہ حواس چھین چکا تھا۔ نکاح پہ راضی ہو گیا۔

اُس نے دو چار ریشمی گہرے گہرے رنگوں اور بڑے بڑے پھولوں والے جوڑے گوری کے لیے خریدے۔ چاندی کی جھانجریں اور سونے کے آویزے لئے۔ چار آدمیوں کی موجودگی میں گوری سے نکاح کر لیا۔ گھر والوں کو نوٹس کیا۔ عمر کو شاید اپنے آپ بھی پتہ نہ چلا کہ جذباتی بہکاوے میں آکر وہ کتنا بڑا قدم اُٹھا چکا ہے۔

چھمک چھمک چھمک چھمک کرتی گوری، عمر کی شعلوں کی طرح دہکتی آغوش میں آگئی۔

چند ہی دنوں میں گوری کیا سے کیا بن گئی۔ ٹوٹ کر نکھار آیا۔ خاصی خوش شکل اور پُرکشش نکل آئی۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ اتنے بڑے صاحب کی بیگم بن جائے گی۔

"صاحب مجھے چھوڑ تو نہ دو گے"۔

"صاحب میں تمہیں اچھی لگتی ہوں نا"۔

"صاحب تم نے مجھے چھوڑ دیا تو میں جی نہ پاؤں گی"۔

"صاحب تم تو فرشتہ ہو"۔

"صاحب تم تو میری زندگی ہو"۔

وہ بے لاگ بے ٹوک ایسی ایسی باتیں کہتی رہتی۔

ایک دن اُس نے عمر سے کہا "صاحب۔ تم شہر کب چلو گے۔ میں شہر جانا چاہتی ہوں۔ اپنے سے گھر میں رہنے کے لیے"۔

"شہر؟"

"ہاں یہاں کا کام ختم ہو گیا۔ تو اپنے گھر نہیں چلو گے؟"

عمر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُسے تو اس بات سے ایک جھٹکا سا لگا۔ یوں بھی مطلب پورا ہو چکا تھا۔ گوری اسے بار لگنے لگی تھی۔ اُس نے جو شہر جا کر بسنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ پریشان ہو گیا۔ اُسے شہر لے جانے کا تو اُس نے سوچا تک نہ تھا۔ وقت پورا کر کے اس نے چپکے سے چلے جانا تھا۔ کون بیوی کون شوہر! یہ تماشا تو اس نے وقتی طور پر کیا تھا اور اس کے لیے اُس نے محمد دین کو بھی پیسہ دیا تھا اور گوری پر بھی خرچ کیا تھا۔

لیکن گوری تو ایک مکمل گھریلو عورت بن گئی تھی۔ اک نکھرا اک مان سا بھر گیا تھا اس میں۔ وہ اپنے آپ کو شہر میں بسنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی۔ خاصی ذہین تھی۔ عمر کے طور اطوار اپنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"بتاؤ نا صاحب جی"۔ وہ بولی۔

"کیا؟"

"گھر کب چلیں گے؟"

"ابھی یہاں بہت کام ہے"۔

"چھٹی کے دن ہی دکھا لاؤ اپنا گھر"۔

"اچھا۔ کسی دن لے چلوں گا"۔ اس نے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔

اب وہ خاصا پریشان اور متفکر رہنے لگا تھا۔ گوری سے پیچھا چھڑانے کی سوچتا رہتا۔ ذہنی سے من ہی من میں شرمندہ ہوتا رہتا۔ عجیب سی ذہنی کشمکش نے اُسے تھکا دیا تھا۔ وہ چڑچڑا سا ہو گیا۔ گوری کو کئی کئی دن اپنے کمرے میں آنے نہ دیتا۔ بات بات پر جھڑک دیتا۔ وہ بے چاری کچھ پوچھتی بھی تو اکھڑا سا جواب دیتا۔ "فیلڈ میں بہت کام ہوتا ہے تھک جاتا ہوں"۔

تھکاوٹ اتارنے کے لیے گوری مسکراہٹوں اور خدمتوں کا تحفہ پیش کرتی۔ لیکن وہ

اور بدک جاتا۔

پھر ایک دن گوری نے کہا "صاحب جی۔ ایسے کب تک چلے گا"۔

"کیسے!" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"صاحب جی۔ میں۔ میں نے۔ میں نے کسی ڈاکٹرنی"۔

"کیا ہوا ہے تمہیں"

وہ بڑے شرمیلے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی "چاچی کہتی ہے۔ میں۔ میں ماں بننے والی ہوں"۔

"کیا!" وہ چیخا اور اس کے اندر کا عمر دھڑام سے گر پڑا۔ یہ بات تو اُس کے فہم و ادراک کے قریب تک نہ پھٹکی تھی۔

"صاحب جی۔ یہ تو۔ ہونا ہی تھا۔ چاچی کہتی ہے ڈاکٹرنی کو دکھا کر کوئی طاقت کی دوائیاں کھاؤں"۔

"گوری"۔

"کیا ہوا صاحب جی!"

جو ہوا تھا صاحب جی اُسے کیسے بتاتے۔ وہ تو گوری سے بھی جھوٹا سچا بندھن باندھے تھا پھر یہ نیا بندھن۔ اُف اُس کا دماغ چکرا گیا۔ وہ کئی دن متوحش اور پریشان پریشان رہا۔ بھٹکتا رہا۔ سوچتا رہا۔ گوری سے پیچھا چھڑانے کے منصوبوں اور پلانوں کے بارے میں سوچتا رہا۔

پھر ابھی وہاں کام زوروں پہ تھا۔ لیکن وہ واپس جانے کا پروگرام بنانے لگا۔ اس نے دوسرے سیکشن میں تبدیلی کروالی۔ سب کچھ چپ چاپ ہی ہو گیا اور ایک دن بوریا بستر سمیٹ کر واپس جانے لگا۔ تو گوری گھبرا گئی۔ پریشان ہو کر اس سے لپٹ گئی۔

"مجھے کیوں چھوڑ کر جا رہے ہو صاحب جی"۔ وہ رونے لگی۔

"چھوڑ کر نہیں جا رہا تمہیں"۔ عمر نے اسے جھوٹی تسلی دی۔

"تو پھر۔" وہ روتے روتے بولی۔ "یہ سامان کیوں سمیٹ لیا ہے؟"

"گھر جا رہا ہوں۔ اپنے والدین کو تمہارے متعلق بتانے۔ جلد ہی تمہیں آکر لے جاؤں گا گھبرانا بالکل نہیں۔ جلدی آؤں گا۔"

یہی بات اُس نے محمد دین اور ماجاں سے بھی کہی۔

ماجاں بولی "صاحب جی۔ بھول نہ جانا۔ گوری آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اسے آپ کی ضرورت ہے۔"

"بالکل بے فکر رہو۔ مجھے خود احساس ہے۔ میں جلد ہی اسے آکر لے جاؤں گا۔"

"اپنا اتا پتا تو دیتے جاؤ"۔ اس کی تسلیوں کے جھانسے میں آکر گوری نے کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں دو چار دن میں خود ہی آجاؤں گا مجھ پر اعتماد کرو گوری۔ مجھے تمہارا اور اپنے ہونے والے بچے کا خیال نہیں کیا؟"

اُس نے میٹھی میٹھی باتوں سے گوری کو تسلی دی۔ آنے کا وعدہ کیا۔ خوشگوار اور چمکتے دمکتے مستقبل کی جھلک دکھائی۔ گوری کو بہلا پھسلا کر وہ چلا آیا۔

کئی دن وہ پریشان رہا۔ ضمیر کی آواز دہلاتی رہی۔ اپنی زیادتی اور گوری کی بیگناہی سے خوف زدہ رہا۔ زیبی سے بھی نگاہیں چراتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔

انہی دنوں اس کی ڈیپوٹیشن آگئی۔ اس کا تبادلہ ایم سی پی میں ہوگیا۔ اس کمپنی نے ان دنوں بغداد میں پُلوں کا ٹھیکہ لیا تھا۔ عمر کو بھی وہاں جانا پڑا۔ باہر جانے کا چارم تو سب کو ہوتا ہے۔ بہت بڑی تنخواہ تمام تر سہولتوں کے ساتھ ملتی ہے۔ لیکن عمر کو تو یہ فرار کا اچھا موقع ملا تھا۔ گوری تو اب اُس کی دھول بھی نہ پا سکتی تھی۔ زیبی کو بھی فی الحال یہیں رہنا تھا۔ تنہائی اور یکسوئی اس کی پریشانی کا مداوا کر سکتی تھی۔

وہ اگلے ماہ پرواز کر گیا۔ زیبی کو اُس نے بلا لینے کا وعدہ کیا۔ فیملی رکھنے کی سہولت اُسے میسر تھی۔ نئی جگہ، نئے لوگ، نیا کام وہ اُن میں سا ہوگیا۔ اس کا ذہن ان میں الجھ گیا اور گوری

سے زیادتی کی جو مجرمانہ شدت تھی وہ کسی حد تک کم ہوگئی۔ اس نے سوچا وہ ہر ماہ کچھ رقم گوری کو بھیج دیا کرے گا تاکہ اور اس کا ہونے والا بچہ کسی مشکل میں نہ پڑیں۔ اُس نے اپنے آپ کو ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کی پھر بھی کبھی کبھی وہ بڑا مضطرب، بڑا بے چین اور بڑا پریشان ہو جاتا۔ گوری کو اس نے خط لکھا نہ پیسہ بھیجا۔ وہ شاید اس سے رابطے کی کوئی کڑی استوار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ زیبی کے خطوط باقاعدگی سے آتے تھے وہ بھی لکھتا تھا۔ روپے بھیجتا تھا۔ تسلیاں دیتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے گوری کا خیال بھی آتا۔ جانے وہ کس حال میں ہوگی، کیسے گزر رہی ہوگی۔ لیکن یہ خیال خیال ہی رہتا۔

ساتویں مہینے زیبی بھی اس کے پاس آگئی۔ وقت نے اس کی پریشانی کو بہت کم کر دیا تھا۔ اب گوری یادِ ماضی تھی۔ جو کبھی ذہن میں الچل مچا دیتی۔ ہاں اُس کا ہونے والا بچہ اکثر سوال بن جاتا۔

زیبی سے اولاد کی اُمید نہیں رہی تھی۔ یہاں بھی بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا گیا۔ کچھ دن بعد اگلے سال مہینے کی چھٹی عمر اور زیبی نے لندن جاکر گزارنے کا پروگرام بنایا۔ وہاں بھی مقصد اچھے اور بڑے گائنا کالوجسٹوں سے رجوع مقصود تھا۔

لیکن زیبی بانجھ ہوگئی تھی۔ خشک اور بنجر کوکھ آباد ہونے کی کوئی اُمید نہ بندھی۔

جوں جوں زیبی کی طرف سے مایوسی ہو رہی تھی عمر کے ضمیر کی خلش بڑھ رہی تھی۔ وہ سوچتا گوری نے اُس کے بچے کو جنم دے دیا ہوگا۔ اس کا اپنا بچہ، اپنا خون ۔ ان دیکھے چھوٹے بچے کا پیار دل میں درد بن کر اُمنڈنے لگتا۔ وہ اُسے دیکھنے اور پالنے کے لیے بے چین ہو جاتا۔

کبھی کبھی تو جی میں آتا کہ زیبی سے سب کچھ کہہ دے۔ لیکن اس کے کہنے سے جو نتائج برآمد ہو سکتے تھے انھیں سوچ کر ہی وہ خوف زدہ ہو جاتا۔

ڈیپوٹیشن کے تیسرے سال کے اوائل ہی میں انھیں پاکستان آنا پڑا۔ عمر کے ابو کی اچانک

ہی وفات ہو گئی تھی۔

عمر پاکستان آیا تو بے اختیار جی چاہا کہ گوری کی جا کر خبر لے لیکن حالات ایسے تھے کہ وہ جا نہ سکا۔ ابو کی وفات نے کئی مسئلے کھڑے کر دیئے تھے۔ انہیں ہی نپٹاتا رہا۔ ہاں اس نے اتنا ضرور کیا کہ کچھ روپے اپنے واپڈا کے پرانے چوکیدار کے ہاتھ محمد دین کے ہاں بھجوائے۔ بچہ اس وقت یقیناً سوا ڈیڑھ سال کا ہو گیا ہو گا۔ اماں نے اس کے لئے بھی کچھ کپڑے بھیجے تھے۔

کپڑے اور پیسے اُن لوگوں کو ملے یا نہیں۔ اُسے پتہ نہ چل سکا۔ کیونکہ چوکیدار کی واپسی سے پہلے ہی اس کی چھٹی ختم ہو گئی تھی۔ اور وہ زیبی کے ساتھ واپس چلا گیا تھا۔

وہ آتے ہی کام میں لگ گیا۔ گوری اور بچہ پھر وقت کی دھول تلے دب گئے۔

وہ شاید دبے ہی رہتے۔

لیکن۔

زیبی بنا جانے ہی انہیں دھول سے نکالنے کے عمل پر کاربند تھی۔

بچہ اُس کی کمزوری تھا۔

بچے اس کی جان تھے۔

بچوں سے وہ محروم تھی۔

بچے اُس کی کوکھ سے جنم نہیں لے سکتے تھے۔

ان دنوں وہ سنجیدگی سے کسی بچے کو گود لینے کا سوچ رہی تھی۔

"عمر۔ ہم کوئی بچہ گود لے لیں!"

"دیکھا جائے گا۔"

"نہیں عمر۔ مجھے بچہ چاہیئے۔ اُس کے لیے میں ہر قربانی دے سکتی ہوں۔ بڑی سے بڑی قربانی" ۔

عمر نے اُسے غور سے دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے بولا "جو کچھ کہہ رہی ہو۔ سوچ کر کہہ

رہی ہو؟"

"ہاں۔"

"مطلب جانتی ہو اس کا؟"

"ہاں۔ میں تمہیں بچوں کے لیے دوسری شادی کی اجازت بھی دے سکتی ہوں۔"

"مجھے شیئر کرنے کی ہمت ہے کسی دوسری عورت کے ساتھ۔" وہ اُسے آزمانے کو پوچھتا۔

وہ مایوسی سے عمر کو دیکھ کر کہتی "ہمت بالکل نہیں عمر لیکن مجھے بچے چاہئیں۔ اگر۔ تم چاہو تو کوئی بچہ گود لے لیں"۔

"پاکستان جائیں گے تو دیکھیں گے"۔ وہ گہری سانس چھوڑتے ہوئے سوچوں میں گم ہو جاتا۔

سال کے آخر میں وہ پاکستان واپس آ گئے۔ اب مالی طور پر وہ بہت مستحکم تھے۔ زیبی نے وہاں سے خوب شاپنگ کی تھی۔ سونا موتی خریدا تھا۔ گاڑی لی تھی اور خاصا بنک بیلنس لے کر واپس آئے تھے۔

زندگی کی ہر سہولت انہیں ملی تھی۔ لیکن اندر سے دونوں بے سکون تھے۔ زیبی بچوں کے لیے مری جا رہی تھی اور عمر بچے کا باپ ہوتے ہوئے بھی بے اولادی کا زہر پی رہا تھا۔

"عمر تم نے کہا تھا کہ پاکستان جا کر بچہ گود لے لیں گے"۔ ایک دن زیبی اس کے پہلو میں لیٹے لیٹے بولی۔

"ہاں"۔

"اب تو ہم آ گئے ہیں۔ سیٹل بھی ہو گئے ہیں۔ کوٹھی بھی عنقریب مکمل ہو جائے گی۔ اچھا ہی ہوا جو پچھلے سال بنوانا شروع کر دی تھی"۔

"پھر!"

"اب صرف ایک ہی کمی ہے"۔

"وہ بھی خدا پوری کرے گا۔"

"عمر! بہلاووں پر جیا نہیں جا سکتا۔ یا تو دوسری شادی کر لو۔ یا بچّہ گود لے لو۔ میرے لیے اب انتظار ممکن نہیں رہا۔"

عمر چپ ہو گیا۔ سوچنے لگا۔ کیا زیبی کو گوری اور بچّے کے بارے میں بتا دے۔ شاید آج وہ یہ ہمت کر ہی بیٹھتا۔

لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی ملازم لڑکے نے بتایا کہ کوئی اُسے ملنے آیا ہے۔

وہ اُٹھا۔ پاؤں میں چپّل پہنے قمیص کے بٹن بند کیے اور بالوں میں انگلیاں پھیرتا کمرے سے نکل آیا۔ باہر پورچ میں آنے والا منتظر کھڑا تھا۔

عمر ادھر آیا۔ تو آنے والے نے بڑے مودبانہ انداز میں سلام کیا۔ کھچڑی بالوں اور داڑھی والا دبلا پتلا رحمت علی کھڑا تھا۔ عمر کو چند لمحے اُسے شناخت کرنے میں لگے۔

یہ وہی چوکیدار تھا جس کے ہاتھ پچھلے سال اُس نے پیسے اور کپڑے گوری کو بھیجے تھے۔

"آؤ رحمت علی۔" عمر باہر لان میں چلا آیا۔ اور کرسی اُسے پیش کی۔ حال احوال پوچھتے ہوئے کہا "بیٹھو"۔

رحمت علی نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "آپ بیٹھو صاحب"۔

"کیسے آئے؟"۔ عمر کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"جی وہ۔ پچھلے سال جب آپ آئے تھے نا!"۔

"ہاں ہاں!"۔

"آپ نے اس ڈاک بنگلے کے"۔

"ہاں میں نے پیسے اور کپڑے بھیجے تھے۔ تم نے واپس آکر اطلاع ہی نہ دی کوئی۔ کیسے ہیں وہ سب لوگ"؟ عمر بے تابی سے بولا۔

رحمت علی نے اپنی ململ کی بے رنگ سی پگڑی اُتار کر گود میں رکھی اور چوکڑی مار کر بیٹھتے

ہوئے بولا۔ "صاحب جی، میں آیا تھا پر آپ جا چکے تھے واپس"۔

"کیا خبر لائے تھے؟"

"جی آپ کی امانت پہنچا دی تھی انہیں"۔

"وہ۔ وہ۔ بچّہ؟"

"بچّہ تو صاحب جی ٹھیک ٹھاک تھا۔ پر محمد دین بے چارہ!"

"کیوں کیا ہوا اُسے"۔

"جی وہ بچّے کی ماں مر گئی تھی نا۔ بے چارے کو بچّہ"۔

"کیا!"۔

عمر کا دماغ گھوم گیا۔ پھٹی پھٹی سی نظروں سے رحمت علی کو دیکھنے لگا۔ جو ساری کتھا کہانی سُنا رہا تھا۔ گوری بچّے کی پیدائش سے پہلے ہی بیمار پڑ گئی تھی۔ بچّہ پیدا ہوا تو چند دن بھی نہ جی پائی۔ محمد دین کی بیوی کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ اب بے چارے کو اکیلے بچّے کو پالنا پڑ رہا تھا۔ جو بہت مشکل تھا۔ رحمت نے ساری روداد سُنا ڈالی۔

عمر کی حالت دیدنی تھی۔ دکھ پریشانی اور ندامت نے نڈھال کر دیا۔ وہ کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا۔ پھر رحمت علی کو کچھ پیسے دے کر بولا۔ "میں چائے بھجواتا ہوں، چائے پی کر جانا"۔
وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اُٹھ کر اندر آ گیا۔

عمر بے حد پریشان تھا۔ زیبی نے پوچھا تو گول مول سا جواب دے دیا۔ دو تین دن یونہی گذر گئے۔

اُس دن زیبی نے پھر بچّہ گود لینے کی بات چھیڑی تو اُسے اپنے بچّے کا خیال آ گیا۔ وہ اچھل سا پڑا۔ ذہن نے فوراً ہی اک کہانی گھڑ لی۔ اور وہ زیبی سے بولا "تمہاری دُعا خدا نے سُن لی۔"

"جی۔ کیا۔ کیسے؟"

"تم بچہ گود لینا چاہتی ہو نا!"۔

"ہاں ہاں!"۔

"اس دن جو آدمی آیا تھا نا۔ اُس نے ایک بچے کے متعلق بتایا ہے"۔

"سچ۔ کس کا ہے کہاں ہے۔ کیا ہم اُسے گود لے سکیں گے؟"

"سکون سے رہو زیبی۔ میں ساری معلومات اکٹھی کر لوں گا۔ بچہ ضرور مل جائے گا ہمیں"۔

"خدایا۔ بچہ ضرور مل جائے گا ہمیں۔ بچہ ضرور مل جائے گا ہمیں"۔

"زیبی پُرسکون رہو۔ اتنی جذباتی نہ ہو"۔

"کس کا بچہ ہے۔؟"

"انسان کا"۔

"ہائے عمر، تم مذاق کر رہے ہو۔ دیکھو اُمید دلا کر مجھے مایوس نہ کرنا!"

"نہیں کروں گا"۔

"بچے کے والدین راضی ہو جائیں گے؟"

"اس کی ماں نہیں ہے"۔

"باپ ہے؟"

"ہاں!"

"وہ دے دے گا اپنا بچہ؟"

"یہ تو جا کر پتہ چلے گا۔ میں کل ہی ان لوگوں کے پاس جاؤں گا!"

"کتنا بڑا ہے؟"

"اِس ـ" عمر نے جلدی جلدی حساب لگاتے ہوئے کہا۔ "کوئی سوا دو سال کا ہو گا ـ دو سال چار مہینے کا ہو شاید"۔

"ہائے اللہ۔ میں اپنے آپ کو کتنا خوش قسمت سمجھوں گی عمر۔ تم کتنے اچھے ہو۔ میں تمہاری اچھائی کا مول نہیں دے سکتی عمر۔ تم۔ تم بچہ گود لینے پر آمادہ ہو گئے ہو۔ حالانکہ ــ تمہارے بچے"۔۔۔

"بس بس زیبی۔ اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیئے۔ میں کل ہی جا کر پتہ کر دوں گا"۔ دونوں پلان بنانے لگے۔ عمر بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

عمر دوسرے دن سرگودھے جا رہا تھا۔ زیبی نے بھی ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس صورتِ حال کا اُسے پتہ چلے۔ اب گوری کا وجود تو تھا نہیں۔ بچہ اُسے مل جاتا تھا۔ گوری نے مر کر سارے مسئلے حل کر دیئے تھے۔ گو دل کے کسی گوشے میں اس معاملے میں چبھن ضرور ہوتی تھی۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ اپنا خون اپنا گوشت پوست اپنا بچہ اس کے پاس ہوگا۔ اور زیبی کے گود لینے کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔

بچہ خوب موٹا تازہ تھا۔ نین نقش ماں کے سے تھے۔ لیکن رنگ خوب گورا تھا۔ محمد دین خاصا کمزور ہو چکا تھا گوری اور بیوی کی مفارقت نے اُسے وقت سے پہلے مار ڈالا تھا۔

عمر کو بچے پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ بچہ اس وقت میلے کچیلے ادھورے سے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ منہ ہاتھ مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ ناک بہہ رہی تھی۔ بال بنا دُھلی رسیوں کی طرح ہو رہے تھے۔ پھر بھی وہ اُسے اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ بار بار اُس کا مُنہ چوم رہا تھا۔ سینے سے لگا رہا تھا۔ بے حد جذباتی ہو گیا تھا وہ۔

محمد دین نے اپنی دکھ بھری کہانی اُسے سنائی۔ عمر نے بھی کئی جھوٹ بولے۔ اُن لکھی چٹھیوں کے بارے میں پوچھا۔ اپنی مجبوریاں بڑھا چڑھا کر بتائیں۔ گوری کے مرنے پر افسوس کا اظہار کیا۔

بچہ اس کا تھا۔ ویسے بھی اب محمد دین اس کے بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے رکاوٹ ڈالنے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ تو خوش تھا کہ بچہ اپنے اصلی وارث کے پاس اس کے جیتے جی پہنچ گیا۔

محمد دین کو اُس نے بہت سارے پیسے دیئے اور آئندہ بھی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ شکریے کے طور پر وہ اُس کے سامنے بچھ گیا۔

محمد دین نے بچے کو سوا دو سال تک پالا تھا۔ جُدا کرتے وقت دل خون خون ہو گیا۔ خوب لپٹا کر اُسے پیار کیا۔ پھر آنکھیں کندھے پر پڑے رومال سے پونچھتے ہوئے بچے کو عمر کے حوالے کر دیا۔

"اس کا نام کیا رکھا ہے"؟ عمر نے بچے کو چھاتی سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ظفر جی۔ ویسے گوری جتنے دن جی پائی، اسے ببلو ہی کہتی تھی۔ ہم بھی اُسے ببلو ہی کہتے ہیں۔ ظفر تو اس کا نام ہے پر بولتا ببلو کے نام پر ہی ہے۔ بڑا ہوشیار ہے جی۔ بڑی پیاری پیاری توتلی توتلی زبان میں باتیں کرنے لگا ہے اب تو"۔

محمد دین نے روتی آنکھوں سے انہیں رخصت کیا۔ عمر، ببلو کو لے کر گاڑی میں آ بیٹھا۔

گاڑی چلی تو ببلو نے بابا کو دیکھا، ہاتھ پھیلا دیئے اور چیخنے لگا۔ "بابا۔ بابا"۔

عمر نے اسے پیار کیا۔ گود میں بٹھا کر کتنی دیر ڈرائیو کرتا رہا۔ بچہ سو گیا۔ تو سیٹ پر لٹا دیا۔

عمر کے دل میں خوشی کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ بچے پر تو اُسے ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا۔ ہاں، گوری بھی ذہن میں موجود تھی۔ اُس کا دل اس کے لیے دکھ بھی رہا تھا۔ لیکن خیر۔۔۔ وہ خوش تھا۔

شام جھک آئی تھی۔ اندھیرے اُجالوں سے اُلجھ رہے تھے۔ عمر اپنے بنگلے کے گیٹ میں داخل ہوا۔ تو زیبی لپک کر گاڑی کی طرف آئی۔ عمر کے انتظار میں وہ تو بوکھلائی پھر رہی تھی۔

"کہو کیا خبر لائے۔"؟ اس نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔

عمر نے جان بوجھ کر منہ بنایا اور جلدی سے گاڑی سے نکل کر بولا۔ "سوری زیبی۔۔۔ تمہاری خواہش پوری نہ ہو سکی"۔

"عمر"۔ زیبی لرز کر گرنے کو تھی۔ عمر کو اُس کی انتہائے شوق اور بچہ پانے کی بے پایاں

خواہش نے بڑا مرعوب کیا۔ وہ اُسے بازوؤں میں بھر کر جلدی سے بولا۔ "مبارک ہو زیبی۔ مبارک ہو۔ مذاق کر رہا تھا میں تو مبارک ہو"۔

"کیا؟"۔ وہ اس کے بازوؤں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولی۔ "کیا۔ بچہ؟"

"بچہ مل گیا"۔ وہ پُرجوش انداز میں بولا۔

"سچ"۔ وہ دیوانہ وار گاڑی کی طرف بڑھی۔

"ہاں"۔ عمر نے کہا۔

"کہاں ہے؟ تم اُسے ساتھ نہیں لائے۔ بتاؤ نا"۔ زیبی پر سخت گھبراہٹ اور بے چینی طاری تھی۔

عمر نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ گندا بچہ بے خبری سے سو رہا تھا۔

زیبی جھجکی۔ پھر آگے بڑھی۔ چند لمحے یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا رہی۔ بچے کو ایک ٹک تکے گئی۔

"اٹھا لو۔ نکالو اسے باہر۔ بہت پیارا بچہ ہے"۔ عمر بڑے چاؤ اور پیار سے بولا۔

زیبی نے بے صبری اور بے تابی کا جو مظاہرہ کیا۔ وہ عمر کے لیے سکون اور اطمینان کا باعث تھا۔

زیبی نے بچے کو گود میں بھر کر اس کا چہرہ دیکھا۔ میلا کچیلا بچہ، کچھ شام کا دھندلکا اُسے بچہ بدصورت سا لگا۔ ایک دم ہی وہ اُسے پیار نہ کر سکی۔ عمر اُس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا۔ اس نے شاید چاہا تھا کہ اس کی طرح زیبی بھی بچے کو دیکھتے ہی ٹوٹ کر پیار کرنے لگے۔

وہ بچے کو اٹھائے اندر آ گئی۔ بچہ اُٹھ بیٹھا تھا۔ اور حیران حیران نظروں سے زیبی، عمر اور ملازم لڑکے کو تک رہا تھا۔ زیبی اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اُسے گود میں لیے لیے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

بچہ اجنبی لوگوں کو دیکھ کر رونے لگا۔ "بابا۔ بابا"۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے

زور زور سے پکار رہا تھا۔ زیبی اسے پیار کرنے لگی۔ وہ چپ نہ ہوا تو عمر نے اسے اُٹھا لیا۔ بہلایا پھسلایا۔ بچہ اس کے بازوؤں میں آکر چپ ہوگیا۔

"واہ جی ۔ آپ کے پاس آکر چپ ہوگیا۔" زیبی مسکرائی۔

"تم نے پیار جو نہیں کیا اسے۔ بچہ اور جانور پیار کو خوب سمجھتے ہیں۔ ممتا کے دعوے تو بہت تھے، تمہیں تو اس بچے پر ٹوٹ پڑنا چاہیئے تھا۔"

"رہنے دو۔" زیبی نے بچے کو اس کے بازوؤں سے نکال لیا۔ "دیکھتے جاؤ کتنا پیار کرتی ہوں اسے۔"

زیبی بچے کو پیار کرنے لگی۔ وہ چپ ہوگیا۔ اس نے اُسے دودھ اور بسکٹ کھلائے ذرا مانوس ہوا تو وہ اُٹھا کر کمرے میں لے گئی

تھوڑی دیر بعد وہ اُسے واپس لائی تو ببلو پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ زیبی نے اسے نہلا دُھلا کر نئے کپڑے پہنائے تھے۔ کپڑے اُس نے اسی دن خرید لیے تھے۔ ویسے بھی وہ باہر سے ڈھیروں کھلونے اور کپڑے لے کر آئی تھی۔ اس آس پر کہ جب کبھی اپنا بچہ ہوگا استعمال کرے گی۔ نہ ہوا تو گود لیے بچے کو پہنائے گی۔

زیبی بہت خوش تھی۔ چند دنوں ہی میں بچہ اس سے مانوس ہوگیا۔

زیبی کے اصرار پر عمر نے بچے کو قانونی طور پر گود لے کر اپنا وارث بنایا۔ یہ کارروائی زیبی کی خاطر اس نے کی تھی۔ ورنہ وہ جانتا تو تھا کہ اس کا وارث ببلو ہی ہے۔

ان دنوں زیبی اور عمر لاہور ہی میں تھے۔ یہیں تبدیل ہوکر آگئے تھے۔ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے والے تھے۔ بچے کو گود لینے کی انہوں نے بہت خوشی کی۔ بہت بڑی پارٹی دی۔ اپنے نئے گھر میں یہ اُن کی پہلی خوشی تھی۔

دن گزرنے لگے۔ زیبی کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ گول مٹول اور پیارا سا بچہ اُس کی بے کیف زندگی میں مسرتوں کے رنگ بھر رہا تھا۔ وہ پہلے کی طرح ہشاش بشاش رہنے لگی تھی۔

رنگ نکھر آیا تھا۔ صحت اچھی ہوگئی تھی۔ اُس کا سارا وقت بچے کی دیکھ بھال اور اس کے چھوٹے موٹے کام کرتے گزرتا۔ ببلو اب بہل گیا تھا۔ عمدہ لباس پہنتا تھا۔ رنگا رنگ قیمتی کھلونوں سے کھیلتا تھا۔ خوراک اچھی تھی۔ ان چیزوں کے علاوہ بھرپور پیار مل رہا تھا۔ یہ پیار بچے کی بنیادی ضرورت تھی۔ اب وہ بابا کے لیے چیخ چیخ کر روتا بھی نہیں تھا۔ ہاں کبھی کبھی سوتے میں ضرور بابا بابا کہہ کر چیخنے لگتا۔

عمر اب مسرور و مطمئن تھا۔ اُس کا اپنا بچہ صحیح جگہ پر آگیا تھا۔ اپنا خون تھا۔ وہ ببلو سے بہت پیار کرنے لگا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر ببلو کی ماں سے کی گئی زیادتی کا مداوا کر رہا تھا وہ دفتر جانے سے پہلے اور آنے کے بعد ببلو ہی سے کھیلتا رہتا باتیں کرتا رہتا۔ چھاتی پر لٹا کر بھینچ لیتا۔ زیبی اُس کے والہانہ انداز سے بڑی متاثر تھی۔

اُس دن بھی جب وہ ببلو کو چھاتی پر لٹائے اُسے بار بار چوم رہا تھا۔ زیبی بیڈ روم میں آئی۔ وہ کتنی ہی دیر دروازے میں کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔ عمر ببلو میں اتنا مگن تھا کہ اُسے زیبی کے آنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ کئی لمحوں بعد زیبی نے مسکراتے ہوئے کھنکارا۔ تو عمر نے چونک کر ادھر دیکھا۔ ایک لمحے کو وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ "آؤ زیبی آؤ۔" وہ ببلو کو پہلو میں لٹاتے ہوئے بولا۔

"ماما" ۔ ببلو نے ہاتھ پھیلا دیئے۔

"لو صاحبزادے۔ ماما آگئی تو ہم سے نظریں بدل لیں"۔ عمر نے ببلو کے گال پر ہولے سے چپت لگائی۔ زیبی نے آگے بڑھ کر ببلو کو اُٹھا لیا۔

"بیٹھو!" عمر نے تکیے کے سہارے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"عمر!"

"ہوں!"

"تمہیں ببلو سے بہت پیار ہے!"

"ہاں - کیا نہیں ہونا چاہیئے !"

"کیوں نہیں ہونا چاہیئے "۔ وہ پٹی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ببلو اُس کی گود سے اُتر کر کمرے کے کونے میں پڑی ڈنکیوں سے کھیلنے لگا۔

"تو پھر" ۔ عمر نے زیبی کی طرف کچھ نہ سمجھتے ہوئے دیکھا۔

"یہ بات میرے لیے بڑی تسکین والی ہے "

عمر نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا۔

زیبی بولی "تمہارا پیار دیکھ کر لگتا ہے انہیں بھی بچوں کی زبردست خواہش تھی۔ لیکن۔ لیکن تم نے کبھی اس بات کا احساس نہیں دلایا تھا۔ تم کتنے اچھے ہو عمر"۔

عمر ہنس پڑا ۔ "اچھا تو میں ہوں ہی"۔

"میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں عمر۔ بچہ گود لینے سے پہلے مجھے دھڑکا ہی لگا رہتا تھا کہ کسی غیر بچے کو اپنا نہ سکو گے۔ باپ کا پیار نہ دے سکو گے۔ میری مجبوری سے مجبور ہو کر سمجھوتا کرو گے۔ لیکن اب میں دیکھتی ہوں تو لگتا ہے شاید مجھ سے بھی زیادہ تمہیں بچے کی خواہش تھی جبھی تو ببلو سے اتنا پیار کرنے لگے ہو "

"ہاں زیبی، شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن اب " وہ چند لمحے کو رُکا۔ پھر زیبی کو پیار سے گھورتے ہوئے بولا۔ "اب یہ سارے کھٹکے ذہن سے نکال دو۔ خدا نے ہمیں بچے جیسی نعمت سے نواز دیا ہے۔ اتنا ہی کافی ہے۔ ببلو تمہیں عزیز ہے تو مجھے بھی بہت پیارا ہے۔ زندگی ہے میری"۔

زیبی کے چہرے پر سکون و اطمینان کی لہریں دوڑ گئیں، وہ اُٹھی اور ببلو کی اُنگلی پکڑ کر کمرے سے باہر لے گئی۔

عمر ٹکٹکی باندھے چھت کو تکنے لگا۔ وہ واقعی ببلو سے بہت پیار کرنے لگا تھا۔ اتنا پیار شاید دیکھنے والوں کو غیر فطری لگتا تھا۔ کسی پرائے بچے سے کوئی اس طرح ٹوٹ کر پیار کر سکتا تھا!

عمر کے ذہن میں سوچوں کے غبار اُٹھنے لگے۔ وہ گھبرانے لگا۔ سوچنے لگا ۔ کیا اُسے زیبی

کو بتا دینا چاہیئے۔ کیا اعترافِ حقیقت کر لینا چاہیئے؟ راز از خود افشا ہونے سے پہلے ہی فاش کر دینا کیا اس کے لیے اچھا نہیں تھا۔

جب سے وہ ببلو کو لایا تھا۔ یہ سوچیں اس کے ذہن کا احاطہ کیے رہتیں، ضمیر پہ بوجھ سا محسوس ہوتا۔ ببلو کی اصل حیثیت پہ پردہ ڈال کر وہ اپنے آپ کو کو تک کا زیادہ ہی گناہ گار سمجھنے لگا تھا۔

لیکن ۔

کیا زیبی سے سب کچھ کہہ دینا مناسب تھا؟ وہ اُس کی لغزش کو معاف کر سکے گی؟ — گھر کی خوشگوار اور خوشیوں سے بھرپور فضا متاثر نہ ہوگی؟

وقت اسی ادھیڑبُن میں گزرتا جا رہا تھا۔ زیبی لاعلم تھی۔

ببلو کو آئے تین چار ماہ ہو چکے تھے۔ زیبی نے اپنا سارا پیار اس پر نچھاور کیا تھا۔ ساری ممتا لٹائی تھی۔ وہ اُسے ایک پل کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ اسی لیے کبھی کبھی گھبرا بھی جاتی۔

"عمر۔ ببلو ہمیشہ میرے پاس ہی رہے گا نا؟ چلا تو نہیں جائے گا کہیں"۔

"تم نے اس کے باپ سے ہمیشہ ہی کے لیے لے لیا ہے نا"۔

"کبھی بچے کے پیار سے مجبور ہو کر وہ لینے آ گیا تو۔ عمر میں ببلو کی جُدائی برداشت نہ کر سکوں گی "

"اس سے لکھوا لیا تھا نا؟ پکے کاغذ پر لکھوا لیا تھا؟"

"اُسے پیسہ دے دیا تھا نا؟ وہ اب اس پر حق تو نہیں جما سکتا نا؟"

وہ اکثر گھبرا کر پریشان ہو کر ایسی باتیں کرنے لگتی۔ عمر اُسے تسلی دلاسا دے دیتا۔ بچہ ہمیشہ اُس کے پاس رہے گا۔ وہ اسے پورا اطمینان دلاتا۔

زیبی کا یہ وہم اور دھڑکا عمر کی سوچوں کے تانے بانے اُلجھا دیتا۔ وہ اتنی وہمی ہو گئی تھی

کہ بچے کو چند منٹ اِدھر اُدھر ہوتے دیکھتی تو پاگلوں کی طرح آوازیں دینے لگتی۔ بچہ اور وہ لازم و ملزوم تھے۔ اس کے بغیر وہ اب شاید سانس بھی نہ لے سکتی تھی۔ پیار جتنا گمبھیر ہوتا جا رہا تھا اس کا وہم بھی اتنا ہی تنومند ہوتا جا رہا تھا۔

اب ایسی اسٹیج آگئی تھی کہ عمر سوچتا تھا زیبی پر حقیقت آشکار کر ہی دے۔ اُسے بتا ہی دے کہ ببلو اُس کا اور صرف اُس کا بیٹا ہے۔

اس دن بھی ببلو کچھ دیر کے لئے گیسٹ روم کے بیڈ تلے گھسا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ زیبی کی آوازوں پر بھی باہر نہ نکلا۔ وہ اُسے ہر کمرے میں دیکھ آئی۔ کہیں نہ ملا۔ تو بے اختیارانہ چیخ اُٹھی۔ حواس باختہ سی بھاگی آئی۔ "ببلو۔ ببلو کو کوئی لے گیا عمر۔ ببلو کو کوئی لے گیا۔" وہ بیڈ روم میں آتے ہی دھڑام سے بیڈ پر گری۔

"کیا؟" عمر آرام سے لیٹا میگزین دیکھ رہا تھا۔ گھبرا کر رسالہ پھینکتے ہوئے زیبی کو تھاما۔ وہ پسینے سے شرابور تھی۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

"ببلو نہیں ہے عمر۔ اُسے اُس کا باپ"۔ زیبی ہانپتے ہوئے سینے پر ہاتھ مار رہی تھی لیکن ابھی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ ملازم لڑکا ببلو کو اٹھائے ادھر آگیا۔

"یہ ہیں ببلو بابا"۔ وہ بولا۔ "پلنگ کے نیچے گھسے کھیل رہے۔ گیسٹ روم میں۔"

"اوہ خدایا"۔ زیبی تیر کی سی تیزی سے ببلو کی طرف گئی۔ اُسے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ پھر بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ "ببلو کہاں چلے جاتے ہو تم"۔

عمر اُس کا والہانہ پیار دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔

زیبی اُسے بازوؤں میں بھرے بھرے بیڈ کے کنارے پر آبیٹھی۔ ببلو اُس کی گود سے نکل کر عمر کے پاس آگیا۔

"اُف کتنا پریشان کیا اس نے"۔ زیبی پیار سے اس کے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے

روتی آنکھوں سے مسکرائی "میں تو سمجھی اس کا باپ آگیا کہیں سے"۔

"اس کا باپ کہیں سے نہیں آئے گا زیبی۔ کیونکہ اس کا باپ یہیں ہے"۔ عمر نے شاید حقیقت کا اعتراف کرنے کی نیت کر لی تھی۔ زیبی کو آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زیبی کے وسوسوں، خدشوں اور کھٹکوں کے پیشِ نظر اُسے ایسا کرنا ہی تھا۔

"یہیں ہے"۔ زیبی بچے کو چھپانے کے لیے جھپٹی۔

عمر نے ببلو کو ساتھ لگا کر زیبی سے کہا "تسلی رکھو۔ اس کا باپ اپنے بچے کو تم سے نہیں چھینے گا"۔

زیبی بے یقینی حیرانی سے اُسے تکنے لگی۔ پھر بولی۔ "تمہیں پورا یقین ہے نا؟"۔

"ہاں۔ اس لیے کہ اس بچے کا باپ کوئی اور نہیں۔ میں ہوں"۔ عمر نے ببلو کا منہ چوم لیا۔

"میں اس کے اصلی باپ سے ڈرتی ہوں عمر"۔ زیبی اُس کی بات نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

"کہہ دیا نا، مت ڈرو۔ اس کا اصلی باپ میں ہی ہوں"۔ وہ جھٹ سے بولا۔

"ت۔ تم"۔ وہ بے یقین نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں"۔ عمر کا لہجہ سنجیدہ اور آواز مستحکم تھی۔

"مذاق کر رہے ہو"۔ وہ اب بھی بے یقین تھی۔

"نہیں۔ سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں"۔ وہ بچے کو بیڈ سے اُتار کر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"عمر!"۔ وہ حیرت زدہ تھی۔ عمر اُسے غور سے تکنے لگا۔ چند لمحے تکتا رہا پھر اس کے کندھے پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"زیبی۔ حوصلہ رکھو۔ ببلو کے متعلق میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ یہ میرا بچہ ہے۔ میرا اپنا بچہ۔ اس لیے تم سارے وہم اور وسوسے اپنے دل سے نکال دو۔ اِسے تمہاری گود سے کوئی نہیں چھینے گا۔ کوئی نہیں"۔

زیبی حیران، ہراساں اور بے تکی سی نظروں سے اُسے تکنے لگی۔

عمر نے جلدی جلدی ساری حقیقت اس پر منکشف کردی۔ وہ زیبی کے تاثرات اور جذبات کو نظر انداز کرتے ہوئے باتیں کیے گیا۔ اُس کا من ہلکا ہوتا گیا۔ ضمیر سے بوجھ اُترتا گیا۔ گوری کے بچے کو زیبی کے سامنے اپنا مان کر اس نے گوری کا قرض بھی چکا دیا۔ اب وہ مطمئن تھا۔ پُرسکون تھا لیکن زیبی۔

زیبی بُت بنی ششدر سب کچھ سُنے گئی۔ اُسے تو عمر کی باتوں پر یقین ہی نہ آ رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر سُن سی رہی۔ عمر اپنے جرم کی اُس سے معافیاں مانگتا رہا۔ اپنی لغزش پر نادم بھی ہوا۔ بہت سا وقت گزر گیا۔

"تو۔ تو ببلو۔ تمہارا بیٹا ہے۔" اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے عمر اور ببلو کو دیکھا۔

"ہاں زیبی۔ اب یہ میرا نہیں تمہارا بھی بیٹا ہے۔ ہم دونوں کا ہے۔ تم اس کے متعلق ہر دھڑکا، ہر وہم دل سے نکال دو۔ میں حقیقت تم پر منکشف کر چکا ہوں۔ میرے ضمیر پہ بڑا بوجھ تھا۔ گو دیر سے بولا ہے لیکن سچ آخر بول ہی دیا ہے۔"

زیبی ٹکر ٹکر دونوں کو تکے گئی۔

"ماما"۔ ببلو باپ کے پہلو سے اُٹھ کر زیبی کی طرف بڑھا۔ لیکن زیبی نے اُسے اُٹھایا نہیں۔ اُس کے ننھے سے ہاتھ جھٹک کر وہاں سے اُٹھ گئی۔ ببلو گلا پھاڑ کر چیخنے لگا۔ عمر ہکا بکا سا رہ گیا۔ اُسے بہت صدمہ پہنچا تھا۔ عمر کو احساس تھا۔ اس لیے وہ روتے بسورتے ببلو کو وہیں چھوڑ کر زیبی کے پیچھے لپکا۔ زیبی نے دوسرے کمرے میں جاکر دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ عمر دروازہ پیٹتے ہوئے اُسے آوازیں دینے لگا۔

اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ ہاں، اُس کے چیخ چیخ کر رونے کی آوازیں آتی رہیں۔

عمر وہیں کھڑا رہا۔ زیبی کا یہ ردِ عمل یقینی تھا۔ رو دھو کر دل کی بھڑاس نکال لینا ضروری تھا۔ عمر نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ زیبی کا غصہ فرو ہو

جائے گا۔ وہ اسے معاف کر دے گی۔ وہ اُس کے سامنے اپنے جرم کی سزا پانے کے لیے اور بھی جھکنے کو تیار تھا۔ اُس کے پاؤں پڑ کر معافی مانگنے پر آمادہ تھا۔ قصوروار تھا۔ اعتراف کر لیا تھا تو اب سزا بھی بھگتنے کو تیار تھا۔ لیکن اعتماد کی شکست معمولی بات نہیں ہوتی۔ زیبی تو ٹوٹ کر بکھر گئی۔ کئی دن ذہنی کشمکش نے نیم دیوانہ کیے رکھا۔ کبھی بالکل پتھر کی مورت بن جاتی۔ کبھی چیخنے چلاّنے لگتی۔ ہذیانی کیفیت طاری ہونے لگتی۔ ہاتھ پاؤں مڑ جاتے، دانت بند ہو جاتے۔ وہ عمر کی شکل نہ دیکھنا چاہتی، بے عزتی کرتی۔ بُرا بھلا کہتی۔ گالیاں بکتی۔

عمر نے بڑے صبر و تحمل سے یہ سب کچھ جھیلا۔ قصوروار تھا۔ اس لیے زیبی کی زیادتیوں کو چپکے سے پی گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ زیبی بچے سے بھی غافل ہو گئی۔ عمر کی بھی شکل دیکھنے کی روادار نہیں رہی۔ لیکن بالآخر اُسے اپنے آپ پر قابو کرنا پڑا۔ نارمل ہونا پڑا۔ عمر کی معافیوں تلافیوں کے سامنے چپ ہو جانا پڑا۔ زندگی گزارنے کے لیے حالات سے سمجھوتا کرنا ضروری تھا۔

یہ سب کچھ تو ہو گیا۔ پر وہ ببلو کو اپنا لے پالک تسلیم نہ کر سکی۔ ببلو اُس کی سوتن کا بچہ تھا اور سوتن کے بچے کے لیے اُس کے من میں زہر ہی زہر بھر گیا تھا۔ محبت کا وہ بیج جو دل میں گود لیے بچے کے لیے بویا تھا وہ اچانک ہی نفرت کا پودا بن کر پھیلنے لگا تھا۔ اس کی ممتا کے سارے جذبے جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ سوتیلے پن کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ اس آگ میں۔ نفرت اور انتقام کی آگ میں۔ ننھا سا وجود معصوم سا بچہ۔ مقدس سا پیکر، پیارا پیارا گل گوتھنا سا ببلو جلنے لگا تھا۔

زیبی پر جب وحشت مسلط ہو جاتی تو وہ بے گناہ معصوم بچے پر اتنے ظلم ڈھاتی کہ انسانیت بھی لرزہ براندام ہو جاتی۔ وہ اس کے کان مروڑ ڈالتی۔ بال نوچ لیتی۔ اتنے زور زور سے تھپڑ لگاتی کہ اس کے پھول ایسے گالوں پر نشان پڑ جاتے، کھڑے کھڑے کو دھکا دے کر گرا دیتی۔ اُس کے منہ سے خون نکلنے لگتا۔ دانتوں سے زبان کٹ جاتی۔ اُس کا سارا جسم نیلا

نیل نیل رہتا۔ چھری، جوتی، لوہا، لکڑی، جو چیز بھی ہاتھ میں آتی اس سے پیٹ ڈالتی۔ آج بھی اُس نے معصوم وجود کو گرم چمٹے سے داغ داغ کیا تھا۔

عمر بچے کے اک اک داغ پر ہونٹ رکھ رہا تھا۔

اس کا دل کٹ رہا تھا۔

زیبی پر بے طرح غصہ آ رہا تھا۔ وہ اتنی جنگلی، اتنی وحشی اور ایسی درندہ بن جاتی تھی۔
اسے اپنا غصہ عمر پر نکالنا چاہیئے تھا۔ اس بے ماں کے بچے پر اتنا ظلم دیکھ کر تو آسمان بھی کانپ جاتا تھا۔

وہ لیٹے لیٹے سوچ رہا تھا۔

بچے کی وجہ سے دونوں میں کئی بار لڑائی جھگڑا ہو چکا تھا۔ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے والے میاں بیوی بعض اوقات تو جانی دشمن نظر آتے تھے۔ عمر سے زیبی کی زیادتی اور ظلم سہے نہ جاتے تھے۔ اُس نے تو بچے ہی کو نشانہ بنا لیا تھا۔

بچہ وہی تھا۔

جس کے لیے زیبی کے من میں پیار کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔

جسے پا کر وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی تھی۔ جس کے لیے اُس نے اپنا دنوں کا چین اور راتوں کا آرام تج دیا تھا۔ جو بچے کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھی۔ جو جاگتا تھا تو اُس کی بانہوں کے ہنڈولوں میں جھولتا تھا اور سوتا تھا تو وہ اُسے پہروں ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی تھی۔
اسے اپنے ہاتھوں سے نہلاتی تھی کھلاتی تھی۔ لوریاں سُناتی تھی۔ نظروں سے اوجھل ہوتا تو پاگلوں کی طرح آوازیں دینے لگتی۔ تلاش کرنے لگتی تھی۔

لیکن ۔

اب ۔
سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ ماں سے ڈائن بن گئی تھی۔ عورت بھی نہیں رہی تھی ۔۔

اتنی بے درد اور ایسی ظالم عورت۔ جسے عورت کہنا شاید نسوانیت کی توہین تھی۔

عمر حیران ہو ہو کر سوچ رہا تھا کہ بچہ تو آخر بچہ ہی تھا نا۔

وہ تو پیدائشی ماں تھی۔ ببلو کے متعلق اُسے جب تک پتہ نہیں تھا۔ وہ ایک غیر کا بچہ تھا تو زیبی ممتا کی پھوار اُس پہ برسا رہی تھی۔ لیکن یہی بچہ۔ جب اُسے پتہ چلا کہ اس کے شوہر کا اپنا بچہ ہے۔ تو وہ ۔ ماں سے ڈائن بن گئی۔ کیوں؟

بچے کا کیا قصور تھا۔

وہ تو معصوم تھا۔

مقدس تھا۔ اور زیبی کی کمزوری تھا۔ پھر ۔ وہ کیوں اس طرح بدل گئی تھی؟

ببلو اس کے قریب ہی گھڑی سے کھیل رہا تھا۔ عمر آنکھیں بند کیے پڑا دکھ اور کرب سے سوچ رہا تھا۔ اس کیوں کا جواب پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن سوچنے کے باوجود وہ اس کوشش میں ناکام تھا۔

عورت کی نفسیات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

بالکل بھی نہیں آ رہی تھی۔

نفرتیں کیسی

طیارہ فضا میں تیزی سے پرواز کر رہا تھا۔ اور اس سے کہیں زیادہ تیزی سے طارق کے خیالات ماضی کی سمت محو پرواز تھے۔ وہ اپنے آپ میں گم تھا۔ کبھی کبھی اس کی نگاہ طیارے میں بیٹھے مسافروں پر پڑ جاتی۔ سب لوگ سفر کر رہے ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے تھے۔ کوئی اپنوں سے بچھڑ کر جا رہا تھا، کوئی اپنوں سے ملنے جا رہا تھا۔ ضرورتیں بھی لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں

طارق بھی اپنے وطن جا رہا تھا۔ سوا چھ سال کے عرصے کے بعد دیارِ غیر میں یہ مدت گزار کر۔ سوا چھ سال پہلے جب وہ گیا تھا تو اکانومی کلاس میں تھا۔ اور اب فسٹ کلاس میں بیٹھا تھا۔ اکانومی سے فسٹ کلاس میں وہ ایک جست میں پہنچا تھا۔ اس نے پورے سوا چھ سال سفر میں گزارے تھے۔ نیچے سے اوپر جانے کے سفر میں۔ اس سفر میں کرب کے راستے بھی تھے صعوبتوں کی راہیں بھی۔ لیکن ایک عزم لیے اس نے ان راستوں پہ قدم رکھا تھا۔ ان صعوبتوں سے نمٹنے کے لیے اُس نے دل دماغ اور ذہن کی ساری ہمتیں اور صلاحیتیں صرف کر دی تھیں۔

اُس نے قسمت سے مانگا نہیں تھا چھین لیا تھا اور اتنا چھینا تھا کہ شاید اب اس کے دامن میں بھرنے کی گنجائش بھی نہیں رہی تھی۔ اُس نے دل میں عہد بھی تو یہی کیا تھا کہ جب دامن میں سمیٹنے کی گنجائش نہ رہے گی تب ہی وطن لوٹے گا۔

وہ ان دنوں امریکہ کے شہر نیویارک میں مقیم تھا۔ اُس کا بزنس بہت پھیل چکا تھا۔ اُس کے آفس میں کچھ پاکستانیوں کے ساتھ غیر ملکی بھی ملازم تھے۔ دولت کی دیوی اُس کے گھر کی باندی تھی۔

بقول کسے، وہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتا تھا تو سونا بن جاتی تھی۔

بڑے خوش پوش علاقے میں اُس نے گھر خریدا تھا۔ ایکڑوں زمین اس خوبصورت ولا کو گھیرے تھی۔ بینظیر لان اس حسین ولا کی سجاوٹ اور خوبصورتی میں اضافہ کرتے تھے۔ امریکہ جیسی جگہ میں ایسے گھر صرف کروڑپتی لوگوں ہی کے مقدر کا حصہ تھے۔

کئی پاکستانی اور ہندوستانی لڑکیوں کے علاوہ امریکن لڑکیاں اس کے اردگرد منڈلاتی رہتی تھیں۔ اُس کی سیکریٹری اس کی محبت کا دم بھرتی تھی۔ لیکن طارق نے کبھی اس بارے میں شاید سوچا بھی نہیں تھا۔ فلرٹ کرنا اس کی عادت نہیں تھی۔ اور شادی وہ ان میں سے کسی کے ساتھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

شادی تو اُس کو وطن آ کر کرنا تھی۔

اور اب وہ وطن آ رہا تھا۔ شادی کرنے کے لیے۔

طیارہ جانبِ منزل رواں دواں تھا اور وہ اپنی آرام دہ سیٹ پہ بیٹھا بڑی ہی بے آرامی کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ بیتی باتوں کی تپتی سلاخیں اُس کے ذہن کو کرب و اذیت سے داغ رہی تھیں۔

وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔ پھر بھی اندرونی کیفیات اُس کی بے چین حرکتوں سے عیاں تھیں۔ کبھی کبھی تو اُس کے خوبصورت چہرے پر اتنا تناؤ آ جاتا کہ اُسے جلد میں تکلیف کا احساس ہونے لگتا۔ اُس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے آسٹریلوی سیاح کی نظریں اس تناؤ کو محسوس کر چکی تھیں۔ اُس نے ایک دو بار اُس سے بات بھی کی تھی۔ لیکن وہ جواباً مسکرا کر رہ گیا تھا۔

ایئر ہوسٹس بھی اُس کے پاس دو تین بار آ چکی تھی۔ اپنی حسین مسکراہٹوں کی نرم پھوار برساتے ہوئے اُس نے پوچھا تھا۔ "سر آپ کچھ ڈسٹرب ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ کوئی پرابلم ؟" اُس نے چہرے پر خوبصورت مسکراہٹوں کا خول سجا لیا تھا۔ سر کے اشارے سے اُس کی ہمدردی کی نفی کر دی تھی۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ ایئر ہوسٹس سے ایک رسالہ لے لیا تھا۔ اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا تھا

لیکن وہ تو سفر پر رواں تھا. ماضی کے سفر پر پیچھے لوٹ جانے کے سفر پہ۔ پھر بھلا کیونکر حال سے نباہ کر پاتا۔

اُس نے سیٹ پیچھے کی اور اس کی پشت پر سر ٹکا کر نیم دراز ہوتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں گردوپیش سے فرار کا کتنا مفید طریق تھا یہ۔

لیکن ان لوگوں سے تو فرار مقصود ہی نہ تھا کچھ مسافر تھے، کچھ عملے کے لوگ۔ سب غیر۔ سب اجنبی۔ سب محدود وقت کے ساتھی۔ فرار کا سکون تو جب حاصل ہوتا. جو وہ اپنے آپ سے پیچھا چھڑا سکتا. اپنے ماضی کے دریچوں کو بند کر سکتا۔

وہ ایسا نہیں کر سکا۔

وہ ایسا کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

وہ پیچھے لوٹ گیا تھا۔

پیچھے۔ جہاں اس کی زندگی کے اُنیس بیس برس بکھرے پڑے تھے۔

کچھ حسین

کچھ سنگین

کچھ پھولوں کی طرح مہکتے ہوئے۔

کچھ کانٹوں کی خراشوں سے زخمی۔

زخمی اور لہولہان

وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں کا۔ کیونکہ باپ کو تو اس نے دیکھا ہی نہیں تھا. دیکھا بھی تھا. تو یادوں کی پرت میں اس کی شبیہہ محفوظ نہ تھی. یتیمی کا داغ اس نے اڑھائی تین برس کی عمر میں پایا تھا. اس کی ماں صابرہ، صرف نام ہی کی صابرہ نہیں تھی۔ دراصل صبرِ مجسّم تھی. نوعمری کی بیوگی کا بار جس تحمّل اور بردباری سے اس نے اٹھایا تھا. وہ ایک مثال تھی۔

زاہد چند دن بیمار رہ کر چل بسا تھا. صابرہ پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ اپنے سسرالی گھر

میں رہ رہی تھی۔ میکہ لاہور میں تھا۔ جلال پور جٹاں میں بیاہ کر آئی تھی. میکے اور سسرال کے طرزِ رہائش میں بہت فرق تھا. لیکن اس نے اس گھر کو اپنا اوّل و آخر جانا تھا. خود کو ہر طرح سے ڈھالنے کی کوشش کی تھی. زاہد تو اس سے بہت خوش تھا. لیکن سسرال والوں نے اسے بہو ہی جانا تھا. بہو جو ان پڑھ لوگوں میں پڑھی لکھی تھی. جو دیہاتی قسم کے لوگوں میں لاہور کی تہذیب یافتہ لڑکی تھی۔ ساس نندوں نے انہی باتوں کو موضوع بنایا تھا. روائتی رشتے ہی کی روایت قائم کی تھی۔

لیکن صابرہ نے ہر حال میں نباہ کرنے کی ٹھانی تھی. اس کی وجہ زاہد کی شخصیت اور محبت بھی تھی۔ وہ اس پہ پروانہ وار فدا تھا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ بہت ــ بہت خوش ــ اتنے خوش کہ اُن کی خوشی اہلِ خانہ کو کھٹکتی تھی۔ لیکن دونوں ہی ایک دوسرے میں مست تھے۔ انہیں کسی کی پروا کب تھی۔

اُن کی خوشیاں بڑھ رہی تھیں پھیل رہی تھیں اور جب ننھے منّے سے طارق نے صابرہ کی گود بھری، تو دونوں بہک بہک گئے۔ یہ پیارا سا جیتا جاگتا کھلونا اُن کے لیے ایک عجوبہ ہی تو تھا.

زاہد اُسے گود میں بھر کر پیار کرتے ہوئے اکثر کہتا. "بچے تو بہت دیکھے ہیں۔ لیکن یہ کوئی انوکھی ہی چیز ہے"

صابرہ ہنس کر کہتی "اپنا ہے نا۔ بالکل اپنا۔"

"کتنا خوبصورت ہے"

"مجھ پر گیا ہے"

"واہ جی۔ مجھ پر گیا ہے۔ دیکھ لینا ذرا بڑا ہوگا تو ہوبہو میری تصویر ہوگا۔"

"جی نہیں میری شبیہہ ہوگی۔"

"اوں ہوں۔"

"تو کیا میں خوبصورت نہیں بدصورت ہوں؟"

"بھئی صابرہ تم جو کچھ بھی ہو، اُس سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو۔ یہ تو جنت کا پھول

ہے۔ شگفتہ۔ مہکتا۔ لہلہاتا۔"

"بیٹا تو میرا ہی ہے نا۔ فخر تو میں ہی کر سکتی ہوں اس پہ۔ اتنی حسین اور پیاری شے تمہیں میں نے دی ہے۔ اپنی جان پر کھیل کر۔"

"واقعی صابرہ واقعی۔ میں تمہارا احسانمند ہوں۔"

زاہد سر جھکائے عقیدت سے ہاتھ ماتھے تک لے جاتا۔ اور پھر دونوں کھل کھلا کر ہنس دیتے۔

اُن کی ہنسی ساس نندوں کو کہاں اچھی لگتی تھی۔ زاہد تو شادی کر کے ہی صابرہ کا متوالا ہو گیا تھا۔ اب بچے کی وجہ سے تو جیسے اُسے کسی سے تعلق و سروکار ہی نہ رہا تھا۔

ماں یہ ہنستی سنتی تو منہ بنا کر کہتی "اُن کے انوکھا ہی بیٹا ہوا ہے۔"

نند جل بھُن کر سُناتی "اپنے تو اوپر تلے تین بیٹے ہوئے۔ شوہر نے یہ کچھ نہیں کیا۔ ناز برداریاں ہی ختم نہیں ہو رہی ہیں۔ بیگم صاحبہ کی۔"

جٹھانی جس کی اوپر تلے تین بیٹیاں ہو چکی تھیں، حسد سے کہتی "اُس نے کہیں دوسری دفعہ بھی بیٹا پیدا کر لیا تو عرش پر اُڑتی پھرے گی۔"

لیکن دوسرے بیٹے کی نوبت ہی نہ آئی۔

زاہد صابرہ اور طارق کو بے سہارا چھوڑ کر چند دن کی بیماری کے بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔

صابرہ پر قیامت نہ ٹوٹتی تو اور کیا ہوتا۔

وہ تو پاگل سی ہو گئی کئی ماہ تو اُسے اپنا ہوش رہا نہ بچے کا۔ وہ تو لاہور سے امی آگئی تھیں ... جنھوں نے بچے کو بھی سینے سے لگایا اور صابرہ کو بھی۔

صدمے بڑی سفاکی سے ٹوٹتے ہیں۔

لیکن

اتنے سفاک نہیں ہوتے کہ ایک ہی جگہ جم کر رک جائیں۔ سفاکی کا عمل اچانک ہوتا ہے۔ لیکن اس میں ٹھہراؤ عام طور پر نہیں ہوتا۔ بڑی دھیمی اور مدھم رفتار سے چلتا جاتا ہے اور اسی

دھیمے پن میں اس کی شدت کم ہوتی جاتی ہے۔ ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ عمل اس طرح نہ ہوتا۔ تو زندگی رک جاتی ہے ختم ہو جاتی۔ مسلسل نہ رہتی۔

چند ماہ بعد جب صابرہ کچھ سنبھلی تو لاہور سے ابا آ گئے جوان جہان بیٹی بیوہ ہو گئی تھی۔ دیور جیٹھوں اور نند دیئوں والا گھر تھا۔ انہوں نے مناسب یہی سمجھا کہ صابرہ کو لاہور اپنے ہاں لے آئیں۔ وہ اس قابل تھے کہ صابرہ اور اس کے بچے کا بار اُٹھا سکتے۔ چار ہی تو بچے تھے۔ بڑا بیٹا عابد اپنے بال بچوں سمیت برس ہا برس سے کویت میں تھا۔ دوسرے چوتھے سال چند دنوں کے لیے آتا تھا۔ ویسے باپ کی مالی مدد میں کبھی تاخیر نہ کی تھی۔

صابرہ تینوں بہنوں میں تھی۔ اس سے دو سال چھوٹی عامرہ کی شادی ایک متمول خاندان میں ہو چکی تھی۔ تیسری بیٹی شاکرہ کی بھی زاہد کے فوت ہونے سے چند ماہ پہلے شادی ہو چکی تھی۔ گھر میں اب ماں باپ یوں بھی اکیلے تھے۔ صابرہ کے اُجڑنے کا دکھ تو تھا۔ لیکن اسے پاس رکھ کر تسکین کا سامان ہو سکتا تھا۔

صابرہ کے ابو نے دھندلائی آنکھوں اور بھرّائی آواز میں اُس کی ساس سے کہا۔ "بہن آپ اجازت دیں تو ہم صابرہ کو اور طارق کو لاہور لے جائیں۔"

"کیوں؟" ساس نے سبکی محسوس کی۔ "کیا ہم اُن کا بار نہیں اُٹھا سکتے؟"

"اُٹھا سکتے ہیں بہن"۔ صابرہ کی امی نے روتی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

"تو پھر۔ آپ لوگوں نے یہ بات ہی کیوں کی۔" ساس تنک کر بولی۔ پھر وہ اپنے بیٹے کو یاد کر کے بین کرنے لگی۔ جگر گوشے کے بچھڑنے کا غم اُسے بھی تو تھا۔

صابرہ کے ابو نصیر احمد جہاندیدہ آدمی تھے۔ اس موقعے پر بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ خاموش ہو گئے۔

"صابرہ آپ کی بیٹی ہے۔" ساس نے کہا۔ "لیکن میرے زاہد کی امانت ہے۔ جب تک میں جیوں گی اُسے سینے سے لگا کر رکھوں گی۔ ہاں اگر جوان بیٹی کے لیے آپ کے کوئی اور ارادے ہوں تو..."

ساس کی بات سمجھتے ہوئے صابرہ چیخ اٹھی روتے روتے بے حال ہوگئی۔ ایسا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ گھر میں چند سمجھ دار لوگ بھی تھے۔ انہوں نے سب کو سمجھایا بجھایا۔

صابرہ نے اپنے ماں اور باپ سے کہہ دیا" میں یہیں رہوں گی۔ یہ میرے زاہد کا گھر ہے۔ میرے بچے کا گھر ہے۔"

"ٹھیک ہے" نصیر احمد نے بے دلی سے سر ہلایا۔ تجربہ کار آدمی تھے۔ جانتے تھے۔ اس طرح یہاں رہنے سے صابرہ کی زندگی مشکلات سے دوچار ہوگی۔ سسر تھا نہیں۔ دیور جیٹھ کب تک اُس کا بار اُٹھا سکتے تھے۔ بہرحال ساس کی ضد پر اس وقت انھیں چپ ہونا پڑا۔

دوسرے دن جب نصیر احمد، صابرہ کی ماں کو ساتھ لے کر واپس جانے لگے تو ساس نے ازراہِ ترحم کہا" صابرہ بیٹی، کچھ دنوں کے لیے لاہور چلی جاؤ۔"

صابرہ چپ ہوگئی۔

امی نے بیٹی کو گلے سے لگا کر کہا" چل صابرہ کچھ دنوں کے لیے چل۔ کچھ تو فرق پڑے گا ماحول تبدیل ہونے سے۔ یہاں تو مر جائے گی غم سے۔"

"مر تو میں گئی ہوں امی" صابرہ نے گہری سانس لی" زاہد کے بغیر زندگی، زندگی تو نہیں نا"

"خدا تیرے بچے کو سلامت رکھے بیٹی۔"

"اسی کے سہارے تو جی لوں گی امی۔ زاہد نہیں تو اُس کی امانت تو ہے میرے پاس۔ میرا طارق ہے جینے کا سہارا۔"

"خدا اُسے زندگی دے"

جٹھانی اور نندوں نے بھی لاہور جانے کی رائے دی۔ یوں بھی عدت پوری ہو چکی تھی۔ چلے جانے میں ہرج نہیں تھا۔

صابرہ، امی اور ابو کے ساتھ لاہور آگئی۔ غمزدہ وہاں بھی تھی۔ یہاں بھی۔ اپنا آپ وہیں تو نہیں چھوڑ آئی تھی نا۔

لیکن یہاں کچھ فرق ضرور پڑا۔ دل بہلا تو نہیں ہاں غم کا بار قدرے ہلکا ضرور ہوگیا۔ دونوں بہنیں لاہور ہی میں تھیں۔ کبھی وہ آجاتیں کبھی صابرہ اُن کے ہاں چلی جاتی۔

انھی دنوں عامرہ کی ڈیلیوری کا مرحلہ پیش آیا۔ اس کی ساس اپنے بیٹے کے پاس لندن گئی ہوئی تھیں۔ عامرہ چونکہ اکیلی تھی۔ گھر بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس لیے اُس نے امی کو بلا بھیجا۔ اس کا شوہر کامران پیسے والا آدمی تھا۔ طبیعت میں گھمنڈ تھا۔ سسرال والوں سے زیادہ بن نہ پاتی تھی بڑا لیے دیے رہا کرتا تھا لیکن اس وقت اپنی ضرورت تھی۔ اس لیے چلا آیا۔

امی کی کچھ طبیعت خراب تھی۔ اس لیے انہوں نے صابرہ سے کہا" بیٹی تم چلی جاؤ بہن کے پاس"

"ٹھیک ہے امی" صابرہ نے کہا۔" میں چلی جاتی ہوں"

"لیکن آپ اپنے بچے کو سنبھالیں گی یا عامرہ کو" کامران نے کہا" طارق بھی تو چھوٹا ہے"

صابرہ بولی" کامران بھائی فکر نہ کریں۔ سب کو سنبھال لوں گی۔ طارق بالکل تنگ نہیں کرتا۔ پھر چند دنوں کی تو بات ہے۔ امی کی طبیعت بھی تو اچھی نہیں۔"

"چلیے ٹھیک ہے آپ ہی آجائیں۔"

صابرہ نے اپنے اور طارق کے چند جوڑے بیگ میں ڈالے۔ امی نے چند سو روپے دیے۔ دل پر آرے سے چل گئے۔ لیکن صابرہ چپ رہی۔ پیسے کے لیے امی نے کہا" ہوسپٹل میں نرسوں وغیرہ کو دینے دلانے کی ضرورت پڑے گی۔ ڈاکٹر اور ہوسپٹل کا خرچا تو کامران ہی کرے گا۔۔۔ تم اپنی طرف سے...."

اس نے گھٹی آواز میں صرف "اچھا امی" کہا۔

عامرہ کے ہاں بچی پیدا ہوئی۔ بہت صحت مند اور بڑی پیاری بچی تھی۔

عامرہ کو لیبر روم سے کمرے میں لایا گیا۔ بچی اس وقت صابرہ کی گود میں نرس نے دے دی تھی۔ عامرہ نے بچی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ تو گلابی کمبل میں لپٹی گول مٹول سی بچی صابرہ نے عامرہ کے قریب کرتے ہوئے ہنس کر کہا" بالکل مانو بلی ہے۔ گود میں لوگی"

وہ نقاہت سے بولی: "ابھی نہیں۔ آپ ہی رکھیں ابھی۔"

صابرہ ہنس کر بولی: "میں نے رکھی تو بس میری ہی ہوگئی۔ ویسے میرا طارق تیری بیٹی سے زیادہ خوبصورت ہے۔"

عامرہ ہنس پڑی۔ اور کوئی بات نہ ہوسکی۔ کامران اور عامرہ کے امی ابو کچھ دوسرے عزیزوں کے ساتھ آگئے تھے۔ طارق بھی نانی اماں کے ساتھ آیا۔

احوال پرسی اور مبارک سلامت کے بعد سب نے بچی دیکھی۔

چار سالہ طارق اس کھلونے کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ سب بچی کو دیکھ چکے تو صابرہ نے بچی طارق کو دکھائی۔ "دیکھو طارق یہ کون ہے۔"

طارق حیرانگی سے اسے تکنے لگا۔

"ننھی منی گڑیا ہے اللہ میاں نے تمہارے ساتھ کھیلنے کے لیے بھیجی ہے۔"

"میں اٹھاؤں گڑیا کو۔"

"نہیں بیٹے گر جائے گی۔"

"نہیں گرے گی۔"

صابرہ نے اپنے ہاتھوں میں تھامے تھامے بچی طارق کے بازوؤں میں دے دی۔

"صابرہ باجی۔ گرانہ دے آپ کا صاحبزادہ ہماری گڑیا کو۔" کامران جھٹ سے بولا۔

"نہیں بھئی۔" صابرہ نے بچی واپس لے کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا: "اس مانو بلی کو ہم گرنے کہاں دیں گے۔"

بچی کا نام سارہ رکھا گیا لیکن ننھیال میں وہ مانو ہی بنی۔ طارق اُسے مانو بلی کہتا تھا۔

عامرہ ہسپتال سے امی ہی کے ہاں آئی۔ صابرہ دیکھ بھال کے لیے موجود تھی۔ عامرہ کو یہاں آرام کرنے کا اس نے پورا پورا موقع دیا۔ بچی کو بھی وہ ہی دیکھتی۔ نہلاتی دُھلاتی۔ کپڑے بدلتی خوبصورت فراک پہناتی اور نئے نئے گرم کپڑوں میں لپیٹ کر پہروں گود میں لیے رہتی۔ طارق اس

گڑیا سے بہت مانوس ہوگیا۔ وہ اُسے بہت پیار کرتا۔ ضد کر کے گود میں اٹھاتا اور پھر اسے سنبھال کر بیٹھتا جیسے نازک سے آبگینے کو کوئی بڑا ہی محتاط انسان سنبھال کر رکھے۔

اس دن کچھ عزیز عامرہ کی احوال پرسی کو آئے تھے۔ شاکرہ اور احمد بھی تھے۔ رسماً بچی کو پیسے بھی دے رہے تھے۔

طارق کچھ دیر کو کھڑا تکتا رہا۔ بچی کبھی ایک ہاتھ میں جاتی تھی۔ کبھی دوسرے میں۔ سب ہی اسے پیار کر رہے تھے۔ جنھیں یہ گلابی گلابی گڑیا اچھی لگی تھی۔ اُسے چھو کر دیکھ رہے تھے۔ اپنی ماؤں سے اس کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔

"یہ کون ہے؟"

"کہاں سے آگئی؟"

"ہسپتال سے آپ بھی لے آئیں نا ایسی گڑیا۔"

"ماما ہمیں بھی لا دیں بہن۔"

"ابھی لے چلتے ہیں آنٹی اور لے آئیں گی۔"

بچوں کی معصومانہ باتوں کا مائیں ہنس ہنس کر جواب دے رہی تھیں۔ مسز ثمینہ راشد کا بیٹا تو جیسے بچی پہ مفتون ہی تھا۔ ماں کی گود سے کھینچ کھینچ کر اپنی گود میں لینا چاہ رہا تھا۔ اور ساتھ ہی کہے جا رہا تھا۔

"ماما یہ ہماری ہے نا۔ ہم گھر لے جائیں گے اسے۔"

"یہ ہماری ہے۔" اچھل کر طارق، ثمینہ کے بچے کی طرف آیا۔ زور سے اُسے دھکا دیا اور کود کے زور سے مانو بلی کو ثمینہ کی گود سے چھین لیا۔ اس چھینا جھپٹی میں بچہ زمین پہ گر پڑا۔

سب ہنس پڑے۔ ثمینہ اپنے روتے بچے کو زمین سے اُٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے ہنس کر بولی: "اب نام نہ لینا اس کا۔ یہ سب کی ہے بیٹے۔"

سب ہنس پڑے۔ عامرہ بھی ہنس پڑی۔ لیکن صابرہ نے طارق کو ڈانٹا: "اس طرح

بدتمیزی نہیں کرتے ۔ مانو سب کی بہن ہے ۔ "

" سب کی نہیں میری ہے " طارق خونخوار لہجے میں غرایا ۔ شاکرہ نے مذاق سے کہا "لو جی طارق تو ابھی سے اس کا پورا پورا مالک بن بیٹھا "

" خالہ زاد ہے بھئی اس کا حق دوسروں سے زیادہ ہی ہے " نبیہہ مسکرائی ۔

"بات تو ٹھیک کہی تم نے " صابرہ بچی کو سینے سے لگاتے ہوئے بولی " طارق کو کیا خود مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ یہ ہماری ہے "

"اس کے باپ کا پتا ہے باجی " شاکرہ نے صابرہ کی سنجیدگی پر ہنس کر کہا " بڑا اکڑ خان ہے"

صابرہ کے چہرے کی روشنی بجھ سی گئی ۔ ایک گمبھیر سا اندھیرا چھا گیا ۔ لیکن اس لمحاتی کیفیت پر جلد ہی قابو پاتے ہوئے بولی ۔ " بیٹیاں اکڑ خانی توڑ دیتی ہیں شاکرہ ۔ میرا بیٹا لائق ہو گیا نا ۔ تو . . . . "

" بھئی تم لوگ کس ثقیل موضوع پر بات کرنے لگیں ۔ کیا خبر قسمت میں کیا لکھا ہے ۔ جب جوان ہوں گے دیکھا جائے گا ۔ " ارسہ بولی ۔

" یہ بات تو ہے " صابرہ نے کہا ۔

" اچھا باجی ۔ کوئی چائے وائے ملے گی یا باتیں ہی ہوتی رہیں گی " شاکرہ نے صابرہ سے کہا ۔ عامرہ بیڈ پر تکیوں کے سہارے بیٹھی تھی ۔ صابرہ سے بولی " باجی چائے کے لوازمات میری طرف سے "

"اوہو " شاکرہ بولی " دن رات تو ابو کا خرچ کروا رہی ہیں محترمہ ، اب چائے کے لوازمات اپنی طرف سے ۔ کا مطلب ! "

" نہ تو نہ سہی " عامرہ نے مسکرا کر کہا ۔

سب باتیں کرنے لگیں ۔ صابرہ چائے کے لیے کچن میں چلی گئی ۔ طارق بچی کو گود میں لے کر صوفے پر بیٹھا رہا ۔

سوا مہینہ عامرہ امی کے ہاں ہی رہی ۔ صابرہ نے اس کی خدمت میں دن رات ایک کر دیئے ۔ بچی کا تو سارا کام ہی اس کے ذمے تھا ۔ بار بار نیپی بدل رہی ہے ۔ صاف کر رہی ہے ۔ پاؤڈر چھڑک رہی ہے ۔ دودھ کی بوتلیں صاف کر رہی ہے ۔ کپڑے استری کر رہی ہے ۔ اس کے سارے کام وہ خوشی سے کرتی تھی ۔ بہت پیاری لگتی تھی اسے مانو ۔

"عامرہ ۔ مجھے تو مانو سے جیسے عشق ہو گیا ہے "

" اتنے دنوں سے دیکھ بھال جو کر رہی ہو باجی "

" تم گھر چلی جاؤ گی ۔ تو ۔ طارق تو تنگ کرے گا ہی ۔ خود مجھے بھی وحشت ہوتی ہے سوچ کر ۔ "

"آپ آجایا کیجئے گا نا ۔ ویسے وحشت تو مجھے ہو رہی ہے ۔ کیسے سنبھالوں گی اسے ۔ آپ نے تو سارا ذمہ ہی لے لیا تھا ۔ مجھے تو عادت ہی نہیں پڑی اس کے کام کی ۔ "

" پڑ جائے گی "

کامران روز ہی بیوی اور بچی کو دیکھنے آتا تھا ۔ عامرہ اس کے سامنے صابرہ کی تعریفیں کرتی جس طرح خدمت وہ کر رہی تھی اس کا احساس دلانے کے لیے بار بار کہتی ۔ کامران کبھی کبھی صابرہ کا شکریہ ادا کر دیتا ۔ کبھی کہتا " بھئی یہاں جو آئی ہو ۔ ظاہر ہے خدمت ہی کروانے آئی ہو نا ۔ امی لندن نہ گئی ہوتیں تو یہ ذمے داری وہ بخوشی اٹھا لیتیں ۔ اب آپ کی امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ۔ تو ظاہر ہے صابرہ ہی کو ساری ذمے داری اٹھانا تھی نا ۔ "

صابرہ کے علاوہ عامرہ ، طارق کی باتیں بھی کامران کو ہنس ہنس کر سناتی ۔ کامران ان باتوں کو کوئی خاص لفٹ نہ دیتا ۔ طارق کی مانو کے لیے وارفتگی تو اسے بالکل نہ بھاتی ۔

عامرہ اپنے گھر چلی گئی ۔ جس دن کامران انھیں لے گیا طارق پورا دن روتا رہا ۔ بار بار ضد کرتا کامران انکل اسے بہت برے لگے ۔

دو تین دن بعد صابرہ امی کے ساتھ عامرہ کو دیکھنے گئی ۔ دیکھنے کیا جانا تھا ۔ وہ تو طارق

کی ضد تھی۔ جو پوری کرنا تھی۔ دو تین دنوں میں چہرہ کملا گیا تھا۔ ماں تھی نا۔ ایک اکلوتے بچّے کا اصرار تھا یا ضد ہر طور اسے پورا کرنا ہی تھی۔

کامران بھی گھر پہ تھا۔ سارہ سوئی ہوئی تھی۔ سب ڈرائینگ رُوم میں بیٹھ گئے۔ احوال پُرسی ہوئی۔ سب باتیں کرنے لگے۔

"مانو بلّی کہاں ہے امّی؟" طارق نے پوچھا۔

صابرہ ہنس کر بولی" سو رہی ہے بیٹے۔"

"اللہ، اس بچّے نے جس دن سے تم آئی ہو تالو سے زبان نہیں لگائی" امّی نے ہنس کر کہا "مانو بلّی کی رٹ لگائے رکھی۔"

"بچہ ہے نا۔ پھر اتنے دن رہی سارہ وہاں۔ عادی سا ہوگیا ہے" عامرہ بولی۔

صابرہ نے ہنس کر کہا" تیری بیٹی ہی کا دیوانہ ہے۔ چچاؤں، پھوپھیوں سب کے بچّے ہیں کبھی کسی سے مانوس نہیں ہوا اتنا۔"

کامران بولا" صابرہ باجی۔ بچّے کی باتوں کو اس طرح اہمیت دے کر بیان نہ کیا کریں۔ اس کے ذہن میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں بیٹھنی چاہیئے۔"

"اے ہے" صابرہ کو بُرا لگا تو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر عامرہ نے کامران سے کہا "بچوں کی باتیں ہیں آپ تو اس طرح سنجیدہ ہو گئے جیسے۔۔۔۔"

"ٹھیک کہتے ہیں کامران ــ" عامرہ کی بات صابرہ نے کاٹ دی۔ "طارق یتیم بچّہ ہے اس کا حال ہے نہ مستقبل۔ اس کے ذہن میں مانو کی انسیت جگہ پاگئی تو بُرا ہی ہو گا اس کے لیے۔"

دُکھے طنز کی چبھن ماں اور عامرہ نے بری طرح محسوس کی۔ کامران نے منہ بنایا۔ بات کچھ سنجیدہ ہوگئی جسے دور کرنے کے لیے عامرہ نے موسم کی باتیں شروع کر دیں۔

ان سب کو باتوں میں مصروف پاکر طارق چپکے سے مانو بلّی کی تلاش میں نکل گیا تھا۔ وہ عامرہ آنٹی کے کمرے میں گھسا اور ننھی منی گڑیا کو کوٹ میں سے گھسیٹ کر اٹھا لیا۔ بڑا سنبھل سنبھل کر

بازوؤں میں بھرے وہ اُسے ڈرائینگ رُوم میں لے آیا۔

اُس کے دروازے میں داخل ہوتے ہی عامرہ اور کامران چلّائے۔ صابرہ جلدی سے اٹھی ایک کو بچی کو چھینا اور ایک زوردار تھپّڑ طارق کے لگاتے ہوئے غصّے سے بولی" بدتمیز کہیں گرا دیتا تو۔"

"اُسے کیوں مارتی ہو بچّہ ہی تو ہے" ماں نے روتے ہوئے طارق کو سینے سے لگالیا۔ کامران اور عامرہ نے بھی صابرہ سے کہا" بچّہ ہی ہے۔ پھر کوئی گرا تو نہیں دیا تھا جو آپ نے بے چارے کو تھپّڑ مارا۔"

صابرہ کچھ بولی نہیں۔

پھر جتنی دیر بھی وہ وہاں رہی بجھی بجھی خاموش خاموش۔ چُپ چُپ رہی۔

وقت گزرتا چلا گیا۔

صابرہ کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ سسر کے فوت ہونے کے بعد سسرالی گھر میں اُس کا بار اٹھانے والا کوئی نہ رہا۔ ہر چند کہ ساس نے اُسے ساتھ رکھنا چاہا۔ لیکن وہ تو اب خود بیٹوں کے رحم و کرم پر تھی۔ بیٹے اُس کا ہی بار نہ اُٹھا پاتے تھے۔ صابرہ اور اس کے بچّے کا بوجھ اٹھانا تو تھا ہی گراں۔ صابرہ کا ویسے بھی زیادہ وقت میکے ہی میں گزرتا تھا۔ اب ان حالات میں تو اُسے مستقلاً ہی میکے اُٹھ آنا پڑا۔ سسرال سے رشتہ توڑا تو نہیں جاتا۔ خوشی غمی کے موقع پر آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ لیکن اب وہ ماں کے ہاں تھی۔

ماں جو بیماری کو اتنی سنجیدگی سے گلے لگا بیٹھی تھی کہ گھسٹ گھسٹ کر چند سال گزارے پھر وہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔

صابرہ تو اب اسی گھر کی ہوگئی، ساری ذمّے داریاں اب اُس کے سر تھیں۔ ابا کی دیکھ بھال۔ آئے گئے کی خاطر تواضع۔ چھوٹی بہنوں اور بہنوئیوں کی خاطر داریاں سبھی اُس کے ذمّے تھیں۔ وہ سارے فرائض بڑی لگن اور تندہی سے ادا کرتی۔ لیکن کبھی کبھی دل بے طرح اداس ہو جاتا طبیعت اچاٹ اچاٹ ہونے لگتی۔ اُسے یوں لگتا جیسے یہ سب کچھ بڑی اپنائیت سے کرنے کے باوجود وہ اس گھر، اس فضا اور اس ماحول میں بیگانہ سی ہے ــ بے گانہ بے ٹھکانہ۔ بے وقعت اور بے سہارا۔ جس پر سبھی ترس

ڈال سکتے ہیں جس سے سبھی کام لے سکتے ہیں۔ موقع لگے تو بُرا بھلا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے حساس ذہن میں ایسے کئی چبھن کے کانٹے تھے۔ عامرہ نے، کامران نے، شاکرہ نے، احمد نے شعوری اور لاشعوری طور پر اُسے یہ چبھن دی تھی، اوروں سے تو گلہ نہ تھا۔ لیکن ان سے تھوڑی دیر کے لیے شاکی ضرور ہو جاتی۔ شاکی ہوتی بھی تو کیا کر لیتی تھی۔ یہی نا کہ جی بھر آیا تو چپ کر رو لیا گیا رو نہ سکی تو طارق پہ برس پڑی کہ اُسے کوس لیا۔ تقدیر کی بے رحمی پر کڑھ لیا۔

لیکن اپنے آپ کو سنبھالا بھی تو دینا آ گیا تھا۔ جب بھی ایسی کیفیات سے دوچار ہوتی۔ بعد میں پچھتاوا آتا۔ توبہ کرتی۔ خدا سے معافی مانگتی۔ اس کی رضا پر راضی رہنے کا عہد کرتی پھر طارق کو سینے سے لگا کر ہمت اور توانائی کی لہریں سینے میں اٹھتی محسوس ہوتیں۔

خدا نے اُسے ایک انتہائی خوبصورت اور ذہین تحفے سے نوازا تھا۔ یہ بھی نہ ہوتا تو وہ کیا کرتی۔ امیدوں کا سہارا تو تھا نا۔

طارق بڑا ذہین لیکن بڑا ہی حساس بچہ تھا۔ وہ ماں کے چہرے پر ذرہ بھر بھی تفکر کے سائے دیکھتا تو گلے میں بانہیں ڈال کر اس کا گال چوم لیتا

"امی۔ ہنستی کیوں نہیں ہو۔"

"رونا آیا تھا۔"

"امی میں اب کسی چیز کے لیے ضد نہیں کروں گا۔"

"مجھے پتا ہے میرے ابو نہیں ہیں۔ ضد تو وہ کرتے ہیں جن کے ابو ہوتے ہیں۔"

اس کی باتوں سے صابرہ کا دل کٹ جاتا۔ لیکن اُسے لپٹا کر اتنا پیار کرتی کہ طارق مچل کر بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کرتا۔

طارق واقعی عمر سے پہلے ہی میچور ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کبھی بے جا ضد نہ کرتا۔ نہ ہی کھانے کی نہ ہی پہننے کی۔ ہاں ایک ضد تھی جس پر وہ شاید قادر نہ تھا

ہر ہفتے وہ امی سے عامرہ آنٹی کے ہاں جانے کی ضد ضرور کرتا۔

"امی آج چھٹی ہے چلیں نا۔"

"بھئی تم بھی عجیب لڑکے ہو۔ ہر ہفتے ان کے ہاں جا دھمکتے ہیں ہم، بُری بات ہے"

"تو پھر عامرہ آنٹی سے کہیں آ جایا کریں۔"

"آتی تو ہے دوسرے چوتھے دن۔"

"لیکن تھوڑی دیر کے لیے آتی ہیں اور پھر مانو بلی کو بھی تو کبھی کبھی ساتھ لاتی ہیں۔"

"مانو بلّی کے ساتھ اب مانو بلا بھی آ گیا ہے۔"

"اوہ شوکت۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"کیوں اتنا پیارا سا ہے گول مٹول"

"اوں ہوں"

"طارق۔"

"جی"

"شاکرہ آنٹی کی پنکی بھی تو پیاری ہے۔ وہ اچھی نہیں لگتی تمہیں!"

"لگتی ہے۔"

"پھر ہر ہفتے مانو بلی ہی کے لیے کیوں جانا چاہتے ہو!"

"بس جاؤں گا۔"

"کسی دن کامران انکل سے منہ کی کھاؤ گے۔ روز روز کا آنا انھیں اچھا نہیں لگے گا۔"

"نہ لگے۔ مجھے ان سے ڈر تھوڑا ہی لگتا ہے۔ عامرہ آنٹی تو پیار کرتی ہیں نا۔ مانو بلّی مجھ سے کتنا خوش ہو کر کھیلتی ہے۔"

"ہوں"

"امی۔"

"ہوں۔"

"یہ جو کامران انکل ہیں نا۔"

"ہاں"

"مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔"

"بُری بات ہے بیٹے، ایسے نہیں کہتے۔"

"کیوں نہیں کہتے۔ نہیں اچھے لگتے ہیں۔ میں اور مانو کھیل رہے ہوتے ہیں نا، تو بڑے غصے سے مجھے دیکھتے ہیں۔ مانو کو بھی ڈانٹ دیتے ہیں۔"

"اسی لیے تو کہتی ہوں۔"

"احمد انکل بہت اچھے ہیں۔ میں پنکی سے کھیلتا ہوں تو وہ خوش ہوتے ہیں کچھ کہتے بھی نہیں۔"

"بے وقوف بچے۔ اسی لیے تو کہتی ہوں۔ اُن کے ہاں زیادہ نہ جایا کرو۔ شاکرہ آنٹی کی پنکی سے کھیلا کرو۔"

طارق نے ماں کی بات پر بجواباً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مانو بھی بہت اچھی ہے امی"

صابرہ نے ہنس کر کہا "اور پنکی۔"

طارق نے ناک سکوڑی، پھر کسی مدبر آدمی کی طرح بولا "اچھی ہے۔ لیکن مانو بہت اچھی ہے۔"

ماں نے اسے سینے سے لگا کر اس کا ماتھا چوم لیا، پھر مسکراتے ہوئے بولی "یہ اچھی بُری رہنے دے ابھی۔ دھیان سے پڑھ لکھ کر کسی لائق تو ہو جا پہلے۔"

"وہ تو میں ہوں" طارق منہ پھلا کر اپنے اسکول ٹیچر کے ریمارکس اور اپنی ماہانہ رپورٹ کا ذکر کرنے لگا

وقت گزرتا چلا گیا۔

اچھا ہو یا بُرا گزر ہی جاتا ہے اسے تقدیر بھی کہہ لیتے ہیں۔ کوئی اچھائیوں سے سرفراز ہوتا ہے اور کوئی برائیوں کے شکنجے میں جکڑا رہتا ہے لیکن غنیمت یہی ہے کہ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر سرکتے رہتے ہیں، بدلتے رہتے ہیں۔

عامرہ قسمت کی دھنی تھی، کامران کا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ مانو کے بعد اوپر تلے تین بیٹے بھی خدا نے دیے تھے۔ جب سے ساس فوت ہوئی تھی، گھر میں اب ایک ملکہ کی طرح

اسی کی حکمرانی تھی۔ حلقۂ احباب خوب وسیع تھا۔ شہر کے چیدہ چیدہ لوگوں سے ملنا ملانا تھا۔ یوں وہ متوسط طبقے سے نکل کر اوپر کے طبقے کی طرف اٹھتی جا رہی تھی۔

شاکرہ بھی اپنے گھر میں ٹھیک ٹھاک تھی، چار بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ احمد کی وقت کے ساتھ ساتھ پرموشن ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن مہنگائی کے دور میں صرف تنخواہ پہ گزر نہیں ہو سکتی تھی۔ تھوڑی بہت سائیڈ بزنس کر رہا تھا۔ جس سے گھر کا رکھ رکھاؤ اچھا تھا۔ بچے اچھے اسکولوں میں تعلیم پا رہے تھے۔

تینوں بہنوں میں صابرہ ہی تھی۔ جس کی زندگی کی گاڑی لنگڑا چال چل رہی تھی۔ طارق ہی اس کی امید دل کا سہارا تھا۔ بھائی باہر سے کچھ نہ کچھ بھیجتا رہتا تھا۔ بہنیں بھی دوسرے چوتھے ماہ کچھ نہ کچھ حیلے بہانے دے دیتی تھیں۔ عامرہ کی تو خیر اپنی ہی اتنی مصروف زندگی تھی کہ صابرہ کے دکھوں کو سننے سمجھنے کے لیے وقت نکالنا مشکل تھا۔ ہاں شاکرہ اپنی اس عظیم بہن سے دلی ہمدردی رکھتی تھی۔ روپے پیسے سے زیادہ مدد نہ کر سکتی تو صابرہ کے دکھوں کو محسوس کر کے سینے میں ہوک سی ضرور محسوس کرتی۔ اپنے دکھ کا اظہار بھی کرتی اور کبھی کبھی جب صابرہ کسی دکھ سے عاجز آ کر آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتی۔ تو وہ اُس کے آنسو اپنے آنچل میں جذب کرتے ہوئے خود بھی رو دیتی۔

بچے بڑے ہوتے گئے۔ سب بچوں کا آپس میں بہت پیار تھا۔ ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوتے۔ چھٹیوں میں اکثر سب نانا ابا کے گھر آ جاتے۔ کبھی مائیں ساتھ ہوتیں کبھی اکیلے آتے۔ صابرہ اُن کے لیے نانی ہی کا رول ادا کرتی۔ بہت پیار کرتی سب سے۔ سب خوب اُودھم مچاتے۔ دھینگا مشتی کرتے۔ توڑ پھوڑ کرتے۔ سامان اُلٹ پلٹ دیتے۔ لیکن صابرہ نے کبھی کسی کو ڈانٹا نہیں، پیار ہی کیا۔ لاڈ ہی دیکھے سب نے۔ اس لیے تو سبھی بچے اس بڑی آنٹی سے بہت پیار کرتے تھے۔

طارق کو اب بھی سب میں سے مانو بلی ہی اچھی لگتی تھی۔ مانو بلی بھی طارق سے بہت مانوس تھی۔ پنکی بھی ان کی دوست تھی۔ قد کاٹھ میں وہ مانو کے برابر تھی۔ حالانکہ دو سال چھوٹی تھی۔ وہ اکثر مانو کو چھیڑتی۔ "تم تو گٹھی سی رہ جاؤ گی۔"

طارق اس کی طرفداری کرتا: "تم تو بانس کی طرح لمبی ہوتی جا رہی ہو۔ سوکھی سڑی۔ مانو کو دیکھ نا

کتنی مزہ ہے۔ گول مٹول سی۔ تم سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔"

مانو اِترا جاتی ۔ "دیکھا ۔ !"

تینوں ہنس پڑتے ۔

طارق نے میٹرک کا امتحان بڑے اعزاز سے پاس کیا۔ بورڈ میں اس کی تیسری پوزیشن تھی۔ صابرہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس نے اس خوشی میں سب بہنوں اور عزیزوں کو ایک شاندار سی دعوت دی

"یہ میری پہلی خوشی ہے"

"خدا نے میرے بچے کو اپنی رحمتوں سے نوازا ہے"

"میں اسے ڈاکٹر بناؤں گی"

"یہ بہت بڑا آدمی بنے گا۔"

"بہت لائق ہے میرا بچہ"

وہ خوشی سے بہک بہک کر ہر ایک سے طارق کی تعریفیں کرتی۔

اس کی پہلی خوشی تھی۔ سب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دعوت خوب شاندار رہی۔ خوب تحفے تحائف دیئے گئے۔

عامرہ، طارق کے لیے ایک خوبصورت سوٹ پیس لائی تھی۔ اس نے پیکٹ صابرہ کو تھمایا تو کامران نے ہنستے ہوئے کہا" ساتھ کچھ پیسے بھی دے دو۔ سلائے گا کہاں سے؟"

صابرہ کا دل کچھ بجھ سا گیا۔ سمجھ نہ پائی کہ کامران نے ہمدردی جتائی ہے یا طنز کا تیر مارا ہے وہ صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئی پھر جب تنہائی کا موقع پا کر عامرہ نے دو ہزار روپے صابرہ کو دینا چاہے۔ تو صابرہ نے آہستگی سے اس کا ہاتھ پرے کر دیا۔

"رکھ لو باجی" عامرہ بولی۔ "طارق کو کالج میں داخلہ لینا ہے، پیسوں کی ضرورت تو پڑے گی ہی۔"

"جب ضرورت پڑے گی تو مانگ لوں گی" اس نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

اس کی ساری خوشیاں زخمی ہو گئی تھیں۔

مانو بھی طارق کے لیے تحفہ لائی۔ یہ تحفہ اس نے اپنی پاکٹ منی سے خریدا تھا۔

طارق کو جتنے تحائف ملے تھے۔ مانو کا یہ تحفہ اُسے اُن سب سے اعلیٰ، سب سے بڑھیا اور سب سے قیمتی لگا۔

"مانو۔ تمہارا تحفہ میرے لیے سب سے زیادہ قیمتی ہے۔" اُس نے مانو سے کہا۔

"نہیں بھئی۔ اتنا بھی نہیں۔ میرے جیب خرچ سے اتنے ہی پیسے بچے تھے پنکی جو پریزنٹ لائی ہے وہ تو اُس کی ماں نے لے کر دیا ہے نا۔ سونے کا ٹائی پن ہے"

"لیکن میں جو کہہ رہا ہوں کہ تمہارا تحفہ مجھے سب تحفوں سے زیادہ عزیز ہے۔"

"سچی ۔"

"سچی ۔"

اور

اس سچی سچی میں بات دونوں کے لاشعور سے نکل کر شعور میں آگئی۔ طارق کو مانو بلّی شروع سے اچھی لگتی تھی لیکن آج اس اچھا لگنے میں جانے کون سا جذبہ شامل ہو گیا تھا کہ طارق کا جی چاہا اس پیاری سی لڑکی کو اپنے دل کے حصار میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سارہ نے بھی اپنے اندر پائی مگر اس کی کم عمری اُسے اس کیفیت کا مفہوم نہ سمجھا سکی۔ پھر بھی اُسے یوں لگا جیسے... طارق وہ طارق نہیں جو اَب تک تھا۔ وہ کوئی اور ہی ہے کوئی اور لیکن جسے نیا نام دینا اس کے ذہن کی سوچ سے شاید دُور تھا

شب و روز کا چکر چلتا رہا۔

طارق نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ اسکول اور کالج کی زندگی میں جو فرق ہے وہ طارق نے بھی محسوس کیا۔ کالج میں اونچے اور امیر گھرانوں کے لڑکے بھی تھے جن کا مقصد تعلیم حاصل کرنے سے زیادہ وقت گزاری تھا۔ خوبصورت لباسوں اور اسکوٹروں، گاڑیوں میں کالج آتے تھے۔ اتفاق سے دوستی بھی چند ایسے ہی امیرزادوں سے ہو گئی۔ کم مائیگی کا احساس آہستہ آہستہ اُس کی شخصیت پر اثرانداز

ہونے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی رکھ رکھاؤ بناؤ سنگار پر اُس کی توجہ بڑھنے لگی۔ اُسے بھی اچھے اچھے فیشن ایبل لباسوں اور قیمتی قیمتی جوتوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

"امی مجھے فلاں چیز چاہیئے۔"

"فلاں کپڑا۔"

"فلاں جیکٹ۔"

"جینز لے دیں۔"

صابرہ بے چاری جہاں تک بن پڑتا اس کی فرمائشیں پوری کرتی۔ لیکن ایک تو کالج ہی کا خرچا کافی تھا۔ اُس پر یہ سارے اخراجات۔ طارق جب بھی کوئی فرمائش کرتا۔ صابرہ کا چہرہ اُتر جاتا۔

اُس دن وہ منہ بسورے بیٹھا تھا۔ جاگرز لینے کی فرمائش تھی۔

"تمہارے پاس ہیں جاگرز" صابرہ نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"وہ پہننے کے قابل نہیں۔ پھر مجھے وائٹ چاہئیں۔ میں نے گیمز کے لیے جانا ہوتا ہے سب لڑکے وائٹ جاگرز پہنتے ہیں۔"

"طارق بیٹے۔" صابرہ نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے۔ اُسے دیکھا۔ "ضرور پہنتے ہوں گے سب لڑکے۔ لیکن تم۔ اُن جیسے نہیں ہو۔ تمہیں اپنے حالات دیکھنا چاہئیں۔ دوسروں کے رحم وکرم پر پڑے لوگوں کو احساس ہونا چاہیئے۔"

"کیا۔ !!"

"تم ایک یتیم بچے ہو بیٹے۔ تمہارے پاس وافر پیسہ نہیں۔ ماموں اور نانا سرپرستی نہ کریں تو شاید تم کالج ..." صابرہ نے اپنی اور اس کی حیثیت واضح کی۔

"امی" طارق سرتاپا لرز گیا۔ یوں لگا جیسے کوئی تلخ حقیقت آج پہلی بار اس پہ آشکارا ہوئی ہے۔ اُسے دکھ ہوا۔ آج سے پہلے اس نے اس حقیقت کو کیوں نہیں جانا۔

وہ بہت پریشان ہوا۔

صابرہ اس کی ذہنی کیفیت سے بے خبر اپنے حالات اور حالات کی نزاکت کا اُسے احساس دلاتی رہی "ابھی تم کچھ بھی نہیں ہو طارق۔ تمہیں کچھ بننا ہے بن کے دکھانا ہے۔ اپنے وقار اپنی انا کی حفاظت کرنا ہے۔ تم کیا جانو باپ اور بھائی کے ٹکڑوں پہ جینا مجھے کتنا کھلتا ہے۔ کتنی اذیت ہوتی ہے۔ جب کوئی مدد کے لیے بند مٹھی میری مٹھی میں دے دیتا ہے لیکن کیا کروں۔ ذلّت کے احساس کے ساتھ بھی صرف اس لیے جی رہی ہوں کہ تم کچھ بن سکو۔ سب ہم پر رحم کھاتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم بے سہارا ہیں۔ مجھے سب کے رحم کھانے کا احساس ہے لیکن یقین جانو مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا میں اس رحم کو اپنی خدمات کے عوض لیتی ہوں۔ ہر ایک کی خدمت۔ سب کی تابعداری۔ کیا تم اب بھی بچے ہو کہ یہ سب کچھ نہیں سمجھتے۔"

"امی" طارق نے صابرہ کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ دکھ کا تیر اندر ہی اندر اُترتا چلا گیا۔ رشتہ داروں کے رویے چبھنے لگے۔ آج تک واقعی اس کی اور امی کی کسی نے دل سے عزت نہیں کی تھی۔ ہمیشہ رحم کھایا تھا۔ ترس کھایا تھا۔ رحم اور ترس۔ طارق کے ذہن میں ان جذبوں کے لیے نفرت پھوٹ پڑی۔ ماں نے اسے خوب پیار کیا۔ تسلّی دی۔ سمجھایا۔ لیکن!

طارق کے اندر جو احساس متحرک ہو گیا تھا۔ اُسے وہ ٹھہرا نہ سکی۔

اس دن سے وہ گم صم رہنے لگا۔ اس کی خوش مزاجی نے بھی .... تصنع کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اس کے ذہن میں غیر محسوس سی جلن ہوتی رہتی۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا۔ کیا؟ یہ وہ خود بھی شاید جان نہیں پایا تھا۔

اب وہ ہر عزیز ہر رشتہ دار کا رویہ اور نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی امی تو کیا وہ خود بھی سب کی خدمت گزاری کے لیے مامور ہے۔ اب تک وہ سب کے کام بخوشی اور دوڑ دوڑ کر کرتا تھا۔ لیکن اب اُس نے محسوس کیا کہ کام کرنے کو صرف اُسے ہی کہا جاتا ہے۔ شوکت ہو، رشی ہو۔ فاضل ہو۔ کوئی بھی لڑکا ہو۔ اُن کی موجودگی میں کام ہمیشہ اُسی سے لیا جاتا ہے۔

"اے طارق، ذرا پانی تو پلادو۔"

"بھاگ کے جانا چائے کی پتی ختم ہے لے آؤ۔"

"دھوبی سے کپڑے تو استری کروا لاؤ۔"

"سگریٹ تو پکڑ لاؤ۔"

"ذرا جوتے تو چمکادو۔"

یہ چھوٹے موٹے کام تھے جو گھر میں آنے والا ہر فرد اسی سے لیتا تھا۔ اور وہ دوڑ دوڑ کر اچھا بننے اچھا کہلانے کے لیے کرتا تھا۔ سب سے زیادہ کامران انکل اُس سے ایسے کام لیتے تھے اُن کا رویہ کبھی بھی مشفقانہ نہیں ہوتا تھا۔ حکم کا پہلو ہوتا تھا ہر بات میں۔ اسے یہ بات بڑی بھی لگتی تھی۔ لیکن مانو کی خاطر وہ کبھی اظہار نہیں کرتا تھا۔

لیکن،

اس کی باتوں نے کئی پردے اس کی آنکھوں سے اُٹھا دیے تھے۔ اُسے کئی تلخ اور کربناک حقیقتوں کا احساس دلا دیا تھا۔

حساس وہ شروع ہی سے تھا۔ وہ حیران تھا کہ اب تک حساس جذبے کیوں سوئے پڑے تھے

اُس کا رویہ بدل گیا۔ زندگی سے رویہ بدل گیا۔

مانو اسے بہت عزیز تھی، بہت پیاری تھی۔ اس کی زندگی تھی۔ لیکن اب وہ اس کی طرف سے کچھ مایوس ہوگیا۔ مانو وہی تھی۔

"تم بدلتے کیوں جا رہے ہو طارق؟" اس نے اس کی سرد مہری سے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں تو۔"

"میں جانتی نہیں جیسے۔"

"کیا جانتی ہو؟"

"کالج لائف۔"

"اوہ نہیں مانو۔"

"تو پھر۔"

"یونہی۔ طبیعت کچھ پریشان رہنے لگی ہے۔"

"آخر کیوں؟"

"بس۔"

"نہیں بتاؤ گے؟ کوئی خاص بات ہوئی ہے؟"

"خاص بات۔ ہونہہ۔ اب تو نہیں ہوئی۔ مجھے احساس اب ہوا ہے۔"

"کیسا احساس طارق۔؟"

"کہ میں ایک یتیم بچہ ہوں۔ بے سہارا۔ دوسروں کے رحم و کرم پہ پڑا ہوا۔"

"طارق"

"ہاں مانو۔ یہ ایک حقیقت ہے۔"

"پاگل ہو تم۔"

وہ ہنس پڑا۔ دکھ سے۔ کرب سے۔ مانو سمجھ نہ پائی کہ اُسے کیونکر تسلی دے ہاں اس طرح ہنسنے پہ اُسے رونا ضرور آگیا۔

طارق کی طبیعت اُچاٹ رہنے لگی۔ وہ جو بورڈ میں اچھی پوزیشن لے کر میٹرک میں پاس ہوا تھا ایف اے میں اتنے نمبر نہ لے سکا کہ میڈیکل میں داخلہ مل سکے۔ امی کو بہت دکھ ہوا۔ لیکن اسے دکھ نہیں تھا۔ وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ ڈاکٹر بننے کے لیے پانچ چھ سال کی طویل مدت درکار تھی اور ان پانچ چھ سالوں کے مٹھکے لمحوں کو دھکیلنے کے لیے اُسے یا اُس کی امی کو جانے کس کس کا منہ دیکھنا پڑتا۔ کس کس کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا۔ کس کس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خدمت گزاریوں کا بوجھ بساط سے بڑھ کر اٹھانا پڑتا۔ رحم اور ترس کے تازیانے جانے کتنی سمتوں سے کھانے اور سہنے پڑتے۔

صابرہ نے دکھ سے کہا۔ "تو نے میرے خواب بکھیر دیئے طارق۔ کتنی خواہش تھی۔ کتنا یقین تھا

کہ تم ڈاکٹر بن جاؤ گے۔"

وہ زہرخند لہجے میں بولا "اس کے لیے کتنی لمبی مدت درکار ہوتی ماں۔"

"کٹ ہی جاتی۔"

"لیکن اب میں اس طرح کاٹنے پر تیار نہیں، کہ میری ماں، بہنوں اور بھائیوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتی پھرے۔ میرے تعلیمی اخراجات کے لیے جھولی میں ترس اور رحم کی دین ڈلواتی رہے۔"

صابرہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "یہ ہماری تقدیر ہے بیٹے۔ تم کسی قابل ہو جاؤ گے تو سب قرضے چکادوں گی لیکن تم نے تو ابھی سے ہمت ہار دی۔"

"نہیں ماں ہمت نہیں ہاری، ہمت باندھی ہے۔"

"کیا کرو گے؟"

"فی الحال بی اے میں داخلہ لوں گا۔ ساتھ ساتھ کچھ کام بھی کروں گا۔ کم از کم اپنا بار ضرور اٹھاؤں گا۔"

اس نے بی اے میں داخلہ لے لیا۔

مانو کو بھی اس کے میڈیکل میں داخلہ نہ ملنے کا افسوس تھا۔ اس دن وہ ان کے یہاں آئی تو طارق سے کہا۔ "اس دفعہ کیا ہوگیا تھا جناب کو۔ کالج کی فضا اتنی راس آئی کہ اپنا نصب العین ہی بھول گئے۔"

"بعض دفعہ انسان مصلحتاً ایسا کرتا ہے۔"

"یعنی نمبر کم لیتا ہے کہ میڈیکل میں داخلہ ہی نہ مل سکے۔"

"شاید۔"

"پاگل ہو تم۔"

"شاید"

مانو ہنس پڑی۔ وہ چپ رہا۔

"اب بی اے کرو گے۔" وہ کچھ دیر بعد بولی۔

"ہو سکا تو۔"

"کیا مطلب۔ تعلیم ادھوری چھوڑنے کا ارادہ ہے؟"

"فرق کیا پڑتا ہے؟"

"کیوں نہیں پڑتا۔"

"کیسے۔ سمجھاؤ گی!"

طارق نے اپنی آنکھیں مانو کی آنکھوں میں ڈال کر بڑی سچائی سے سوال کیا۔ وہ کونسی جہاندیدہ لڑکی تھی، جو وہ پندرہ سالہ لڑکی اپنی سمجھ کے مطابق بولی یہ سب کہتے ہیں لڑکیوں کی تو کوئی بات نہیں، لڑکوں کو ضرور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیئے۔ ابو کو تو ڈاکٹر اور انجینئر لڑکے بہت پسند ہیں۔

"مانو۔"

"ہوں۔"

"میں ڈاکٹر یا انجینئر بن بھی جاتا نا۔ تو بھی تمہارے ابو مجھے پسند نہ کرتے۔"

طارق کے لہجے کی دلسوزی سے مانو نے تڑپ محسوس کی جلدی سے بولی۔ "کیوں؟"

"وہ مجھے شروع ہی سے ناپسند کرتے ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ اُلٹا خیال ذہن میں بٹھا لیا۔ امی تمہیں کتنا پیار کرتی ہیں۔"

"میں تمہارے ابو کی بات کر رہا ہوں۔ کامران انکل کی۔ بہت بڑے بزنس مین کی۔"

"طارق میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔ میرے بابا کے بارے میں تمہارے ذہن میں کتنی غلط باتیں بیٹھی ہیں۔ وہ ایسا کیوں کرنے لگے۔"

"کرنے لگے نہیں، کرتے ہیں مانو۔ اس لیے کہ میں ایک یتیم، غریب، بے سہارا اور دوسروں کے رحم و کرم پر پڑا انسان ہوں۔ میرا کوئی ماضی تھا، نہ حال ہے اور نہ شاید مستقبل۔"

"مستقبل بنا کے دکھاؤ نا۔ کم ہمتوں اور بزدلوں کی سی باتیں کیوں کرتے ہو۔" مانو بڑے جذب سے بولی۔

"اچھا مستقبل بنا کے دکھا دوں۔ تو وہ مجھے پسند کرنے لگیں گے۔"

"ظاہر ہے۔"

"ہوں۔" وہ ہنس پڑا۔ اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ مانو نے اُسے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"پتا نہیں۔"

"بے وقوف نہ بنو۔"

"مانو۔ میرے اندر بڑی طوفانی ہلچل مچی رہتی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ ان لمحات کا قرض کیسے چکاؤں جو میری گزری ہوئی زندگی کو دبائے ہوئے ہیں۔ مجھے کچھ کرنا ہے بہن کچھ کروں گا۔"

اس کے جوش و جذبے کو نظرانداز کرتے ہوئے مانو نے بڑے پیار سے کہا۔ "کر لینا۔ پہلے اپنی تعلیم کی طرف پوری توجہ سے دھیان دو۔ ڈاکٹر تو نہیں بنے۔ کچھ اور بننے کی کوشش کرنا۔ مقابلے کا امتحان دے سکتے ہو۔"

وہ اُسے سمجھاتی رہی۔ وہ خاموشی سے سُنتا رہا۔ بی اے کے بعد ہی وہ کچھ فیصلہ کر سکتا تھا۔ بی اے بھی اُس نے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ دو سالوں میں پڑھائی کے ساتھ اس نے کئی چھوٹے موٹے کام بھی کیے تھے۔ اپنا کیا اچھا خاصا امی کا خرچہ بھی نکالا تھا۔ اب وہ ایم اے میں داخلہ لے رہا تھا۔ اس کے بعد سی ایس ایس یا سی ایس پی کرنے کا پختہ ارادہ تھا۔

لیکن،

ابھی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کے سارے منصوبے، سارے پلان بالکل ہی پلٹ دیئے۔

بڑے ماموں کے بیٹے کی شادی تھی۔ وہ ایک ماہ پہلے کویت سے آگئے تھے۔ بڑی دھوم دھام سے شادی ہو رہی تھی۔ رشتہ بھی اونچے ہی لوگوں میں ہوا تھا۔ بارات بڑی شان سے گئی۔ کئی موٹریں، ویگنیں اور بسیں باراتیوں کو لے کر گئیں۔

سہ پہر اُتر رہی تھی۔ جب رخصتی ہوئی۔ مہمان گاڑیوں، ویگنوں اور بسوں میں سمانے لگے۔ دلہن کی سجی سجائی گاڑی کے پیچھے آٹھ دس گاڑیوں کی قطار تھی۔ خاندان کے لوگ، عورتیں، لڑکیاں، لڑکے جسے جہاں جگہ مل رہی تھی گھسا جا رہا تھا۔

ایک گاڑی میں فرنٹ سیٹ خالی پا کر طارق بھی آبیٹھا۔ پچھلی سیٹ پر چند رشتے دار عورتیں اور بچے تھے۔ اسے پتا نہیں تھا کہ گاڑی کون ڈرائیو کرے گا۔

"ہائے بھئی جلدی سے بلاؤ نا کسی کو۔ کون لے جائے گا یہ گاڑی تھک گئے ہم تو۔" پیچھے بیٹھی خاتون نے کہا۔

"جی پتا نہیں۔" طارق بولا "ابھی کوئی آجائے گا۔ اگلی گاڑیاں تو چل پڑی ہیں۔ یہ بھی۔" اُس کی بات پوری بھی نہ ہو پائی کہ کامران انکل اور ان کے دوست رشید اور سلیم آگئے۔

"تم یہاں کیوں آبیٹھے؟" کامران، طارق کو دیکھتے ہی ماتھے پر شکنیں ڈالتے ہوئے بولا۔

"جی۔" طارق کچھ گھبرا گیا۔ آج کامران انکل صبح ہی سے اس پر گھورتی نگاہیں ڈال رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ مانو کے ساتھ گپ شپ لگاتا رہا تھا۔ زیادہ وقت اسی کے قریب رہا تھا۔

"کسی بس یا ویگن میں نہیں بیٹھ سکتے نواب صاحب؟" دل چیر دینے والے تمسخرانہ لہجے میں کامران نے کہا تو رشید اور سلیم زیر لب مسکراتے ہوئے بولے۔

"بھئی ہم ادھر چلے جاتے ہیں۔ بیٹھ چکا ہے تو اب بیٹھنے دو۔"

"اُٹھو۔" دروازہ کھول کر کامران نے اس کا کالر پکڑ کر باہر کی طرف اُسے کھینچا۔ لہجہ فرعونی تھا۔

"معزز مہمان کھڑے ہیں اور جناب ڈٹ کے بیٹھے ہیں۔ اتنی تمیز بھی نہیں۔ نکل یہاں سے۔ بس میں بیٹھ جا کر۔ بڑا آیا گاڑی میں بیٹھنے والا۔ باپ نے بھی کبھی گاڑی دیکھی تھی۔ ہونہہ۔"

طارق کا دماغ ہی کیا پوری کائنات ہی چکرا گئی۔ ذلت اور بے عزتی کے احساس نے اُسے کچل ڈالا اس کے کانوں میں قیامت کا شور گونج رہا تھا۔

"باپ نے بھی کبھی گاڑی دیکھی تھی؟"

"باپ نے بھی کبھی گاڑی دیکھی تھی۔"

"باپ نے بھی ۔"

"باپ نے بھی ۔"

اُسے لگ رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ کے پرخچے اُڑ رہے ہیں۔ وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا کچھ نہیں سمجھ سکتا اور کچھ نہیں بول سکتا۔ ایک اندھیرا گہرا کنواں ہے جس میں تیز گھماؤ کے ساتھ نیچے ہی نیچے چلا جا رہا ہے۔

اس گاڑی میں کامران نے رشید اور سلیم کو بٹھایا۔ پھر بے حس و حرکت کھڑے طارق پر ایک قہرمانی نگاہ ڈالتے دوسری گاڑیوں کی طرف چلا گیا۔

بعض چوٹیں ایسی ہوتی ہیں جو نظر نہیں آتیں۔ لیکن نظر آنے والی چوٹوں سے کہیں زیادہ اذیت دہ، کہیں زیادہ خطرناک اور بالکل ناقابل برداشت ہوتی ہیں۔ وہ جب لگتی ہیں تو سہاری نہیں جا سکتیں اور اس سہارے نہ جا سکنے ہی میں زندگی مفہوم بدل لیتی ہے۔ اہم فیصلے ہو جاتے ہیں۔ راہیں بدل جاتی ہیں۔ قدم نئے اور اجنبی راستوں پر از خود اُٹھ جاتے ہیں۔

طارق نے تقریباً ننھیال ہی میں ہوش سنبھالا تھا۔ جب تک شعور کو نہیں پہنچا تھا تب تک ذہنی چوٹیں لاشعور ہی میں دبی رہی تھیں۔ لیکن جب سے شعور ہوا تھا۔ اپنے اردگرد غیر محسوس سا ترحم اور ہمدردی کا حصار محسوس کیا تھا۔ اس کی شناخت ہی رحم اور ترس کے وسیلے سے ہوتی تھی۔ کامران انکل کی طرف سے تو اُس نے سرد مہری اور یخ بستہ نفرتوں کو ہمیشہ ہی محسوس کیا تھا۔ اُس کے اور بھی کزن تھے۔ ماموں کے بیٹے شاکرہ آنٹی کے بیٹے سبھی تھے لیکن انکل کامران کو اس سے شروع ہی سے جانے کیوں پرخاش تھی۔

اب اس پرخاش کی وجہ وہ سمجھنے لگا تھا۔

یہ اُس کی مانو میں غیر معمولی دلچسپی اور دوسروں کے رحم و کرم پر پڑی بے سہارا شخصیت تھی وہ عزیب تھا نا! اس لیے۔

اس لیے۔

ہاں اس لیے۔

یہ چوٹ اتنی گہری، اتنی خطرناک اور ایسی رسوا کن تھی کہ طارق اپنے آپ میں نہ آ سکا۔ کامران انکل کے الفاظ سیسے کی طرح اس کے کانوں میں ہر وقت اُترتے رہے۔

"باپ نے بھی کبھی گاڑی دیکھی تھی۔"

اُسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ اس ذلت و رسوائی اور طنز کا کیا کرے۔ کیونکر جواب دے۔ جو آگ اس بات سے اس کے اندر کھول.. اٹھی تھی۔ اسے کیونکر کامران انکل پہ اُلٹ دے۔

انکل احمد بھی تھے۔ شاکرہ آنٹی کے میاں پنکی کے ابو۔ کتنی عزت کرتے تھے اُس کی اور اُس کی امی کی۔ کتنا پیار دیتے تھے۔ یتیمی کے احساس محرومیت سے نکالنے کے لیے کتنی مثبت باتیں کرتے تھے لیکن،

یہ کامران انکل!

اُف!

طارق پر تو دیوانگی کا وہ لمحہ بھی آیا کہ اس کے ہاتھوں میں اینٹھن ہونے لگی۔ آنکھوں سے آگ برسنے لگی۔ کامران کا گلا دبوچنے کے لیے ذہن میں شدت سے خواہش سر اٹھانے لگی۔

اسی رات مانو اس کے پاس آئی جس گاڑی سے کامران نے طارق کو نکالا تھا اس میں سبین بھی بیٹھی تھی۔ اس نے مانو کو بتایا تھا کہ انکل نے طارق کی کتنی بے عزتی کی ہے۔ مانو روہانسی ہو رہی تھی۔

طارق اپنے کمرے میں کھڑا باہر گھور اندھیروں میں جیسے کچھ کھوج رہا تھا۔

مانو نے آہستگی سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "طارق! یہاں کیا کر رہے ہو؟"

وہ آہستگی سے ہی مڑا۔ مانو نے وہی کپڑے ابھی تک پہن رکھے تھے۔ دلہن کے آنے سے گھر میں بڑا ہنگامہ تھا۔ لیکن وہ سبین سے سب کچھ سنتے ہی اِدھر آ گئی تھی۔ طارق چند لمحے اُسے بے مقصد سی نظروں سے تکتا رہا۔

"طارق!" وہ جیسے رو دینے کو تھی۔

"کیوں آئی ہو۔؟"

"ہیں۔ ہیں۔ تم ادھر کہیں نظر نہیں آئے۔ سب لوگ دلہن۔۔۔۔"

"تم بھی جاؤ۔"

"تمہیں لینے آئی ہوں۔"

"کیوں۔ کامران صاحب کے کوئی اور نشتر ابھی۔۔۔۔"

"طارق!" اس نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا اور آنسو بھری آواز میں بولی" میں بابا کے رویے کی معافی مانگتی ہوں طارق، سبین نے ابھی ابھی مجھے بتایا ہے۔ پتہ نہیں بابا۔"

"تمہیں پتا ہے۔ کہ تمہارے بابا کیوں ایسا کرتے ہیں سارہ بیگم۔"

طارق کے طنزیہ لہجے پر وہ تڑپ گئی۔

"لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ تم میرے بچپن کے ساتھی ہو، دوست ہو عزیز ہو۔"

"ہاں۔ تم بھی میری زندگی ہو۔"

"تو پھر۔ اس تلخی کو ذہن سے نکال دو طارق۔ میرے لیے۔ معاف کر دو۔"

مانو نے اُسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ تو وہ تلخی سے بولا۔" شکر کرو اس بے عزتی پر میں نے انہیں قتل نہیں کر دیا۔"

مانو سر تا پا کانپ گئی۔" طارق۔" وہ گھبرا کر بولی۔

طارق چند قدم اٹھا کر کھڑکی سے دور ہوئے چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔

پھر بڑبڑایا۔" مار ڈالنے کے اور بھی طریقے ہیں۔ اور بھی۔"

"کیا کہہ رہے ہو طارق!" مانو سہمے سہمے انداز میں کچھ نہ سمجھ کر اس کے قریب آ گئی۔

طارق نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔" میری بے بسی اور غریبی نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔ میں اس سے لڑوں گا۔ اُسے قتل کر دوں گا۔ اسے مار ڈالوں گا۔ قسمت سے چھینوں گا۔ اتنا کچھ کہ میری اور

میرے والدین کی ذات پر لگے عزت کے دھبے مٹ جائیں۔ وہ منہ بند ہو جائے جس نے یہ کہنے کی جرأت کی ہے کہ تیرے باپ نے بھی کبھی گاڑی دیکھی تھی۔"

مانو بے چاری کچھ نہ سمجھ سکی۔ آگے بڑھ کر طارق کے دونوں۔۔ کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ طارق تم نے بہت زیادہ اثر لیا ہے، پلیز نارمل ہونے کی کوشش کرو۔"

طارق ہنسا" میں بالکل نارمل ہوں میری مانو بھی کہہ رہا ہوں تا کہ دولت کماؤں گا۔ قسمت سے اپنا حق چھینوں گا۔"

مانو خاموشی سے اُسے تکتی رہی۔

"مانو" اس نے مانو کی ٹھوڑی انگلی کے سہارے اونچی کر کے عجیب و غریب لہجے میں کہا عجیب و غریب جو مانو کے لیے انوکھا اور اجنبی تھا۔

"مانو، میرا اس وقت تک انتظار کر لوگی۔ جب میں سونے چاندی کا ڈھیر بنا کر اس پر کھڑا ہو جاؤں اور انکل عمران کی توجہ اپنی طرف ملتفت کر سکوں۔"

"پتا نہیں کیا ہو رہا ہے تمہیں۔" مانو نے سر جھکائے ہوئے کہا۔" اتنا اثر بھی نہیں لینا چاہیئے تمہیں بابا تمہارے باپ کی جگہ بھی تو ہیں۔ باپ بچے کو ڈانٹ بھی سکتا ہے غصے بھی ہو سکتا ہے۔ تم تو پتا نہیں کیا سے کیا بن گئے ہو۔"

"ابھی بنا نہیں۔ بننے کی سوچ رہا ہوں۔ اور بنوں گا ضرور۔ نہ بنا تو زندگی سے منہ موڑ لوں گا۔"

"طارق"۔ مانو رونے لگی۔

اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتے کمرے سے نکل گیا۔

طارق نے ایم اے میں داخلہ لینے کا خیال ترک کر دیا۔ اس نے ماں سے کہہ دیا۔

صابرہ نے حیران ہو کر پوچھا" تو بی اے کے بعد کیا کرو گے؟ تمہارے نمبر بھی اتنے نہیں کہ۔۔۔۔"

"ماں۔ یہ سب چھوڑ دے۔ میں نے پیسہ کمانا ہے۔ بس۔"

"پیسہ کمانے کا بھی تو کوئی وسیلہ ہوتا ہے۔ کوئی ہنر کوئی نوکری۔"

"یہ سوچنا میرا کام ہے۔ مجھے کچھ پیسے کی ضرورت ہے اور وہ۔ میں آپ سے لوں گا۔ میرے خیال میں آپ کے پاس تھوڑا بہت زیور ہے۔"

صابرہ ہنس کر بولی۔ "زیور پر نظر ہے تمہاری۔ پگلے وہ تو تیری دلہن کے لیے رکھا ہے میں نے۔ مشکل سے مشکل وقت میں بھی اسے ہاتھ نہیں لگایا۔"

"اس سے مشکل وقت آپ پر آیا ہی نہیں ماں۔"

"کیا مطلب؟"

"میں باہر جانا چاہتا ہوں۔ ویزا خریدنا ہے۔"

"باہر؟"

"ہاں ماں۔ باہر جا کر پیسہ کماؤں گا۔ اتنا کہ سونے چاندی کے ڈھیر لگا دوں گا تیرے قدموں میں"

صابرہ پہلے تو مسکرائی۔ پھر سنجیدگی سے بولی "باہر جا کر پیسہ کمانا ایسا آسان بھی نہیں بیٹے۔"

"آسان مشکل آپ کے سوچنے کی بات نہیں۔ مجھے پیسے چاہئیں۔ بس۔ جانا میں نے ضرور ہے۔ میں بندوبست کر رہا ہوں۔ جلد ہی لوٹا دوں گا آپ کی رقم۔"

"میری اور تیری رقم میں فرق ہے؟"

"بس پھر مجھے اجازت دیں۔ ماں میں بہت پیسہ کمانا چاہتا ہوں۔ بہت۔ اتنا بہت کہ میری اور تیری زندگی پہ رشتے داروں عزیزوں کے احسانوں کے جو چھینٹے لگ چکے ہیں نا، وہ مٹ جائیں۔ میں سب کے احسان، سب کے رحم، سب کے ترس لوٹا دینا چاہتا ہوں ماں۔ نہ لوٹا سکا تو گھٹ گھٹ کے مر جاؤں گا۔"

صابرہ نے انہیں سینے سے لگایا۔ تسلی دی۔ دعائیں دیں وہ جانتی تھی طارق بہت حساس ہے۔

پھر اس نے بیٹے سے جدا ہونے کا دکھ جھیل لینے کی ہمت اپنے میں پیدا کی۔ طارق نے دنوں ہی میں سب کچھ کر لیا۔ وہ یہاں سے سیدھا سعودی عرب جا رہا تھا۔

جس دن اس نے روانہ ہونا تھا کچھ عزیز رشتے دار اکٹھے ہو گئے تھے وہ دعائیں اور پیار سمیٹ رہا تھا۔ انکل احمد تو واقعی بڑے پیار سے سمجھا رہے تھے۔ نصیحتیں کر رہے تھے۔ شاکرہ نے بھی پیار کیا تھا۔ عامرہ نے بھی پیٹھ تھپتھپا کر دعائیں دی تھیں۔ انکل کامران نے بھی ہنس کر ہاتھ ملایا تھا۔ لیکن طنز سے باز نہیں آئے۔ "ٹھیک ہے بھئی باہر جا کر روٹی تو کما ہی لو گے۔ یہاں جو کچھ نہیں کر سکتا باہر جا کر خاصا کما لیتا ہے۔"

"شکریہ انکل۔" اس نے انکل کا ہاتھ اک ارادے اک عزم کے ساتھ مضبوطی سے دبا دیا۔۔۔

"آپ کی دعائیں شامل حال رہیں تو شاید روٹی کما ہی لوں وہاں۔"

ائیرپورٹ پر بھی کچھ لوگ چھوڑنے آئے۔ مانو بھی آئی تھی، پنکی بھی۔ دوسرے کزن بھی تھے۔ مانو کی آنکھوں میں بار بار نمی تیر رہی تھی۔ بچھڑنے کا دکھ اذیت دہ تھا۔ طارق سب سے ملا۔ مانو سے ملا تو سارے دکھ اپنے اندر اتار لیے بولا۔ "مجھے سب سے زیادہ دکھ تمہیں چھوڑ دینے کا ہے۔"

مانو جلدی سے بولی "مجھے خط لکھتے رہنا طارق۔ ہم دور ہو جائیں گے۔ لیکن ایک دوسرے کو چھوڑ تو نہیں دیں گے نا۔"

وہ نمی سے ہنستے ہوئے پنکی کی طرف مڑ گیا۔ اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے بولا "بس اور لمبی نہیں ہونا۔ یہ نہ ہو میں واپس آؤں اور تم چنا کی بہن بن چکی ہو۔"

"ہائے نہیں طارق بھائی۔۔۔۔" وہ شرمیلی ہنسی سے بولی "کل پانچ فٹ پانچ انچ تو ہوئی ہوں اب بڑھتی تھوڑا ہی رہوں گی۔"

طارق باری باری سب سے ملا کسی سے مذاق کسی سے ہنسی۔ ماں سے آخری مرتبہ ملا تو آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اچھے دنوں کی امید رکھنا ماں۔ تمہاری دعائیں چاہئیں ماں مجھے۔"

"خدا تیرا حافظ و ناصر ہو بیٹے" صابرہ آنسو پلو سے پونچھتے ہوئے بولی۔

"خدا مجھے میرے مقصد میں کامیاب کرے۔"

"آمین۔"

یوں وہ اک مقصد، اِک عزم اور نفرتوں کی توانائی لے کر اپنے ملک سے غیر ملک کی جانب پرواز کر گیا۔

محبت بہت بڑی قوت ہے، طاقت ہے۔ توانائی ہے۔
لیکن نفرت بھی اپنی جگہ کچھ کم توانا نہیں ہوتی۔ اس کی قوت اور طاقت کی خطرناکی کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔

پہلے دو سال طارق نے جن مصائب و آلام سے گزارے یہ وہی جانتا تھا۔ ان دو سالوں میں اس نے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی۔ دربدر ہوا۔ نوکریاں کیں مزدوری کی۔ پتھر کوٹے ٹوکری اٹھائی۔ سیل مین بنا۔ کئی کئی ماہ بیکاری کی نذر ہوتے لیکن ہمتیں جواں ہوں ارادے پختہ اور عزائم مستحکم ہوں تو تقدیر بھی سرنگوں ہو جاتی ہے۔ طارق نے دن رات ایک کر دیئے تھے۔ ناکامی نے اسے کامیابی کی راہوں پر ڈالا تھا۔ اس نے واقعی کامیابی کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا تھا۔ کہ وہ اس کے قدموں کی باندی بن گئی تھی۔

عرب ممالک سے وہ یورپی ممالک میں آیا۔ حالات روز بروز ترقی کرتے گئے۔ تجربہ آتا گیا۔ زمانہ سازی سیکھ لی۔ اب وہ ماں کو باقاعدگی سے پیسے بھیجنے لگا۔ ہر ماہ اتنا پیسہ بھیجتا کہ اکیلی جان کو سال بھر کے لیے کافی ہوتا۔ لیکن وہ ہر خط میں اصرار کرتا۔ "ماں، جی کھول کر خرچ کرو۔ اپنے اوپر اور ان لوگوں پر جن کے احسانات تلے ہم اتنا دب گئے تھے کہ سانس نہ لے پاتے تھے خوب تحفے تحائف دیا کرو سب کو۔"

اب اس کے پاس بہت پیسہ تھا۔ وہ یورپ سے امریکہ چلا گیا۔ جہاں اس نے اسٹور کھولا، یہ اسٹور پھیلتا گیا۔ ڈالروں کا ہُن برستا گیا۔ وہ ہزاروں ڈالر ماں کو بھیجتا۔ ماں کے لیے اس نے ایک نئی خوبصورت کوٹھی خریدی۔ نوکر رکھوائے۔ خوبصورتی سے آراستہ کروایا۔ گاڑی لی۔ یہ سارے کام اس نے اپنے پاکستان جانے والے دوستوں سے کروائے۔ یہ دوست اپنی چیزوں سے زیادہ اس کی چیزیں لے کر آتے تھے

اب تو خاندان کیا دوستوں عزیزوں میں بھی اس کی دولت کے چرچے تھے۔ صرف دولت ہی نہیں تعلیم کے بھی چرچے تھے۔ بزنس کے ساتھ ساتھ اس نے تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا۔ پچھلے ہی سال ایم اے بھی کر لیا تھا۔

احمد انکل تو خیر پہلے ہی اسے بہت چاہتے تھے۔ لیکن اب تو کمران انکل کے رویئے بھی بدل گئے تھے۔ اس کی دولت اور تعلیم سے مرعوب ہو ہو جاتے تھے۔ پھر وہ انہیں ہر آنے والے کے ساتھ بیش قیمت اور نایاب تحفے بھی تو بھیجتا تھا۔ گُن کیونکر نہ گاتے اس کے۔

ابھی پچھلے ماہ ہی اس نے انہیں جو گھڑی بھیجی تھی اس کی قیمت انہوں نے معلوم کروائی تھی۔ پورے پینتیس ہزار کی تھی پاکستان میں اور صابرہ نے جو ڈائمنڈ کا سیٹ مانو کو بی اے کرنے پر دیا تھا۔ وہ کوئی کم قیمتی تھا، آنکھیں کھل گئیں سب کی۔ طارق آئے دن نایاب اور خوبصورت چیزیں بھیجتا رہتا تھا۔ ماں کو اس نے کبھی یہ نہیں لکھا کہ فلاں چیز فلاں کو دینا سوائے کامران انکل کے۔ ان کے لیے وہ ایک سے ایک بڑھیا چیز بھیجتا اور چٹ لکھنا نہ بھولتا۔ "کامران انکل کے لیے۔ شاید حقیر نظرانہ انہیں پسند آجائے!"

مانو کو صابرہ خود ہی اچھے اچھے تحفے دیتی تھی۔ اس سے کون سی بات چھپی تھی۔ وہ دونوں تو بچپن ہی سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ مانو ہی نے تو اس کی بہو بننا تھا۔ طارق کی کمائی میں سے ابھی سے اس کا حصہ نکال رہی تھی۔ اسے خوشی تھی نا۔ ویسے چھوٹے موٹے تحفے وہ خاندان کی دوسری بچیوں اور بچوں میں بھی تقسیم کرتی تھی۔ پنکی نے ایف اے پاس کیا تو اسے بھی ڈائمنڈ کا نفیس سا لاکٹ دیا۔

اب تو صابرہ خاندان کی بڑی محترم اور معزز خاتون تھی۔ ساری عمر دوسروں کی خدمت گزاری کرنے والی صابرہ کی خدمت کرنا اب ہر کوئی فخر کی بات سمجھتا تھا۔

کامران کا رویہ تو بالکل ہی بدل گیا تھا۔ کروڑپتی بیٹے کی ماں تھی صابرہ۔ اور یہ بیٹا اس کی بیٹی کا دیوانہ تھا۔ اسے تو رہ رہ کر مانو کے نصیبے پر حیرانگی آتی۔ اتنا یاور مقدر تھا اس کا۔ طارق کی دولت کے چرچے عام ہو رہے تھے اتنا ہی اس کا غرور و تفاخر بڑھ رہا تھا۔

مانو نے ایم اے میں داخلہ لیا تو کامران نے ہنس کر کہا: "بیٹے خالی خولی بی اے، ایم اے کرنے

کا کیا فائدہ؟"

"تو بابا۔" مانو حیرانگی سے بولی۔

"بھئی انگریزی بولنا سیکھ لو۔ فرفر کرکے۔ امریکہ جاؤگی تو کوئی جھجک محسوس نہ ہو۔"

"بابا۔" مانو شرما گئی۔

عامرہ نے بھی یہی کہا "بھئی ٹھیک کہتے ہیں تیرے بابا۔ مانا کہ تجھے انگلش لکھنا پڑھنا آتی ہے لیکن بولنے کی جھجک دور ہونی چاہیئے۔ امریکہ جاکر تمہیں محض زبان کی وجہ سے کمپلیکس نہیں ہونا چاہیئے۔"

"آتی ہے مجھے۔" وہ اٹھلا کر بولی۔ اور پھر شرمیلی نگاہیں امی ابو پہ ڈالتے ہوئے دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

طارق کے آنے کی خبر تو اک خوشگوار مہک کی طرح سب طرف پھیل گئی۔ صابرہ کی خوشیوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بار بار بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہو کر اس کے سلامتی سے آنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ لگتا تھا زندگی میں اسے دیکھ ہی نہ پائے گی۔

لیکن خدا اس پہ مہربان تھا۔ عنایتوں اور نوازشوں کی بارش برسا رہا تھا۔ وہ خوشی خوشی تیاریاں کر رہی تھی۔ طارق نے یہ بھی تو لکھا تھا کہ۔ وہ شادی کرنے آ رہا ہے

وہ کتنی دھوم دھام سے شادی کرنا چاہتی تھی!

کتنے ارمان پورے کرنا تھے۔

کتنی حسرتوں کو تسکین دینا تھی۔

وہ سوچ سوچ کر ہی باؤلی ہوئی جا رہی تھی۔ اتنی خوشیوں کا بار سمیٹے نہیں سمٹ رہا تھا۔

خاندان کے دوسرے لوگ بھی منتظر تھے۔ خوش تھے۔

لیکن صابرہ کے بعد اگر خوشی تھی تو وہ کامران، عامرہ اور مانو کو۔ عامرہ اور کامران نے تو اپنے طور پر چپکے چپکے شادی کی تیاریاں بھی شروع کر دی تھیں لمبا چوڑا جہیز تو چاہیئے نہیں تھا۔

صرف زیور اور کپڑا بنوانا تھا۔ باقی نقد ہی دینے کا سوچ لیا تھا۔

مانو نے ایک خوبصورت ڈریس اس خوش قسمت دن کے لیے تیار کروایا تھا جس دن اس نے طارق کو لینے ائیرپورٹ جانا تھا۔

درزی کی دوکان پہ وہ ڈریس دیکھ کر مین میخ نکال رہی تھی۔ "ماسٹر یہ بٹن یہاں لگنے تھے اور یہ چُنٹ یہاں آنی تھی۔ تم نے تو ڈیزائن ہی خراب کر دیا۔ اب میں کیا پہنوں گی۔"

درزی نے تسلی دی۔ "بی بی یہ پانچ منٹ کا کام ہے۔ ابھی آپ کی مرضی کے مطابق بن جائے گا۔"

"تو بناؤ جلدی سے مجھے چاہیئے ضروری۔ آج ہی لے کر جاؤں گی۔"

"کوئی کام ہو بازار میں تو ہو آئیے آنے تک بن جائے گا۔"

وہ بازار کا چکر لگانے چلی گئی۔ ملازمہ ساتھ تھی۔ کچھ دیر بعد گھوم پھر کر آئی تو دکان پہ پنکی بھی اپنے کپڑے لینے آئی تھی۔ اس نے اک سادہ سا کاٹن کا جوڑا سلنے کو دیا ہوا تھا۔ مانو کا ڈریس دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "منگنی کے لیے بنوایا ہے؟"

"آہا۔" وہ اٹھلائی "تمہارا کیا خیال ہے منگنی پہ میں ایسے کپڑے پہنوں گی۔"

"ہاں بھئی۔ طارق بھائی شاید امریکہ ہی سے لے کر آئیں کوئی انوکھی چیز۔"

"شاید۔" اس نے بڑے زعم سے آنکھیں گھما کر کہا۔

"بہت خوش ہو!" پنکی نے چھیڑا۔

"اوں ہوں!" مانو نے منہ بنایا۔

"کیوں؟"

"میں تو ناراض ہوں طارق سے!"

"کیوں؟"

"بس۔"

"پھر بھی۔"

"بہت خراب ہے۔"

"خیریت!"

"چھ سات سال کے بعد آ رہا ہے۔"

"ہاں۔"

"اس عرصے میں مجھے ایک خط بھی نہیں لکھا۔"

"چل بے شرم کہیں کی۔"

"اس میں بے شرمی کی کیا بات ہے۔ دیکھنا کتنی لڑائی کرتی ہوں آتو سے۔"

"بھئی ایئرپورٹ پہ ہی نہ لڑ پڑنا۔"

"میں ایئرپورٹ پہ ہی نہیں جاؤں گی۔"

"چل رہنے دے۔ تو تو دو دن پہلے ہی جا بیٹھے گی ایئرپورٹ پہ۔"

مانو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی "یعنی منگل کو وہ آ رہا ہے اور میں پیر نہیں اتوار یا ہفتے ہی کو جا بیٹھوں گی۔"

"تو اور ـــ" وہ بھی ہنس پڑی۔

منگل کی شام چھ بجے کی فلائٹ سے وہ پہنچ رہا تھا۔

طیارے میں اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی لاہور آ رہا تھا۔ لوگوں میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ کچھ بیلٹیں باندھنے لگے تھے کچھ سامان پر نگاہ ڈال رہے تھے کچھ گمسم دبیٹھ پر طائرانہ نگاہ ڈال کر یہاں اترنے والوں کا نظارہ کر رہے تھے۔

طارق نے بھی اک لمبی گہری سانس لی۔ اک جھٹکے سے ماضی کے حصار سے نکلا۔ بریف کیس اور بیگ قریب کیا۔ اس کے اندر بے چین سی گھبراہٹ تھی۔ اضطراب تھا۔ خوشی تھی اور تفاخر تھا۔ اسے یقین تھا بہت سے لوگ اسے لینے آئے ہوں گے۔

بہت سے۔

جن میں اس کی پیاری ماں بھی ہو گی اور ـــ اور۔ کامران انکل بھی۔

مانو بھی ضرور ہو گی۔

اس نے اک جھرجھری سی لی۔ اذیت کے سائے اس کے چہرے پر لہرا گئے۔ آنکھوں میں کرب سا پھیل گیا۔ اک لمحے کو اسے یوں لگا جیسے وہ ڈگمگا گیا ہے۔ چھ سوا چھ سالوں کی طوالت پر پھیلے فیصلوں سے ہٹ گیا ہے۔

لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھلا۔ اس کے اندر اک زوردار "نہیں" گونجی۔

بالکل اسی طرح جس طرح اس کے اندر انکل کامران کی بات گونجی تھی۔

"باپ نے بھی کبھی گاڑی دیکھی تھی!"

وہ جو چند لمحے پہلے موم کی طرح پگھل کر بہہ جانے لگا تھا۔ اب کسی سخت دھات کے قالب میں ڈھل گیا۔ اس کا عزم پکا تھا۔ پکا ـ جو کبھی ڈگمگا نہیں سکتا تھا۔

ایئرپورٹ پر واقعی بہت سے لوگ اسے لینے آئے تھے۔ کچھ لوگ تو جیسے اسے پہچان ہی نہ سکے۔ کیا جیلا کتنا صحتمند اور کیسا خوبصورت نکلا تھا۔

صابرہ تو اس سے لپٹ کر بے اختیار سی ہو گئی۔ خوشی سنبھل نہ پائے تو رونے سے توازن قائم ہو جاتا ہے۔ وہ بھی رو رہی تھی۔ طارق اسے مضبوط بازوؤں میں تھامے خود بھی روہانسا ہو رہا تھا ـــ جدائی کی کتنی تلخیاں اس نے اپنی جان پر سہی تھیں۔

کامران انکل بھی اسے ملے۔ اتنے زور سے سینے سے لگا کر بھینچا کر اسے لگا سینے ہی میں سمو لیں گے۔ احمد، عامرہ، انشا کرہ اور چھوٹے بڑے کئی کزن آئے تھے۔ مانو بھی تھی۔ بہت شوخ اور چنچل بنی پھرتی تھی۔ اسے دیکھا تو شرما کر آنکھیں جھکا لیں، گالوں پر سرخیاں لہرانے لگیں۔

"ہیلو مانو ـــ اب بھی مانو ہو یا سارہ بن چکی ہو..." طارق نے اسے دیکھ کر کہا۔

کامران قریب ہی کھڑا تھا۔ ہنس کر بولا "بھئی سب کے لیے سارہ بن جائے، تمہارے لئے تو مانو ہی رہے گی نا۔ تم نے ہی اس کا نام مانو بلی رکھا تھا۔"

طارق ہنس پڑا۔ پھر اس نے پنکی کو دیکھا سرو قد سی پنکی بھی بڑی پُرکشش نوجوان لڑکی بن چکی تھی۔

"شکر ہے تم اور لمبی نہیں ہوگئیں۔" طارق نے اس کے سراپا پر پُرشوق نگاہ ڈالی۔

"اتنی کی اتنی ہوں نا طارق بھائی۔" پنکی بے تکلفی سے ہنسی۔

"اوں ہوں۔ قد کی تو اتنی ہو۔ لیکن سوا چھ سال بڑی ہو چکی ہو۔" وہ مسکرا کر بولا۔

رات کو صابرہ کی نئی کوٹھی میں بڑی گہما گہمی تھی۔ ایئرپورٹ سے سب لوگ ادھر ہی آگئے تھے۔ طارق سے مل مل کر جیسے جی نہیں بھر رہا تھا۔ طارق بھی بچھڑے عزیزوں سے مل کر خوش ہو رہا تھا۔ سوال و جواب کے سلسلے تھے کہ ختم ہونے ہی میں نہ آرہے تھے۔

چھ سوا چھ سال کی روداد سننے کو ہر کوئی بے چین تھا۔ سوالوں پہ سوال پوچھے جا رہے تھے۔ طارق ابھی ایک بات کا جواب بھی نہ دے پاتا کہ دوسری طرف سے سوال ہو جاتا۔ چائے اور کھانے پر بھی یہی سلسلہ رہا۔ زیادہ تر سوال اس کی بے پناہ دولت ہی کے بارے میں ہو رہے تھے۔ انکل کامران تو جیسے الف سے ی تک کا حساب لینا چاہ رہے تھے۔ طارق ان کی ذہنی کیفیت کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ جب انہوں نے ہنستے ہوئے پوچھا: "کُل مالیت کتنی ہوگی تمہارے اسٹوروں کی...."

طارق نے ان کی طرف دیکھا پھر اک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اس مسکراہٹ پہ کوئی تصنع کا لبادہ ڈالے بغیر بولا: "کامران انکل، اللہ کا بڑا احسان ہے۔ جس کے باپ نے کبھی گاڑی بھی نہ دیکھی تھی۔ وہ گاڑیاں تو کیا پلین بھی خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے۔"

کامران کے ذہن پر جیسے اس نے اک کاری ضرب لگا دی۔ یہ جملہ اُسے وہ سارا واقعہ یاد دلا گیا۔ بہت خفت محسوس کرتے ہوئے چند لمحوں بعد بولا۔ "بیٹے وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔"

"بالکل انکل، وقت وقت ہی کی بات ہوتی ہے۔" طارق نے جواب دیا۔ اور پھر انکل احمد کی طرف مڑ کر ان کی احوال پُرسی کرنے لگا۔

دونوں کی گفتگو سے کوئی بھی تو کچھ سمجھ نہ پایا تھا۔ مانو وہاں تھی نہیں۔ صابرہ نے البتہ کچھ تلخی

سی محسوس کی۔

رات جب ماں بیٹا دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے تو صابرہ نے اچانک ہی پوچھ لیا۔ "یہ تو نے کامران کی بات کا اتنی ترشی سے کیوں جواب دیا تھا کہ باپ نے گاڑی نہیں دیکھی۔"

"او ماں!" طارق نے طمانیت کی اک گہری سانس لی۔ پھر بولا۔ "یہ کہنے کے لیے تو میں نے چھ سات سال جانے کس طرح صبر کیا ماں۔"

"کیا کہہ رہا ہے۔"

"ماں، انسان سب کچھ بھول سکتا ہے لیکن ذلت و رسوائی نہیں بھول سکتا۔ یہ زخم۔ یہ زخم لگ جائیں تو ہرے ہی رہتے ہیں۔ آگ کی طرح جلتے رہتے ہیں۔ اذیت دہ اور کرب ناک۔"

"میں سمجھی نہیں۔ ٹھیک ہے کامران کا رویّہ تیرے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب تو...."

وہ ہنسا اور ہنستا چلا گیا۔

صابرہ پہلے تو اس کا منہ تکتی رہی پھر قدرے سختی سے بولی۔ "پاگل تو نہیں ہوگیا تو۔"

"نہیں ماں نہیں۔" اس نے بیڈ پر بیٹھے بیٹھے اپنا سر ماں کی گود میں رکھ دیا۔ اور پھر۔ پھر!

وہ واقعہ ماں کو سنایا۔ بے عزتی۔ ذلت اور رسوائی کا واقعہ۔

صابرہ بُت سی بن گئی۔

"ماں۔ میں نے اسی دن عہد کر لیا تھا۔ ارادہ باندھ لیا تھا۔ کہ دولت کا اتنا اونچا ڈھیر لگا کر اس پر کھڑا ہوؤں گا۔ کہ کامران انکل کو گردن پیچھے لے جا کر مجھے دیکھنا پڑے۔ میں حق پہ تھا سچا تھا۔ میری انا کی چوٹ گہری تھی خدا نے مجھے کامیاب کر دیا۔"

وہ بولتا چلا گیا۔

صابرہ سُن بھی رہی تھی اور نہیں بھی سُن رہی تھی اس کی سوچیں تو اُلجھ رہی تھیں۔

ان حالات میں۔ ان احساسات کے ساتھ ان جذبوں کو لیے ۔ کیا طارق ۔ مانو ۔ ؟ ؟

وہ کچھ سوچ نہ پائی۔

طارق نے گود سے سر اٹھایا اور ماں کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر بولا ۔ "ماں، کامران انکل نے تمہاری بھی تو کبھی عزت نہ کی تھی ۔"

"لیکن ۔"

"کیا ماں ؟"

وہ چپ رہی ۔

طارق پھر بولا "شاید میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو ماں ۔"

"بولو کیا ارادہ ہے ۔"

وہ ہنس کر بولا "شادی کرنے آیا ہوں ۔"

"کس سے کرو گے ۔"

وہ چند لمحے چپ رہا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر اداسی پھیل گئی۔ گہری گہری آنکھوں میں تلاطم سا بپا ہو گیا۔ چند ثانیے اپنے نچلے ہونٹ کا گوشہ دانتوں تلے کاٹتا رہا۔ پھر بڑے گمبھیر لہجے میں بولا۔ "مانو سے یقیناً نہیں ۔"

"طا... ر... ق"

"ہاں ماں... یہ فیصلہ میں نے بہت پہلے کر لیا تھا لیکن محفوظ اس لیے رکھا تھا کہ اپنی اہانت کا بدلہ لے سکوں۔ کل آپ نے دعوت دی ہے نا سب کو ۔ کل ۔ کل اس دعوت میں میری منگنی کا اعلان بھی کر دینا ماں ۔"

صابرہ ہکا بکا اسے تک رہی تھی

"سب کے سامنے ۔ ہاں ماں سب کے سامنے ہیں... منگنی کی انگوٹھی ۔"

صابرہ بے صبری سے بولی "کسے پہناؤ گے ۔"

طارق نے بڑے سکون سے جواب دیا "پنکی کو ۔"

صابرہ پوری آنکھیں کھولے اسے تکنے لگی ۔ اس نے پھر ماں کی گود میں سر رکھ دیا اور آنسوؤں کی نمی گھلی آواز میں بولا ۔ "آپ کل صبح شاکرہ آنٹی اور احمد انکل سے پنکی کے لیے بات کر لو ماں سب کچھ بہت جلد ہو جانا چاہیئے ۔"

"لیکن بیٹے ۔" صابرہ کی آواز بجھ گئی۔

طارق نے سر اٹھایا۔ سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے ماں کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر آہنی آواز میں بولا "میں نے جو کچھ کہا ہے وہی کروں گا۔ آپ شاید جانتی ہیں کہ مانو سے مجھے کتنا پیار ہے پھر بھی میں اس کے پیار سے منہ موڑ کر پنکی کو قبول کر رہا ہوں۔ ہاں ماں ۔ میں دانستہ ایسا کر رہا ہوں۔ کچھ زخم بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ انہیں بھرا نہ جائے تو موت کا پیغام بن جاتے ہیں۔ ان کی رفوگری کی جاتی ہے، وہاں بھی زخم پڑ جاتا ہے۔ لیکن ...."

"میں کچھ نہیں سمجھی ۔" صابرہ نے تلخی سے کہا۔ "جو جی میں آتا ہے کر ۔ میرے لیے تو جیسی مانو ویسی پنکی ۔ فرق تو تجھے ہی پڑے گا ۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ بے تاب بے تاب ہو کر بولا "ہاں مجھے ہی پڑے گا ۔ لیکن تم نہیں جانتیں ماں نہیں جانتیں ۔ نہیں جان سکتیں ۔"

وہ غیر متوازن چال میں توازن پیدا کرتا کمرے سے نکل گیا۔

دوسری شام بڑی حسین و رنگین تھی ۔

بہت بڑی اور پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مہمان آ رہے تھے۔ گہما گہمی اور رونق بڑھ رہی تھی فضا میں خوشی و مسرت کے نغمے گونج رہے تھے۔ مہک بکھر رہی تھی ۔ خوشگوار موضوعات پر بڑے ہلکے پھلکے انداز میں باتیں ہو رہی تھیں ۔ اس محفل میں عامرہ اور کامران پیش پیش تھے۔ وہ بڑے دلفریب انداز میں محفل کی رونق بڑھا رہے تھے۔ خوش گپیوں اور جاندار قہقہوں سے ماحول کو رعنائی بخش رہے تھے۔

مانو نے بھی آج بہترین لباس زیب تن کیا تھا۔ اپنے طور پر ہی اس نے اپنی سہیلیوں کو بھی دعوت دے ڈالی تھی۔ ستاروں کے جھرمٹ میں چاند بنی اٹھلاتی پھر رہی تھی۔ اپنی سہیلیوں کو طارق سے نئے رشتے کے حوالے سے ملوانے کا رش کی وجہ سے موقع نہیں مل رہا تھا۔ طارق کو ملنے والے چھوڑ ہی کب رہے تھے۔

مختلف قسم کے مشروبات سے مہمانوں کی تواضع ہو چکی تو آصف نے آکر کہا "صابرہ آنٹی کھانا لگا دیں؟"

طارق نے گھڑی دیکھی، پھر ماں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "امی پہلے رسم نہ ہو جائے؟"

"کیسی رسم؟"

"کونسی رسم؟"

ارد گرد کھڑے لوگوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ان لوگوں میں کامران بھی تھا۔

"کیسی رسم بیٹے؟" کامران ہی نے بڑھ کر پھر پوچھا۔

"انکل منگنی کی رسم۔" طارق نے بڑے مستحکم لہجے میں کہا۔ صابرہ جھجک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

کامران کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ عامرہ کو آواز دے کر بلایا۔ طارق اس کے چہرے پہ جل اٹھنے والے چراغوں کو دیکھ کر بے حد مسرور ہو رہا تھا۔

چراغ۔

جو اگلے لمحے گل ہو کر دھواں دینے والے تھے۔

سب طارق کے گرد کھڑے ہو گئے۔ احمد انکل اور شاکرہ بھی آگئے۔ خوش تو دونوں بہت تھے لیکن کچھ خجل خجل بھی تھے۔ سب چہک رہے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔

"دعوت کی خوشی دوبالا کر دی تم نے۔"

"لطف آجائے گا۔"

"ایک پنتھ دو کاج۔"

"نہیں بھئی، منگنی کی باقاعدہ دعوت الگ ہوگی۔ چھوڑیں گے نہیں ہم۔"

ہنستے مسکراتے سب طارق کے گرد جمع تھے۔ پنکی اور مانو بھی آگئی تھیں۔ کس بات پہ ہنسیوں کی پھوار برس رہی تھی، مانو کو پتا تھا نہ پنکی کو۔

طارق نے جیب سے ایک خوبصورت ڈبیہ نکالی جس میں انتہائی نفیس اور بیش قیمت انگوٹھی تھی انگوٹھی نکال کر اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ "اجازت ہے ماں؟"

صابرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

طارق نے انکل احمد اور شاکرہ آنٹی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا "اجازت ہے"

ان کی مسکراہٹ ہی اجازت تھی۔ طارق آگے بڑھا۔ اور پنکی کے عین سامنے کھڑا ہو کر ایک بار انگوٹھی کو دیکھا۔

پھر پنکی کو۔ مسکرا کر۔ نگاہوں میں شوق کی چمک لا کر۔

پنکی ہڑبڑا گئی۔ مانو نے گھبرا کر دونوں کو دیکھا... کامران انکل اور عامرہ تو دم بخود رہ گئے۔

اس نے پنکی کا ہاتھ تھام کر... انگوٹھی اسے پہنا دی۔ پنکی سرخ ہو گئی۔ شرما کر وہاں سے بھاگ جانا چاہا لیکن صابرہ نے اسے بازوؤں میں بھر لیا مبارک سلامت کا شور مچا۔ تالیاں بجائی گئیں۔ واہ واہ کی گئی۔ کچھ لوگ متعجب بھی ہوئے۔ ان کے خیال میں قرعۂ فال تو مانو کے نام نکلنا تھا۔ مانو تو جیسے پتھرا ہی گئی۔ کچھ یہی حال عامرہ کا تھا۔

طارق نے کامران کی طرف دیکھا۔ بجھتے چراغ اس طرح دھواں دے رہے تھے کہ ان کی شکل پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ زندگی نے اس سے زیادہ شدید دھچکا شاید اسے کبھی نہ لگایا ہوگا۔

طارق نے آج اس ذلت و رسوائی کا بدلہ لے لیا تھا۔ جو اس کے لیے سوہانِ روح بنی تھی۔ جو وہ بچپن سے جھیلتا آیا تھا اور جس کی انتہا اس دن ہو گئی تھی۔ جس دن انکل کامران نے سب کے سامنے اسے کالر سے پکڑ کر گاڑی سے گھسیٹ کر نکالتے ہوئے رکیک جملہ کسا تھا "باپ نے بھی کبھی گاڑی دیکھی تھی؟"

اتنے عرصے کے بعد طارق کو آج سکون ملا تھا۔ رِستے زخم مندمل ہو گئے تھے۔

گو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ زخم مندمل ہوئے۔ لیکن نئے زخم کو بھی جنم دے گئے۔ مانو کی محبت کا گلا گھونٹ کر اس نے سکون کی راہ پائی . . . اسے ایسا کرنا پڑا۔

کچھ پانے کے لئے، کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ خطرناک زخموں کی زخموں کی رفوگری کے لیے جسم کے صحت مند حصے ہی سے تو ٹکڑا کاٹ کر لگانا پڑتا ہے۔

محبت بہت بڑی قوت ہے۔ طاقت ہے۔ توانائی ہے۔

لیکن

نفرتیں بھی اپنی جگہ کچھ کم توانا نہیں ہوتیں۔ ان کی قوت اور طاقت کی خطرناکی کا تو اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ نہیں لگایا جا سکتا۔

انتظار

سب کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔

آج جمال آ رہا تھا۔ پورے تین سال بعد واپس آ رہا تھا۔ راجاں اور کملے کا تو پاؤں زمین پر نہیں آ رہا تھا۔ بیٹا تین سال کی کمائی سمیت آ رہا تھا۔ گاؤں کے بہت سے لڑکے باہر گئے ہوئے تھے۔ جمال ان کے ہاتھ اکثر تحفے تحائف بھیجا کرتا تھا۔ کبھی جاپانی ریشمی سوٹ، کبھی گھڑیاں تو کبھی الیکٹرک کی کوئی چیز۔ زہراں، چھمو اور شادو کے لیے تو اس نے اسی طرح چیزیں بھجوا بھجوا کر کافی جہیز جمع کر دیا تھا۔ اب تو وہ خود آ رہا تھا۔ ڈھیر ساری ولائتی چیزوں کے ساتھ۔ ہزاروں روپے کی ہنڈیاں لے کر۔ کمالے کے لیے ویگن تو اس نے آنے سے پہلے ہی بک کروا دی تھی۔

راجاں آج بہت سویرے جاگ گئی۔ رات بھر اس نے سوتے جاگتے میں جمالے ہی کے سپنے دیکھے تھے۔ اس کا ایک اکلوتا بیٹا پورے تین سال بعد آ رہا تھا۔ خوشی اس کی رگ رگ میں تیر رہی تھی ممتا بیٹے پر نچھاور ہونے کو تڑپ رہی تھی۔ وہ تصور کی آنکھ سے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ تین سالوں میں وہ کیسا ہو گیا ہوگا۔ اب تو خوب صحت مند ہوگا۔ رنگت تو جب تین سال پہلے وہ گھر آیا تھا میلی ہو گئی تھی۔ عرب ملکوں میں گرمی بھی تو بہت پڑتی ہے۔ بے شک وہ ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں رہتا ہے لیکن کام تو باہر ہی کرتا ہے نا۔ جھلس دینے والی گرمی اور تپتی ریت۔ راجاں کا دل ہول رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اب کے جمالے کو واپس جانے نہیں دے گی۔ وہ اتنا پیسہ تو لے آئے گا کہ یہیں کوئی چھوٹا موٹا کام کر لے۔ لیکن اس کی سوچ رک جاتی۔ چھوٹے موٹے کام سے اب گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک دو بار تو اسے باہر جانا ہی پڑے گا۔ تینوں بہنیں

بیل کی طرح بڑھتی جا رہی تھیں۔ فوراً اس کی شادی بھی کرنا تھی اور اس شہر میں زمین خرید کر مکان بھی بنوانا تھا۔ گاؤں میں تو جمال کا رہنے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔ پھر یہاں بھی کون سی زمین جائیداد تھی۔ لے دے کے مٹی کی کچی دیواروں والا یہ گھروندا ہی تھا۔ اسے اونے پونے بیچ کر شہر میں زمین لی جا سکتی تھی۔

راجاں نے دو ایک بار جمائی لی، کروٹ بدلی، کھنکار کر گلا صاف کیا تو اپنی چارپائی پر چپت لیٹا ہوا کمالا بولا "ابھی تو آدھی رات ہے۔"

"تم بھی جاگ گئے۔"

"میں تو سویا ہی نہیں۔"

"خراٹے میں لے رہی تھی؟"

"بھلی لوگ۔ آنکھ جھپکی ہوگی۔ پر نیند پوری طرح نہیں آئی۔"

"بیٹے کے آنے کی خوشی میں۔"

"تو بھی تو جاگ رہا ہے۔"

"ہاں۔"

"چیزیں گن رہی ہوگی۔ جمالا یہ لائے گا' وہ لائے گا۔ گھر بھر دے گا تیرا۔"

"گھر تو اس کے آنے سے ہی بھر جائے گا۔ صورت کو ترس گئی ہوں۔ پورے تین سال ہو گئے اسے دیکھے۔"

"اب جی بھر کے دیکھ لینا بھلی لوگ' پورے تین ماہ کی رخصت پہ آ رہا ہے۔"

"چٹکی بجاتے گزر جائیں گے تین ماہ۔ میرا تو جی چاہتا ہے اب اسے واپس ہی نہ جانے دوں۔ بہتیری کمائی کر لی ہے۔ ان تین سالوں میں خوب جمع کر لیا ہوگا اس نے۔ ان پیسوں سے یہاں چھوٹا موٹا کاروبار کر لے گا۔"

"ہُنہ۔ یہ تُو کہہ رہی ہے راجاں۔"

"ہاں۔ میں ہی کہہ رہی ہوں۔"

"اور تیرے خرچے کہاں سے پورے ہوں گے؟"

"خرچے کیا ہیں؟"

"یہ جو تین کی تین برابر کی ہو گئی ہیں۔ انھیں بیاہنا نہیں ہے۔ اب تو عام شام طریقے سے انہیں بیاہنا بھی نہیں تو نے۔ سب کے دماغ عرش پر پہنچ گئے ہیں۔ اب تو تیری بیٹیاں لمبے چوڑے جہیز کی سناؤنیاں ڈالتی رہتی ہیں۔"

"ہاں یہ یہ خرچے تو ہیں ہی۔ لوگوں کو بھی پتا ہے۔ بیٹا باہر گیا ہوا ہے۔ بڑا جہیز ملے گا اس گھر سے' ایسے ہی تو رشتے نہیں پوچھ رہے لوگ۔ اور جو زہراں کے سسرال والے ہیں نا۔ وہ تو کئی فرمائشیں ہولے ہولے کانوں میں ڈال جاتے ہیں۔"

"پھر تو کیسے کہہ رہی ہے کہ جالے کو واپس نہیں جانے دے گی۔"

"اے ہے جمالا کیوں کہتے ہو۔"

"تو کیا کہوں؟"

"اب خیر سے اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ اتنا پیسہ کما رہا ہے۔ نام تو ٹھیک سے لیا کرو۔ جمال کہا کرو۔ ہاں ہنس کیوں رہے ہو۔"

"تمھاری باتوں پر۔ اے بھاگوان۔ میں ابھی تک کمالا ہوں۔ کمال نہیں کہا کسی نے کبھی۔ جمالے سے دگنی عمر ہے میری۔ تو پھر۔۔۔۔"

"پھر کیا۔ تمھاری اور بات ہے۔ اس کی اور۔" "وہ کیسے؟"

"تو گاؤں میں رہتا ہے۔ اور کرایے کی دیگین چلاتا ہے۔" راجاں نے شوخ نگاہوں سے شوہر کو دیکھ کر کہا۔ کمال مسکراتے ہوئے اسے تکنے لگا۔ اور کسی دن راجاں ایسی بات کہتی تو شاید وہ اسے لتاڑ کے رکھ دیتا۔ بہت جلد غصے میں آجایا کرتا تھا وہ لیکن آج اسے غصہ نہیں آیا۔ راجاں کی شوخی طنز نہیں لگی۔ خوش ہو گیا وہ اس کی باتوں سے۔ بستر میں اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تو خود تو اسے جمالے کے نام سے پکارتی ہے۔ مجھے کیوں کہتی ہے جمال کہا کروں۔"

"اسے ہے۔ گھر میں یہ اس کے پیار کا نام ہے۔ تو تو باہر بھی اسے جمالا ہی کہتا ہے۔ لوگوں کے سامنے جمال کہا کر۔ ہاں۔ اب وہ کوئی گاؤں کا جاہل گنوار چھوکرا تو نہیں ہے نا۔ پچھلے مہینے جو تصویر بھیجی کیسا صاحب بہادر لگتا ہے۔"

"ہاں، بہت بڑھیا سوٹ پہنا ہوا ہے اور گلے میں کالے دھاگے والا وہ تعویذ بھی نہیں، جو تو نے اسے پہنایا تھا۔"

راجاں ہنس کر فخر سے بولی۔ "کالے دھاگے کی جگہ سونے کی زنجیر پہن رکھی ہے اس نے۔ تعویذ اب اس نے اس زنجیر میں سونے کی ڈبیا میں ڈال کر پہن رکھا ہے۔"

"اتار دیا ہوگا۔" کمالے نے راجاں کو چھیڑا۔ "اب وہ کوئی پینڈو تو ہے نہیں۔ ایسا صاحب بہادر بنا ہوا ہے۔ تعویذ کہاں پہننا پسند کرے گا۔"

راجاں کے کسی جواب سے پہلے ہی برابر والی کوٹھری سے لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز آئی۔ کمالا بولا "تو وہ مرجانیاں بھی جاگ اٹھی ہیں اتنی سویرے۔"

"ان کا بھائی آرہا ہے۔ بہت خوش ہیں۔ صبح صبح اٹھ کر سارے گھر کی پھر سے صفائی کریں گی۔ شاداں نے تو کہا تھا اماں سویرے سویرے جگا دینا۔ وہ خود ہی اٹھ گئیں۔"

"صفائی تو اتنے دنوں سے کر رہی ہوں۔ اب کیا کرنا ہے۔ پہلا کمرہ جمالے کے لیے ٹھیک ٹھاک کر دیا ہے۔ یہ اچھا ہی کیا۔"

"الگ کمرہ تو اسے چاہیئے ہی۔ اس کے ملنے ملانے والے دوست یار آتے جاتے ہی رہیں گے۔"

"اس دفعہ شہر میں گھر خرید ہی لیں گے۔"

"خریدے گا کہاں۔ وہ تو خود اپنی مرضی کا بنوائے گا۔ بہنوں کے خطوں میں وہ لکھتا رہتا ہے بھئی رہنا اس نے ہے اس کے بیوی بچوں نے۔ بنائے گا اپنی مرضی ہی کا۔"

"بیوی بچے بھی ہو گئے؟"

"ہوں گے نا کبھی تو۔ اے سنو۔"

"کیا؟"

"اس دفعہ جمالے کی منگنی بھی کرنا ہے۔ اس نے زہراں کو چٹھی لکھی تھی کہ بڑی خوبصورت ہیرے کے نگینے والی انگوٹھی لائے گا۔"

"اچھا؟"

"ہاں۔"

"ایسی باتیں مجھے تو بتاتے نہیں تم لوگ۔"

"بتاتے تو ہیں۔ تم سن کر بھول جاتے ہو۔"

"انگوٹھی کا ذکر تو کیا تھا تم نے۔ یہ کب کہا تھا کہ ہیرے کے نگینے والی ہے اور یہ بھی نہیں بتایا کہ کس کے لیے لائے گا انگوٹھی۔ میں تو سمجھا تھا کہ تمہارے یا زہراں کے لیے۔"

"زہراں کے لیے پچھلی دفعہ پانچ تولے سونا نہیں لایا تھا۔ ایک لاکٹ اور بُندے بھی اسی کے لیے تھے۔ یہ انگوٹھی۔ تو وہ۔ بلّو۔ کو جانتے ہو نا۔"

"بلّو!"

"لے اپنی آپا عاشاں کی چھوٹی بیٹی۔"

"ہوں تو یہ بات ہے۔"

"جمالا اپنے خطوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بلّو ہے بھی تو بہت پیاری۔ بالکل مانوسی ہے۔ بھولی بھالی رنج کے سوہنی۔ میں بھی اسے ہی بہو بناؤں گی۔"

"آپا عاشاں سے بات ہوئی کبھی؟"

"کروں گی۔ ویسے انہیں اعتراض بھی کیا ہوگا۔ اتنا سوہنا۔ نیک شریف اور اتنی کمائی کرنے والا لڑکا کہاں ملے گا انہیں۔ لوگوں کی نظریں تو جمالے پر لگی ہیں۔ دو چار رشتے تو آ بھی چکے ہیں۔ لیکن میں بلّو کے سوا کسی کو......"

"اچھا اچھا۔ جو جی چاہے کرنا۔ اب ذرا اٹھ جاؤ۔ ایک پیالی چائے تو بنا لاؤ۔ بہت دیر سے جاگ رہا ہوں۔ چائے کی طلب ہو رہی ہے۔"

"ویگن کیا چلانے لگے ہو۔ چائے کے رسیا بن گئے ہو۔" راجاں اٹھتے ہوئے بولی۔

"ویگن چلانے کا تو اب مزہ آئے گا نئی نکور ویگن اور اوپر سے اپنی۔ ذاتی۔ یہ سارے دن کی ڈیوٹی تو نہ ہوگی۔ پرائی چیز پرائی ہوتی ہے۔"

"بیٹے نے تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دی۔"

"بیٹا ہے۔ اپنا۔ پیارا دلارا۔ او جگ جگ جیے۔"

"اچھا بس اب اٹھ جاؤ تم بھی۔ میں چائے لاتی ہوں۔ آج تو تم نے شہر جلدی جانا ہوگا۔"

"نہیں، وقت ہی پہ جاؤں گا۔"

"جمالے کو اپنی ویگن میں نہیں لاؤ گے؟"

"لاؤں گا۔ مالک سے میں نے بات کر لی ہے۔ صبح کا پھیرا لے کر جاؤں گا۔ واپسی پہ اپنے جمالے ہی کو تو لانا ہے۔ ویسے اس کی فلائٹ کا پکا پتا نہیں ہے۔"

"کراچی تو کل آ گیا ہوگا۔ اب آج جس جہاز سے جگہ مل آ جائے گا۔ ہوائی اڈے پہ انتظار تو کریگا ہی۔"

"ہاں کرے گا۔ چاہے صبح کے جہاز سے آئے۔ چاہے دس بجے کے۔"

"ایک جہاز صبح چھ بجے آتا ہے نا۔"

"ہاں میں نے سب پتا کر لیا ہوا ہے۔ دس بجے سے پہلے میں ہوائی اڈے پہ پہنچ جاؤں گا۔ تو فکر نہ کر، تیرے جمالے کو گاؤں تک آنے میں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

"سامان بھی تو ہوگا ساتھ۔"

"ہاں تین سال میں چھوٹا موٹا سامان تو جمع کیا ہی ہوگا۔ دو تین سوٹ کیس تو ہوں گے ہی۔ میرے لیے کمبل بھی لایا ہوگا۔ اور۔"

"ٹی وی۔ فریج اور دوسری بڑی چیزیں۔"

"وہ تو ساتھ تھوڑا ہی ہوں گی۔ بعد میں آئیں گی۔ ویگن کے پہنچنے میں شاید مہینہ دو لگ جائیں۔"

"اچھا۔"

"تو اور کیا ساری چیزیں ہوائی جہاز میں رکھ کر لاتا۔"

"اچھا میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ اب تو پو پھٹ رہی ہے۔ اٹھ کے ہاتھ منہ دھو لو۔"

راجاں نے چادر کی بکل ماری۔ پاؤں میں نائیلون کے چپل پہنے اور بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ چائے بنانے کے لیے اس کو باہر جانا تھا۔ صحن کے دوسرے سرے پر نیچی چھت والا کچا پکا برآمدہ سا تھا۔ وہیں ایک کونے میں مٹی کے تیل کا چولہا اور کھانے پینے کے برتن رکھے رہتے تھے۔ چائے کی پڑیا، چینی کا ڈبا بھی وہیں تھا۔ دودھ کی دیگچی وہ کمرے میں رات کو لے آئی تھی باہر بلیوں کتوں کا ڈر تھا۔ بیرونی چھوٹی سی مٹی کی دیوار سے اندر کود آتے تھے۔

راجاں اور کمالے کا تعلق کشمیری خاندان سے تھا۔ ابھی تک خون میں ملاوٹ نہیں ہوئی تھی۔ اسی لیے سارا خاندان گورا چٹا اور خوبصورت تھا۔ جانے کتنی صدیوں سے وہ یہاں رہ رہے تھے۔ کنبے کے بہت سے لوگ اور بھی تھے جو یہیں رہتے تھے۔ برسوں سے ایک خاندان کی طرح رہتے چلے آ رہے تھے۔ یہاں ان لوگوں کی زمینداری نہیں تھی۔ کچے پکے مکان ہی اپنے تھے۔ جس کو جو کام ملتا تھا کر لیتا تھا۔ کچھ لوگ تو زمینداروں کے مزارعے بن گئے تھے۔ کچھ محنت مزدوری کرتے تھے۔ راج گیری کا کام اپنایا تھا۔ کچھ لوگ روزگار کی تلاش میں شہروں کا رخ کر چکے تھے کہ گاؤں میں اب پوری نہ پڑتی تھی۔ پڑھے لکھے نوجوان تو پکی نوکریاں بھی کر رہے تھے۔ شہر یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس لیے دو اڑھائی میل سائیکلوں پر آنا جانا مشکل نہ تھا اور جب سے سوزوکیاں چلنے لگی تھیں۔ ان لوگوں کو شہر آنے جانے میں بڑی سہولت ہو گئی تھی۔ اب تو لڑکے چھوڑ لڑکیاں بھی گاؤں کے مڈل سکول سے آٹھ جماعتیں پڑھ کر شہر کے اسکولوں میں داخلہ لینے لگی تھیں چوہدریوں کی بیٹیاں تو کالجوں میں بھی پڑھ رہی تھیں۔

کمالا گاؤں کے دوسرے ہم عمر لوگوں کی طرح محنت مزدوری کر کے اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ پہلے گاؤں ہی میں راج گیری کی پھر شہر جانے لگا۔ وہاں کبھی ایک کام کیا کبھی دوسرا۔ اتنا کما لیتا کہ بال بچوں

کا پیٹ بھر لیتا۔ گاؤں کی رہائش سادہ ہوتی تھی۔ تصنع بناوٹ ابھی وہاں تک نہیں پہنچی تھی۔ نہ ہی معیارِ زندگی بلند کرنے کا خیال آیا تھا۔ گزر بسر ہو جاتی تھی لیکن جب اوپر تلے تین بیٹیاں آگئیں اور جمالے نے اسکول جانا شروع کیا تو کمائی کم پڑنے لگی۔ کمالا خود دو تین جماعتیں ہی پڑھ سکا تھا لیکن اسے شوق تھا کہ اپنے ایک اکلوتے بیٹے کو خوب پڑھائے۔ پڑھ لکھ کر وہ بڑا آدمی بنے۔ شہری بابوؤں کو دیکھ دیکھ کر اس کی خواہش بڑی تنومند ہوتی جا رہی تھی۔

جن دنوں جمالے کو اس نے شہر کے ہائی اسکول میں داخل کروایا۔ انھی دنوں اس نے خود ڈرائیونگ سیکھ لی۔ اس نے ایک بزنس مین کے ہاں گاڑی چلانے کی نوکری کر لی۔ پھر نوکریاں بھی بدلتا رہا۔ کبھی کہیں ڈرائیوری کی کبھی کہیں۔ گزر بسر کے لیے پیسے کما ہی لیتا تھا۔

جمالے نے دس جماعتیں پاس کر لیں۔ تو کمالے نے اسے کالج میں داخل کروا دیا۔ جمالا ذہین نہیں تھا۔ بس واجبی واجبی پوزیشن لے کر ہر سال پاس ہو جاتا تھا۔ کالج میں داخلہ لینے کی اسے قطعاً خواہش نہ تھی

"کیا کروں گا ابا اتنا پڑھ کر؟" وہ باپ سے کہتا۔

"میرا خواب پورا کرے گا بیٹے۔"

"یعنی بہت بڑا آدمی بن جاؤں گا۔"

"تو اور۔"

"نہیں ابا۔"

"تو پھر کیا کرنا ہے۔ میں جو اتنی محنت سے پیسہ کما کر تجھ پر خرچ کر رہا ہوں۔ اس کا کچھ نہیں بنے گا۔"

"ابا، بی اے، ایم اے کر کے کون سی بڑی نوکری مل جائے گی مجھے۔ جتنی تنخواہ ملے گی نا، اتنا تو تُو گاڑی سوزوکی چلا کے کما لیتا ہے۔"

"تو کیا تُو بھی سوزوکی چلائے گا کرائے کی؟"

"نہیں ابا۔ میں سوچ رہا ہوں، باہر چلا جاؤں۔"

"باہر؟"

"ہاں ابا۔ گاؤں کے جتنے بندے بھی باہر گئے ہوئے ہیں۔ دیکھا ہے ان کی حالت کس طرح بدل گئی ہے۔ ہزاروں روپے مہینے میں کماتے ہیں۔ کیا ٹھاٹ باٹ ہیں ان کے۔"

کمالے کی بات دل کو لگی۔ لیکن پھر بھی بولا۔ "تو بارہ جماعتیں پاس کر لے پہلے۔ پھر جانا باہر۔"

"جماعتیں پاس کرنے سے باہر کچھ زیادہ نہیں ملتا۔"

"تو پھر۔"

"ابا باہر جانے کے لیے کوئی ہنر سیکھنا چاہیئے۔ کوئی ایسا کورس کرنا چاہیئے۔ جو وہاں کام آئے۔"

"تو کیا سوچا ہے تُو نے۔"

"میرا ایک دوست بھی یہی سوچ رہا ہے۔ اس نے پتا کروایا ہے باہر موٹر مکینک یا ائیر کنڈیشنگ کا جس نے کورس کیا ہو۔ بہت اچھی نوکری ملتی ہے اسے۔"

"تو پھر؟"

"میں بھی ائیر کنڈیشننگ کا کورس کر لوں ابا۔"

"تیری مرضی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"لیکن بیٹے تو بارھویں جماعت میں پہنچ گیا ہے۔ میرا تو دل ہے کہ تو امتحان بھی دے ساتھ ساتھ اور کورس بھی کر لے۔"

جمالا، ماں باپ کا بڑا فرماں بردار بیٹا تھا۔ راجاں کی بھی یہی مرضی تھی کہ وہ کم از کم بارہ جماعتیں پاس کر لے۔ پڑھی لکھی وہ خود بھی نہیں تھی لیکن پڑھائی لکھائی کی اہمیت جانتی تھی۔ جمال نے ماں باپ کی بات مان لی۔ امتحان کی تیاری بھی کی اور ائیر کنڈیشننگ کا کورس بھی کرنے لگا۔

بیٹیاں کسی نئی چیز، کسی نئے کپڑے کی فرمائش کرتیں تو راجاں کبھی پیار سے اور کبھی ڈانٹ کر ان کو چپ کرا دیتی۔

"تمہیں پتا نہیں جمال کے لیے کتنا پیسہ چاہیئے۔ اسے باہر بھیجنا ہے۔ اس کے لیے تو ابھی چار پیسے بھی

جمع نہیں ہوئے۔ ابھی تو اس کی پڑھائی پر ہی خرچہ اٹھ رہا ہے۔ تم ذرا حوصلے اور صبر سے کام لو۔ ایک بار باہر چلا جائے۔ پھر تمہارے لیے ہی بھیجے گا چیزیں۔ عیش کرو گی۔ اب چپ چاپ دیکھتی رہو۔ زیادہ گزر گئی ہے تھوڑی سی رہ گئی ہے۔ اللہ سن لے گا ہماری فکر نہ کرو۔ ابھی گزارا کر گزارا۔"

زہراں سمجھ دار تھی۔ لیکن چھمّو اور شادو بڑبڑ کرتی رہتیں۔ وہ دونوں سکول پڑھتی تھیں۔ دوسری لڑکیوں کی دیکھا دیکھی۔ اچھے اچھے کپڑوں کا انہیں بھی شوق تھا۔ رنگ برنگے کلپ، چوڑیاں اور سنہری پھندنوں والے پراندے انہیں بھی اچھے لگتے تھے۔ لیکن جب بھی وہ فرمائش کرتیں۔ اماں انھیں جمال کی باہر کی کمائی پر ٹال دیتیں۔

جمال کو باہر بھیجنے کے لیے کمالے نے بڑے پاپڑ بیلے۔ دو ایک بوگس کمپنیوں میں پیسہ بھی پھنسایا۔ خون پسینے کی کمائی برباد ہوئی۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ راجاں نے بھی دھری دھرائی پونجی بیٹے پر نچھاور کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ سونے کے بالے اور چاندی کے کڑے بھی تھے اس کے پاس، ویزا خریدنے کے لیے اس نے یہ بھی بیچ ڈالے۔

گاؤں کے نمبردار کا بیٹا حنیف بھی مسقط میں تھا۔ اس دفعہ وہ اپنے ساتھ کچھ ویزے بھی لایا تو جمال کا کام بن گیا۔ منہ مانگی قیمت دے کر اس نے ویزا حاصل کر لیا۔

ویزا حاصل کر کے سب کو خوشی بھی ہوئی اور کوفت بھی۔

"شکر کر شکر" کمالے نے اسے سمجھایا۔ "اپنے نمبردار کا بیٹا تھا۔ ویزا مل گیا۔ ورنہ منہ تکتے رہتے لوگوں کا۔ کمپنی والوں کی ٹھگ بازی تو دیکھ ہی چکی ہے تو۔"

"ہاں اماں۔ پیسے تو دینے پڑتے ہیں۔ کچھ زیادہ ہی لے لیے ہیں حنیف نے۔ لیکن میرے لیے سہولت ہو گئی ہے۔ پردیس میں پہلی بار جاؤں گا۔ حنیف ہی رہبری کرے گا میری۔ بلکہ وہ تو کہہ رہا ہے کہ جب تک میرا صحیح ٹھکانا نہیں بن جائے گا۔ وہ مجھے اپنے پاس ہی رکھے گا اور نوکری بھی خوب تگڑی سی تنخواہ والی دلائے گا۔"

"اچھا" راجاں کی باچھیں کھل گئیں۔

زہراں، چھمّو اور شادو تو خوشی سے جیسے پاگل ہو گئیں۔

"بھائی ڈھیر سارے پیسے ہر مہینے بھیجا کرے گا۔"

"جاپانی ریشمی سوٹ ہم بھی پہنا کریں گے۔ جیسے حنیف کی بہنیں پہنتی ہیں۔"

"میں تو اپنے لیے کلائی کی گھڑی منگواؤں گی سب سے پہلے۔"

"چل ہٹ سب سے پہلے بھائی کو کہیں گے کیسٹوں والا ریڈیو بھیجے۔ خوب گانے سنا کریں گے۔"

"ٹی وی، فریج نہیں چاہیے؟"

"وہ تو اماں کے کھاتے میں آئے گا۔"

"ہائے اللہ کتنا مزہ آئے گا۔ ہم بھی امیر ہو جائیں گے۔"

"گاؤں میں تو رہنا ہی نہیں ہم نے۔ شہر میں رہیں گے۔ خوب ٹھاٹ باٹ سے۔"

"پگلی۔ ٹھاٹ باٹ گاؤں میں زیادہ ہوں گے۔ شہر میں تو سارے ہی لوگوں کے ٹھاٹ باٹ ہوتے ہیں۔ یہاں مزہ آئے گا ٹھاٹ باٹ سے رہنے کا۔ لوگ ہماری چیزیں تجسس اور شوق سے دیکھنے آیا کریں گے۔ ارد گرد عام سے ہی لوگ تو رہتے ہیں۔"

"نہ بھئی۔ ہم تو شہر میں رہیں گے۔ بھائی بھی شہر ہی میں رہنا چاہتا ہے۔ اسے تو گاؤں پسند ہی نہیں شروع سے۔"

"ہاں۔ اسے تو شہر ہی پسند ہے۔"

"شہر میں بڑے مزے ہیں۔ گاؤں میں کیا رکھا ہے۔ گاؤں میں تو مزہ زمینوں والوں کا ہے پتا نہیں ہمارے پردادا لکڑدادا گاؤں ہی میں کیوں آ بسے تھے کسی شہر کا رخ کیوں نہ کیا۔ گاؤں ہی میں آئے تھے تو کوئی مربعے دو مربعے اراضی بھی قبضے میں کی ہوتی۔"

"پرانی باتیں چھوڑو۔ اب ہمارا بھائی باہر جا رہا ہے۔ ساری کسریں نکل جائیں گی۔"

"وہ حمیداں ہے نا۔ توبہ توبہ دو سال پہلے کیا حال تھا ان کا۔ کھانے کو روٹی نہ تھی۔ سو سو ٹاکیاں لگی ہوئی تھیں کپڑوں میں۔"

"دو بیٹے باہر گئے ہوئے ہیں"

"حلیہ ہی بدل گیا ہے"

"بھئی خدا کی دین ہے۔ ہمارا بھی حلیہ بدل جائے گا"

"لو اب ہم ایسے ہی فقیر تو نہیں ہیں"

"پھر بھی۔ دیکھنا سال دو سال میں ہمارا گھر بھی بھر جائے گا"

"بالکل۔ بالکل"

جمال حنیف کے ساتھ باہر چلا گیا۔ کمالا اسے کراچی تک چھوڑنے گیا۔ راجاں نے ہزاروں دعاؤں کے سائے میں اسے رخصت کیا۔ بچھڑتے سمے سب گھر والوں اور خود جمالے کا جی بھی تھوڑا ہو رہا تھا لیکن مستقبل کی چکا چوند اور خوشیاں دل بڑھا رہی تھیں۔ اماں سے، بہنوں سے اور ابا سے خط لکھنے کا وعدہ کر کے ہر مہینے باقاعدگی سے پیسے بھیجنے کا کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ دن ہفتے اور مہینے گزرتے چلے گئے۔ جمال باقاعدگی سے خط اور معقول رقم گھر بھیجنے لگا۔ ایک سال بعد وہ ایک ماہ کی چھٹی پر گھر آیا تو ڈھیروں چیزیں لے کر آیا۔

ماں باپ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ بہنوں کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ جمال ہر ایک کے لیے قیمتی کپڑے، گھڑیاں، جوتے، سوئٹیریں لایا تھا۔ پانچ تولے سونا، بندوں اور لاکٹ کے علاوہ زہراں کے لیے لایا تھا۔ زہراں کا رشتہ بھی اس نے اس دفعہ طے کر دیا تھا۔ شادی اگلی دفعہ آنے پر ڈال دی تھی۔

اس دفعہ وہ تین سال بعد آ رہا تھا۔ ایک دفعہ تو چھٹی نہ ملی تھی۔ دوسری دفعہ اس نے خود ہی ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

کمالے نے بھی یہی لکھا تھا "بار بار آنے سے خواہ مخواہ کرائے پر ہزاروں روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ یہ بچت کرو تو کام ہی آئے گی"

جمال نے بھی بچت ہی کا سوچا تھا۔ اس نے بھی یہی لکھا۔ "ابا، جی تو کرتا ہے آپ لوگوں

سے ہر سال آ کر ملا کروں۔ لیکن میں نے بھی یہی سوچا ہے کہ ہزاروں روپے آنے جانے میں جو خرچ ہو جاتا ہے بچایا جائے۔ کیونکہ ہمیں پیسے پیسے کی ضرورت ہے۔ مجھے سب ضرورتوں کا بخوبی احساس ہے"

راجاں کا دل بیٹے کو دیکھنے کے لیے تڑپتا تھا۔ ماں تھی نا۔ ایک سال جب چھٹی نہ ملی تو دوسرے سال اس نے زہراں سے خط لکھوایا۔ خیر خیریت کے بعد لکھوایا "بیٹے اس دفعہ ضرور آ کر مل جاؤ۔ کمانے کو عمر پڑی ہے۔ ضرورتیں پوری ہوتی رہیں گی۔ بس تم چھٹی لے کر آجاؤ"

جمال کا دل بھی مچلا تھا لیکن اس نے ماں کو حوصلہ دلایا ہمت بندھائی۔ بہت پیار سے خط لکھا۔

"اماں، جی تو میرا بھی چاہتا ہے۔ پردیس میں گھر ضرورت سے زیادہ ہی یاد آتا ہے، لیکن مجبوریوں کا بھی احساس ہے، ضرورتوں کو بھی جانتا ہوں۔ میری تین بہنیں ہیں۔ ان کو بیاہنا ہے۔ اس کے لیے ڈھیر سارا پیسہ چاہیئے۔ پھر تمہیں یہ بھی پتا ہے کہ میری خواہش ہے شہر میں گھر بنانے کی۔ اس کے لیے بھی جانتی ہو کتنا پیسہ چاہیئے، میں یہاں بالکل فضول خرچی نہیں کرتا، بہت سنبھل کر خرچ کر کے پیسہ پیسہ جوڑ رہا ہوں۔ اگلے سال آؤں گا تو بہت سارا پیسہ لاؤں گا۔ تیری سب بیٹیوں کے بیاہ کا خرچہ نکال کر زمین بھی خرید لوں گا۔ بس تو دعا کر، یہ وقت خیریت سے گزرے۔ ہاں تھوڑی بہت چیزیں تو میں ہر آنے جانے والے کے ہاتھ بھیج دیتا ہوں۔ اگلی بار آیا تو ابا کے لیے ویگن بھی لے کر آؤں گا۔ یہ میری دلی خواہش ہے کہ ابا نے اگر کام کرنا ہی ہے تو اپنی ویگن چلائے بہت دیر چلالی اس نے کرائے کی ویگن۔"

جمال نے ماں اور بہنوں کی تسلی کے لیے ایسے ایسے کئی خط لکھے۔

یوں تیسرا سال بھی گزر گیا۔

اور اب آج وہ آ رہا تھا۔ پورے تین سال بعد۔ ڈھیروں چیزیں لے کر۔ لاکھوں روپے لیکر ان چیزوں کی سب کو خوشی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ کمالا، راجاں اور تینوں بہنیں جمال کی صورت دیکھنے کو تڑپ رہی تھیں۔ مال و دولت ثانوی چیز لگ رہا تھا۔ خوشی انہیں صرف اور صرف جمال

کے آنے کی تھی۔ جمال جسے دیکھے تین سال ہو گئے تھے۔ جس سے باتیں کیے اتنا عرصہ بیت گیا تھا جسے سینے سے لگائے اتنی مدت ہو گئی تھی۔

کمالا اور راجاں تو خاص طور پر جمالے کو دیکھنے اور اسے گلے سے لگا کر پیار کرنے کو تڑپ رہے تھے لمحہ لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ اسی لیے تو رات ٹھیک سے دونوں ہی سو نہ سکے تھے۔ اور معمول سے کہیں پہلے جاگ گئے تھے۔ جب سے جاگے تھے، جمالے ہی کی باتیں کر رہے تھے۔ جمالے ہی کی باتیں کر رہے تھے۔

کمالے نے صحن کے نل تلے ہاتھ منہ دھویا۔

راجاں چائے بنانے لگی۔

پیالہ چائے سے بھر کر وہ اٹھی۔ کمالا اندر چلا گیا تھا۔ وہ چائے لیے اندر آ گئی۔

"لو" اس نے پیالہ کمالے کو پکڑا دیا۔

ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کمالا بولا۔ "جمالا چائے بھی ضرور لائے گا۔ پچھلی دفعہ لایا تھا نا، اس چائے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ تو بھی تو حاتم طائی کی بیٹی بن جاتی ہے۔ چائے بھی کوئی بانٹنے کی چیز تھی۔ دو پیکٹ بھی نہ رکھے۔ سارے بھائی بہنوں میں بانٹ دیے۔"

راجاں مسکرا کر بولی: "اس دفعہ چھپا کے رکھ لینا تم ہی۔"

"تو اور کیا میں تجھے بانٹنے دوں گا۔"

"اچھا بھئی اچھا۔"

"سگریٹ اور چائے دونوں کو کوئی ہاتھ تو لگا کر دیکھے۔ یہ دونوں چیزیں میرا بیٹا صرف میرے لیے لائے گا۔"

راجاں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "اچھا جی تمہارے لیے ہی سہی۔ یہ تو جب چیزیں گی دیکھیں گے۔ پہلے یہ بتاؤ کتنے بجے جانا ہے آج۔"

"جتنے بجے روز جاتا ہوں۔"

"اور جو جمال صبح کے ہوائی جہاز سے پہنچ گیا ہوا تو۔"

"تو۔ میرے خیال میں ائیر پورٹ پر ہی میرا انتظار کرے گا۔"

"تم نے اسے لکھا تھا۔"

"نہیں تو۔"

"پھر تو چاہیئے تھا سویرے سویرے ہی ائیر پورٹ پہنچ جاتے۔ کیا خبر وہ صبح کے جہاز سے آ جائے۔"

"کوئی بات نہیں۔ آ بھی گیا تو وہیں رہے گا۔ اتنی سویرے سویرے یہاں تھوڑے ہی آ سکے گا۔ میں دس بجے سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گا۔ دوپہر کے کھانے تک اسے لے آؤں گا۔ ہاں آج ذرا مزے مزے کی چیزیں پکانا۔"

"شوربے والی مرغی اور میٹھے چاول میرے بیٹے کو بہت اچھے لگتے تھے۔ زہراں کھیر بھی بنائے گی۔"

"واہ وا۔ پھر تو ہمارے بھی مزے ہوں گے۔ بیٹے کی وجہ سے ہمیں بھی کچھ کھانے پینے کو ملے گا۔"

"آئے ہائے۔ روز تو بھوکے رہتے ہو نا۔ کبھی مرغی چاول نہیں کھائے۔ کھیر نہیں چکھی کبھی۔"

راجاں نے تمسخر سے کہا تو کمالا چائے کا آخری گھونٹ بھر کر پیالہ واپس کرتے ہوئے بولا:

"تمہیں چھیڑ رہا ہوں بھاگوان۔ بیٹے کے آنے کی خوشی میں جی کرتا ہے تجھے چھیڑتا ہی جاؤں۔"

"شوخے ہو رہے ہو۔" وہ مسکرائی۔

"خوشی سنبھالی نہیں جا رہی نا۔ اپنا جمالا آ رہا ہے۔ اپنا بیٹا۔ سچ سچ کہوں۔ جی میرا بھی نہیں چاہتا کہ اب وہ پردیس جائے۔ صورت دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔ تو تو اپنی اداسی کا کھل کر اظہار کر لیتی ہے نا۔ میں نے تو کبھی ایسا بھی نہیں کیا۔ تمہیں حوصلہ دلانے ہی کو یوں ظاہر کرتا رہا کہ جیسے مجھے اس سے بچھڑنے کا کوئی غم کوئی فکر نہیں۔"

راجاں نے اک نگاہ کمالے پر ڈالی اور پھر گہری سانس لے کر بولی۔ "تو نے کبھی اظہار نہیں کیا تو کیا میں سمجھتی نہیں کہ تجھے جمالا کتنا یاد آتا ہے۔ تیرے سینے میں اس کے لیے پیار کس طرح مچلتا

ہے۔ میں سب کچھ جانتی ہوں سمجھتی ہوں۔ جب سے اس کے آنے کا خط آیا ہے تیری خوشی چھپائے نہیں چھپتی۔ اس دن سے نہ تو تجھ پر چڑچڑا پن مسلّط ہوا ہے۔ نہ ہی تو لڑا جھگڑا ہے۔ تیری خوشی بھلا مجھ سے چھپی ہے۔"

کمالے نے مسکرا کر راجاں کو دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔" یہ اولاد بھی کیا چیز ہوتی ہے راجاں۔ پاس ہوں تو پتا نہیں چلتا کہ یہ ہمیں کتنے پیارے کتنے عزیز ہیں۔ دور چلے جائیں تو احساس ہوتا ہے کہ یہ اپنا ہی گوشت پوست، اپنا ہی خون ہیں۔ اب جمالے ہی کو دیکھو۔ یہاں تھا۔ تو کبھی اتنا پیار نہ آیا تھا اس پر۔ بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ ہی کرتا تھا۔ لیکن دور چلا گیا ہے۔ تو جی کرتا ہے، اڑ کر آ جائے سینے سے لپٹ جائے۔ منہ سر چومتا ہی چلا جاؤں اس کا۔"

راجاں مسکرا کر بولی" بس کرو اب۔ تیار ہو جاؤ۔ شہر جاتے بھی وقت لگے گا۔ آج تم پھیرا کچھ جلدی ہی لے جاتے تو اچھا تھا میرے بیٹے کو انتظار کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔"

"پھیرا تو وقت سے پہلے نہیں لے جا سکتا" کمالا بولا۔" اسی لیے تو جلدی شہر جانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں ایئر پورٹ پہنچنے کی جلدی ضرور کروں گا۔"

"ہائے ہائے ویگن کہیں تیز نہ چلانا" راجاں نے کہا تو کمالا مسکرا کر بولا۔

"چل جا کے ناشتا بنا۔ میں تیار ہوتا ہوں۔"

راجاں کمرے سے باہر آ گئی۔ تینوں بیٹیاں اٹھ آئی تھیں۔ زہراں جمالے کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔ چھمّو نیا چارخانی کھیس چارپائی پر ڈال رہی تھی اور شادو کچے صحن میں لگے گلاب کے پودوں سے تازہ پھول اتار کر گلاس میں سجا رہی تھی۔ تینوں بہنیں مسلسل بولے جا رہی تھیں۔ راجاں ناشتا تیار کرنے لگی۔ پراٹھا بنایا، انڈا تلا اور تیز سی چائے بنائی۔ کمالا تیار ہو کر ادھر ہی آ گیا۔

"ابا" وہ بولی۔

"ہاں"

"تمہاری یہ سوئیٹر اب پرانی ہو گئی ہے"

"تو کیا ہوا۔ آج ہی نئی آ جائے گی"

"ہاں بھائی ضرور لے کے آئے گا"

"میں نے اسے چمڑے والی جیکٹ لانے کے لیے لکھا ہے۔ سوئیٹر کا تین سالوں میں یہ حلیہ نکل آیا ہے۔ جیکٹ کافی سال چلتی ہے۔ بڑھیا سی جیکٹ لائے گا میرا بیٹا۔ دیکھنا کیسی سجے گی مجھ پر۔"

راجاں ہنس کر بولی" نیا جوڑا لائے گا نئی جیکٹ لائے گا۔ دولہا بن جائے گا تیرا ابا چھمّو"

"تو کیوں جلتی ہے۔ تیرے لیے تو مجھ سے زیادہ چیزیں آئیں گی۔ کیا خبر سونے کی چوڑیاں کلائیوں میں بھر دے۔ ریشمی جوڑے، بوسکی کی فینسی والی چادر۔"

"اچھا اچھا اب بس بھی کرو۔ ناشتا کرو ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ چھمّو لے رکھ دے چوکی پر چیزیں"

"اچھا اماں" چھمّو نے پراٹھے والا چھابہ اور انڈے والی پلیٹ باپ کے سامنے رکھ دی۔

کمالے نے ناشتا کیا۔ چائے کے دو کپ پیے۔ پھر صافی سے ہاتھ پونچھ کر کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

"ابا" چھمّو مسکرا کر بولی" یہ گھڑی بھی تو پرانی ہو گئی ہے۔ آپ کی نئی گھڑی بھی آ رہی ہے نا؟"

"نہیں بھئی۔ گھڑی یہی اچھی ہے۔ تین سال تو ہوئے ہیں کل۔ جانتی ہو کتنی قیمتی ہے یہ یہ تو تیس سال بھی خراب ہونے والی نہیں۔ جمالے کو میں نے گھڑی لانے کے لیے اسی لیے تو لکھا ہی نہیں۔ لے بھی آیا تو زہراں کی شادی۔۔۔۔"

"اب اٹھ بھی چکو" راجاں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا" ابھی تم نے شہر پہنچنا ہے وہاں سے ویگن کا پھیرا۔"

"سب جانتا ہوں۔ تو کیوں پریشان ہو رہی ہے۔"

"اور جو جمال صبح کے جہاز سے آگیا ہوا تو وہ ہوائی اڈے پر انتظار میں پریشان نہیں ہو رہا ہو گا۔

"بھئی اب اس کا علاج میرے پاس تو نہیں ہے نا۔ میں چاہے جتنی بھی جلدی پہنچاؤں۔ ویگن کا پھیرا تو روز کے وقت پر ہی لگے گا۔ پھیرا لے کر جاؤں گا۔ پھر وہاں سے ایئر پورٹ جا سکوں گا۔ خیر۔ گھبرانے کی تو کوئی بات نہیں۔ جمالا تین چار گھنٹے وہیں انتظار کرے گا۔"

"ہمیں اس سے ملنے کی جلدی ہے تو اسے بھی ہو گی۔ پل پل گن گن کر گزار رہا ہو گا۔"

کمالا ہنس کر راجاں کو دیکھنے لگا۔ کتنی بے تاب تھی وہ بیٹے سے ملنے کو۔ بے تابی خود اسے بھی تھی لیکن اپنے کام اور وقت کا پتا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا۔ تو طلوعِ آفتاب سے پہلے ہی ایئر پورٹ پر جا پہنچتا۔

کمالا اٹھ کر اندر گیا۔ بٹوا لیے باہر آیا تو شادو کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔ "ابا آج شہر سے مٹھائی اور کیک ضرور لانا۔"

"اچھا پُتر لے آؤں گا۔ بھائی کی خاطریں کرنا ہیں نا۔"

"ہاں ابا جی کرنا ہے۔ ڈھیر ساری چیزیں بھائی کے کھانے پینے کو جمع کر لوں۔"

کمالے نے بٹوا جیب میں ڈالا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے راجاں پر نگاہ ڈالی "تو نے تو کچھ نہیں منگوانا شہر سے۔"

"کچھ نہیں۔ تو صرف میرا بیٹا لے آ۔" وہ مسکرا کر بولی۔

کمالا بولا۔ "وہ تو لاؤں گا ہی۔"

"جا بھی اب۔"

"جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔"

کمالا گلی میں نکل آیا۔ جان پہچان کی دو تین عورتیں گلی میں مل گئیں۔ جمالے کے آنے کی خبر انھیں بھی مل چکی تھی۔

"جمالا آج آرہا ہے؟" ایک نے پوچھا۔

"ہاں اسے ہی لینے جا رہا ہوں۔ اور سنو۔ جمالا نہیں کہا کرو میرے بیٹے کو۔ اس کا نام محمد جمال ہے"

عورتیں ایک دوسری کو کن انکھیوں سے تکتے ہوئے ہنس پڑیں۔ پاس پڑوس کے دو ایک مرد بھی گلی میں جاتے ہوئے ملے۔ کمالے نے خوشی خوشی انھیں بھی بتایا۔ "اپنا جمال آرہا ہے آج۔"

"ہاں سنا تھا۔ کس جہاز سے آرہا ہے؟" گلی کے نکڑ والے مکان میں رہنے والے نصر اللہ نے پوچھا

"پکا پتا نہیں۔ صبح کے جہاز سے آگیا ہے یا دس بجے پہنچے گا۔ میں ویگن کا پھیرا لے کر جا رہا ہوں۔ ادھر ہی سے ایئر پورٹ جاؤں گا۔"

"بڑے دنوں بعد آرہا ہے۔"

"پورے تین سال بعد۔"

"بہت خوش ہو۔"

"ظاہر ہے بھئی خوش تو ہوؤں گا ہی۔ اتنی مدت بعد بیٹا آرہا ہے۔ خوب کمائی کر رہا ہے وہ تو۔"

وہ دونوں باتیں کرتے کرتے کمالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

کمالا شہر پہنچا۔ اڈے پہ ویگن اپنے نمبر پہ کھڑی تھی۔ دو تین سواریاں بھی بیٹھ چکی تھیں۔ سواریاں بھرنے کے لیے ابھی اسے انتظار کرنا تھا۔

آج کمالے کو لاہور پہنچنے کی جتنی جلدی تھی۔ اڈے پہ اتنی ہی تاخیر ہو رہی تھی۔ وہ اس تاخیر پہ جھلا رہا تھا۔ پریشان بھی تھا۔ دو تین بار منیجر کے پاس گیا۔

"باؤ جی کیا ہے۔ آج ویگن کو کیوں روک رکھا ہے؟"

"کچھ ضروری کام ہے۔"

"لیکن میں نے لاہور جلدی پہنچنا ہے۔ میرا بیٹا آرہا ہے آج۔ میں نے واپسی کے لیے مالکوں سے ویگن کی بھی بات کر لی ہے۔"

"اچھا بھئی۔ ٹھیک ہے لیکن دس منٹ اور تمہیں یہاں ٹھہرنا ہی ہے۔ پندرہ بیس منٹ لیٹ ہو جاؤ گے نا۔ اس سے کیا فرق پڑے گا"

کیا فرق پڑے گا؟ یہ بات منیجر نہیں جانتا تھا ایک باپ جانتا تھا۔ جس کا بچھڑا بیٹا پورے تین سال کے بعد آ رہا ہے جوں جوں وقت قریب آ رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ گراں ہو رہا تھا

ویگن کو جانے کی اجازت ملی۔ کمالے نے سکھ کا سانس لیا۔ اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ کنڈیکٹر ابھی باہر ہی تھا کہ اس نے گاڑی چلا دی۔ وہ لپک کر دروازے سے لٹکا اور اندر بیٹھی سواریوں نے اسے تھام لیا۔

"بادشاہو" کنڈیکٹر نے کمالے سے کہا "کیوں جان لینے لگے تھے میری۔ اپنے بیٹے کی خوشی میں ہمیں پار کرنے لگے تھے۔"

"اس کا بیٹا آ رہا ہے؟" سواریوں میں سے ایک جاننے والے نے کہا۔

"ہاں جی" کمالا خوشی سے لہکتا ہوا بولا "پورے تین سال بعد آ رہا ہے۔ دس بجے سے پہلے میں نے ایئرپورٹ پہنچنا ہے"

"بھئی اس سپیڈ میں گاڑی آہستہ چلاؤ" پیچھے سے ایک سواری بولی "شہر سے نکل کر تیز چلا لینا"

"ہاں بادشاہو" کنڈیکٹر بولا "بڑا رش ہے یہاں"

"چپ چاپ بیٹھے رہو" کمالا اپنی دھن میں بولا "نیا گاڑی چلانے والا نہیں ہوں روز یہیں سے جاتا آتا ہوں"

"روز اتنی تیزیاں سے نہیں نکالتے بادشاہو۔ آج خاص ہی تیزی ہے رفتار میں"

"اوئے بک بک نہیں کر" کمالے نے ہنستے ہوئے کنڈیکٹر کو ڈانٹا "کہا نہیں میں نے کہ دس بجے سے پہلے لاہور پہنچنا ہے مجھے"

اس نے رفتار اور بڑھا دی۔ تو برابر والی سیٹ پر بیٹھا معمر آدمی بولا "لاہور تو تمہیں

دس بجے سے پہلے پہنچنا ہے اتنی تیزی میں کہیں ہم کو اوپر ہی نہ پہنچا دینا"

"نہیں بزرگو" کمالے نے گردن گھما کر اسے دیکھا "اناڑی ڈرائیور نہیں ہوں میں"

کمالے نے رفتار اور بڑھا دی۔ پھر یہ رفتار بڑھتی ہی گئی۔ دو ایک جگہ بریک لگانا پڑی تو پیچھے کی سواریاں اک دھچکے سے اگلی سیٹوں سے جا ٹکرائیں۔ لوگوں نے شور مچایا۔ کمالے نے ہنس کر ان پر نگاہ ڈالی۔

"کچھ نہیں ہوا۔ آپ لوگ تو خواہ مخواہ ہی شور مچا رہے ہیں"

وہ گاڑی بھگائے لے گیا۔ رفتار بڑھتی گئی۔

"اسے روکو جی"

"مار ڈالنے کا ارادہ ہے اس کا"

"خطرناک ہے اتنی تیزی"

"خدانخواستہ الٹ بھی سکتی ہے ویگن"

"آہستہ کرو"

"یہ کر کیا رہا ہے"

"گاڑی کنٹرول میں نہ رہی تو"

سواریاں اس کی خطرناک تیز رفتاری پر احتجاج کرتے ہوئے شور مچا رہی تھیں لیکن وہ اپنی دھن میں مست تھا۔ پندرہ بیس منٹ جو اڈے پر ضائع ہوئے تھے وہ کمالے نے راستے ہی میں برابر کرنا تھا۔ سڑک صاف ستھری اور دو رویہ تھی۔ اس لیے وہ پورے اعتماد سے ویگن اڑائے جا رہا تھا۔ گاڑیوں کو پیچھے چھوڑ رہا تھا۔ اوورٹیک کر رہا تھا۔ دو دو اوورٹیک کرتی گاڑیوں کو بھی اس نے غلط سائیڈ سے نکل کر پاس کیا۔ لوگوں کے شور کی اسے پرواہ نہ تھی۔

سیدھی صاف سڑک پر تو شاید اس کی تیز رفتاری خطرناک نہیں تھی لیکن اس نے تو اس سڑک پر بھی گاڑی کی یہی رفتار رکھی جہاں مرمت کی وجہ سے دوسری سڑک بند تھی اور دونوں

طرف سے ٹریفک آجا رہی تھی، اس سڑک پر تو کنڈیکٹر نے بھی اسے ٹوکا۔ ایک بار ٹرک سے ٹکراتے ٹکراتے وہ بال بال بچا۔ دوسری بار ایک آئل ٹینکر سے چند فٹ کے فاصلے پر چابکدستی سے گاڑی موڑی۔ لوگوں کے دل ہول گئے۔ انہوں نے کمالے کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ دو ایک نے تو گالیاں بھی دیں۔

لیکن وہ ان کی سن ہی کب رہا تھا۔ ہوش ہی بس نہیں تھا شاید۔ ہوش میں تو وہ اس وقت آیا۔ جب ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اور ویگن سامنے سے آنے والی ٹیکسی کے پرخچے اُڑاتی لڑھکنے کھاتی سڑک کے دوسرے سرے پر جا پلٹی۔

دھماکا۔ شور شرابا۔ چیخ و پکار۔ پرخچے۔ خون۔ کمالا جانے کیسے لڑھکتی ویگن کے کھل جانے والے دروازے سے دور جا گرا تھا۔ اسے کہنیوں پر معمولی سی خراشیں آئی تھیں۔ ان کی پرواہ کیے بغیر اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ویگن اور ٹیکسی کو دیکھا۔ لوگ دھماکے کی آواز سن کر دوڑے چلے آ رہے تھے۔ حادثہ بڑا ہولناک تھا۔ ٹیکسی کا آدھا حصّہ تو بالکل اڑ گیا تھا۔ سڑک خون سے لال ہو رہی تھی پل بھر میں لوگ سینکڑوں کی تعداد میں اکھٹے ہو گئے۔ زخمیوں اور مرنے والوں کو ٹیکسی اور ویگن کے پچکے ہوئے ڈھانچوں سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ اک کہرام مچ گیا تھا۔ چیخ و پکار سے فضا دہل رہی تھی۔ دونوں طرف ٹریفک جام ہو گئی تھی۔

جانے کتنے مرے، کتنے زخمی ہوئے اور کتنے بچے تھے۔ حادثے کا ذمے دار کمالا ہی تھا۔ خوف اور دہشت سے کمالے کا رنگ سپید پڑ گیا۔ بدن تھر تھر کانپنے لگا۔

وہی مجرم تھا۔ وہی مجرم تھا۔ وہی مجرم تھا۔ کمالے کو شور و غل اور چیخ و پکار سے یہی آواز آتی محسوس ہوئی۔ پکڑے جانے کا خوف دل دہلا گیا۔

فرار؛

خیال آتے ہی وہ جائے واردات سے بھاگا۔ سرپٹ دوڑتا چلا گیا۔ سڑک سے اتر کر وہ کچے راستے پر ہو لیا۔ بنا پیچھے دیکھے وہ یوں بھاگ رہا تھا۔ جیسے پولیس تعاقب کر رہی ہو۔

جانے کتنا راستہ اس نے طے کیا اور کون کون سے گاؤں سے ہوتا ٹوٹی پھوٹی سڑک کے کنارے اگے سرکنڈوں میں آن گرا۔

وہ شاید بے سُدھ ہو گیا تھا۔ کیونکہ جب اس نے اپنی کہنیوں، گھٹنوں میں درد محسوس کیا اور آنکھ کھولی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس نے ٹانگیں سمیٹیں اور بمشکل اپنا وجود گھسیٹتے ہوئے اٹھا۔ سارا بدن پکے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ کپڑے جھاڑتے ہوئے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہولناک حادثے کی دہشت ابھی تک اس پر مسلط تھی۔

سڑک کے دوسری طرف کوئی گاؤں تھا۔ اس میں چلنے کی ہمت تو نہ تھی لیکن اب اسے بھوک پیاس ستا رہی تھی۔ پیٹ کا دوزخ بھرنا تھا۔ اس نے جیب ٹٹولی بٹوا موجود تھا۔ پیسوں کی طرف سے تسلی ہوتے ہی وہ اس گاؤں کی جانب چل پڑا۔ کچھ نہ کچھ کھانے پینے کو مل جانا تھا۔ بھوک پیاس مٹا کر ہی اس کا ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہو سکتا تھا۔

وہ گاؤں میں پہنچا۔ لوگ گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے۔ وہ گاؤں کی کچی گلیوں میں کسی تنور کو تلاش کرتا چلا گیا۔ رات اس نے مسجد میں بسر کرنے کے متعلق سوچ لیا تھا۔ پوچھنے پر اسے ایک شخص نے تنور کا پتا بتا دیا۔

"سیدھے چلے جاؤ۔ دائیں جانب گلی مڑ جائے گی۔ وہاں مائی بسو کا تنور ہے۔ دال روٹی مل جائیگی۔"
کمالے نے اس کا شکریہ ادا کیا اور مائی بسو کے تنور پر پہنچ گیا۔

"پردیسی ہو؟" باتونی سی مائی بسو نے گرم گرم روٹی اور دال کا پیالہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر ہی روٹی کھانے لگا۔ پیتل کے گلاس میں مائی بسو کا بیٹا نھنو پانی بھر لایا۔ مائی بسو باتیں کرتی رہی۔ وہ ہوں ہاں میں جواب دیتے ہوئے روٹی کھانے لگا۔

بھوک بہت تھی لیکن وہ چند لقمے ہی زہر مار کر سکا۔ احساسِ جرم حلق میں پھندا ڈال رہا تھا جانے کتنی قیمتی جانوں کا ضیاع اس کے ہاتھوں ہوا تھا۔ کتنے لوگ اس کی وجہ سے مجروح و اپاہج ہو گئے تھے۔ اپنے بیٹے سے ملنے کی خوشی میں وہ اور سب کچھ بھول گیا تھا۔

بیٹے کا خیال آتے ہی اس کے دل میں پیار جاگنے لگا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے وہ حادثے کو بھول کر اپنے جمالے کے بارے میں سوچنے لگا۔

وہ گھر پہنچ گیا ہوگا۔

لیکن اس کے گھر پہنچنے ہی ویگن کے حادثے کی خبر بھی تو پہنچ گئی ہوگی۔

وہ سر تا پا لرز گیا۔ ایکدم سے اٹھتے ہوئے اس نے مائی بسو سے روٹی دال کے پیسے پوچھے بنا دو روپے بٹوے سے نکال کر اس کی چنگیر میں ڈال دیے اور اس کی کوئی بات سنے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتے گلی میں چلنے لگا۔

"اس گاؤں کا تو نہیں لگتا۔" مائی بسو نے اس کے جانے کے بعد اپنے بیٹے سے کہا۔

"ہاں دیکھا تو کبھی نہیں پہلے۔" نتھو گلاس اٹھاتے ہوئے بولا۔

تنور پر دو ایک مزدور کھانا کھانے آبیٹھے۔ مائی بسو اور نتھو ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

کمالا راستے کا تعین کیے بغیر قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ دماغ تپ رہا تھا۔ ذہن الجھا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔

گھر پہ یقیناً کہرام مچا ہوگا۔ حادثے کی خبر پھیل چکی ہوگی۔ راجاں سینہ کوبی کر رہی ہوگی۔ بیٹیاں رو رو کر بے حال ہو رہی ہوں گی اور جمالا ۔ بے چارے کو آتے ہی اتنا گراں صدمہ سہنا پڑا ہوگا۔

سوچتے سوچتے وہ بڑی سڑک پہ آگیا۔ رات اتر چکی تھی۔ آسمان پہ ستارے ٹمٹما رہے تھے دور کناروں پہ بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔ ہوا بند تھی پھر بھی فضا کی خنکی بدن میں کپکپی پیدا کر رہی تھی۔ سوچوں میں گم وہ چلا جا رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے ایک بس آئی ہارن کی آواز پہ وہ چونکا خیالوں سے نکلا اور — اور ایکدم ہی اس نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے بس کو رکنے کے لیے ہاتھ دیا۔

لیکن بس نکل گئی۔

وہ بس کے پیچھے آنے والے ایک ٹرک کو روکنے میں کامیاب ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟" ٹرک ڈرائیور نے کھڑکی سے گردن نکال کر پوچھا۔

"مجھے اسی طرف جانا ہے۔ اس وقت کوئی سواری نہیں مل رہی۔" کمالے نے جلدی سے کہا۔

"وہ جو بس گزری ہے۔"

"رکی نہیں ۔ ہاتھ دیا تھا۔"

"کوئی ڈاکو واکو تو نہیں ہو۔"

"تلاشی لے لو۔ میرے پاس چند روپوں کے سوا کچھ نہیں۔ صرف آبادی تک جانا ہے۔ جہاں سے سواری مل جائے۔"

ڈرائیور نے کنڈیکٹر سے کچھ کہا۔ پھر انہوں نے کمالے کو ساتھ بٹھا لیا۔

ڈرائیور اور کنڈیکٹر اس سے باتیں کرتے رہے لیکن وہ گم صم بیٹھا رہا۔ اس نے تو گھر پہنچنا تھا۔ تاکہ اپنے زندہ ہونے کا ثبوت گھر والوں کو دے کر انہیں کرب و اذیت سے نکال سکے۔ اسے اپنے بیٹے سے ملنے کی بھی لگن تھی تین سالوں بعد وہ آیا تھا۔ اسے ملنے کے لیے وہ تڑپ رہا تھا جمالے سے مل کر، در بیوی بچوں کو تسلی دے کر وہ پھر فرار ہو جائے گا۔ یا اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دے گا؟ اس بات کا وہ فیصلہ نہیں کر پایا۔ یہ فیصلہ اس نے حالات پر چھوڑ دیا۔

وہ ٹرک پر بسوں کے اڈے پہ آگیا۔ اپنے گاؤں سے وہ اس وقت ایک سو پچیس میل کے فاصلے پہ تھا۔ بالکل مخالف سمت آچکا تھا۔

پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری بس پہ بیٹھ گیا۔ دو جگہ بس بدلی اور شہر سے گاؤں تک پیدل چلتا ہوا سحر کے قریب اپنے گھر کی بیرونی گلی تک پہنچ گیا۔

اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ سردی کے باوجود پسینے آرہے تھے۔ وہ نکڑ تک آتے آتے بری طرح ہانپ رہا تھا۔

نکڑ پہ کھڑے ہو کر اس نے اپنے گھر کی جانب دیکھا۔ گھر میں شاید گیس جل رہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا اور کچھ لوگ اندر باہر آجا رہے تھے۔

اس نے اک گہرا سانس لیا۔ اسے پکا یقین ہو گیا کہ اس کے حادثے میں مرنے کی خبر گھر تک پہنچ چکی ہے۔ پھر ایکدم ہی راجاں کے دل کو چیرنے والے بینوں کی آواز اس کے کانوں میں اتری۔ بہت سے لوگ آہ و بکا کرنے لگے۔

کمالا چند لمحے ساکت سا کھڑا رہا۔

کیا اتنے لوگوں میں اسے گھر میں جا کر اپنے زندہ ہونے کی خبر دینی چاہیئے؟ ایسا کیا تو گرفتاری یقینی ہے۔

وہ ابھی ڈھنگ سے سوچ بھی نہ پایا تھا کہ دو آدمی اس کے گھر سے نکل کر گلی میں ادھر ہی آنے لگے۔

کمالا جھٹ سے دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اندھیرا کافی تھا۔ وہ ان لوگوں کو نظر نہیں آیا۔ یا شاید وہ باتوں میں اسے دیکھ ہی نہ پائے۔

کمالے نے سنا۔ فیقا نائی، رمضان ماچھی سے کہہ رہا تھا۔ "مر جائے گی بیچاری۔ توبہ توبہ کیسی تڑپ رہی ہے راجاں۔"

"حادثہ بھی تو ایسا ہولناک ہوا ہے۔" رمضان نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "مر تو خود ہی جائے گی۔ خاوند بھی گیا اور بیٹا بھی۔ تین سال بعد آرہا تھا بیچارہ۔"

کمالے کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ گھر سے اونچی آوازوں میں بینوں اور سینہ کوبی کی آوازیں آرہی تھیں۔

"جمالے کی لاش تو بالکل کچلی گئی۔" فیقے نے کہا۔

"کیا"۔ کمالا اک لمبی سی چیخ مارتے ہوئے دونوں کے سامنے لپک کر آگیا۔ اس کا دماغ بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ فیقے اور رمضان کے گریبان پکڑ کر وہ چیخا۔ "کس کی لاش کی بات کر رہے ہو؟"

"ارے۔ رے۔ کمالے تو۔ تو بچ گیا۔" فیقے نے اسے پہچانتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"مر کون گیا؟" کمالے نے جواب دیئے بغیر پوچھا۔

"او کم بختا۔ تیرا بیٹا۔ جمالا۔ تیری ویگن سے اس کی ٹیکسی کچلی گئی۔ وہ صبح کے جہاز سے آگیا تھا۔ خوشی خوشی ٹیکسی میں گھر آرہا تھا۔ اسی سے تو ٹکر ہوئی۔ تو بچ گیا۔ تو بچ گیا اور"

"ہا۔" کمالے کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ لہرایا۔ فیقے اور رمضان نے اسے بازوؤں میں بھر کر تھام لیا۔

رمضان کہہ رہا تھا۔ "رات بارہ بجے لاش پوسٹ مارٹم کے بعد پولیس نے یہاں پہنچائی۔"

فیقا بولا۔ "تیری موت کی خبر بھی یہاں پہنچی ہوئی ہے۔ شکر ہے تو بچ گیا۔"

رمضان روتے ہوئے دکھی آواز میں بولا۔ "اوئے یہ مرجاتا۔ وہ گبرو جوان۔ بچ جاتا۔"

گھر سے رونے پیٹنے اور دل دوز چیخوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ رمضان اور فیقا کمالے کو سہارا دے کر گھر کی طرف لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن کمالا ان کے بازوؤں سے لڑھک رہا تھا۔ گر رہا تھا۔ گھسیٹے بھی نہیں گھسیٹا جا رہا تھا۔

"کمالے او کمالے۔" فیقے اور رمضان نے زور زور سے اسے آوازیں دیتے جھنجوڑتے وہیں زمین پر لٹا دیا۔

لیکن کمالا کچھ سن نہیں رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں رہا تھا۔

وہ۔ تو ہوش و خرد کی دنیا سے بہت دور جا چکا تھا۔

بلاعنوان

اس کے سامنے دو راستے تھے۔ انتخاب نوید نے اس پر چھوڑ دیا تھا۔

اِدھر یا اُدھر۔ اس کی مرضی، سوچ اور خواہش پر منحصر تھا۔ نوید نے کھلے دل سے فیصلے کا حق اُسے دے دیا تھا۔

"تم جو بھی فیصلہ کرو۔ مجھے منظور ہے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

"لیکن"..... وہ گھگھیائی تھی۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بس دو ہی راستے ہیں۔ ایک چُن لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔"

"لیکن..." اس نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔

"کہا نا لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم شاید کسی تیسری راہ کی بات کرنا چاہتی ہو۔ لیکن میں نہیں ایک بار نہیں، کئی بار کہہ چکا ہوں کہ تیسری راہ ممکن ہے، لیکن یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ کسی ایک کا انتخاب کر لو۔ میں معترض نہیں ہوں گا۔ تمہاری خوشی ہر حال میں مجھے منظور ہے۔"

نوید نے خلوص اور سنجیدگی سے آخری بار اپنا آخری فیصلہ سُنا دیا تھا۔ اس کے بعد اس کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہ رہی تھی۔

اور وہ تذبذب میں تھی، کشمکش میں تھی کہ کیا کرے،

کونسا راستہ اختیار کرے، کس راہ پر قدم رکھے۔

راہیں دونوں ہی کٹھن تھیں۔ آسان راستے نہیں تھے کہ جن پر وہ سہل پسندی سے قدم قدم چل سکتی۔ وہ اتنی انجان تو نہیں تھی۔ زندگی کی ہوش رُبا تلخیوں کی بوباس سُونگھ سکتی تھی۔

لیکن۔

زندگی تو اب بھی تلخ تھی۔ سنسان، ویران، عزیز آباد اور سُونی۔

پھر!

اُسے ایک راستہ چُن ہی لینا چاہیئے تھا۔

وہ کئی دنوں سے یہ بات سوچ رہی تھی۔ لیکن فیصلے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ بار بار اس کا دھیان اس تیسری راہ کی طرف جاتا تھا جسے نوید نے مسترد کر دیا تھا۔

اسے نوید پر غصہ بھی آتا۔ وہ خود غرض بھی لگتا۔ کیا تھا جو وہ اس کی بات مان لیتا! اپنی نہ سہی اس کی خوشی کی خاطر۔

کبھی کبھی تو اسے نوید کی محبت پر بھی اعتماد نہ رہتا۔ وہ سوچتی اگر نوید اس سے سچا پیار کرتا ہوتا، اس سے محبت ہوتی، تو وہ اس کی بات مان نہ لیتا، اس کے دکھ کو سمجھ نہ لیتا، اس کے سُونے پن کو ختم کرنے کے لیے تیسری راہ پر بے دھڑک قدم نہ رکھ دیتا۔

اس کی ساری کوششوں کے باوجود نوید نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ روئی تھی، منتیں کی تھیں، محبت کے واسطے دیے تھے، ازدواجی زندگی کی خوشحالی کے ناطے سے بات کی تھی۔

لیکن،

وہ نہیں مانا تھا۔

وہ تو دوسری راہ پر چلنے کے لیے بھی آمادہ نہیں تھا۔ کسی خاص شوق اور خواہش کا

اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ تقدیر نے جن راہوں پر ڈال دیا تھا۔ وہ بڑے مطمئن انداز میں اسی پر چل رہا تھا۔ چلتے رہنا چاہتا تھا۔ وہ اکثر کہتا۔

"ثانیہ! قدرت کو یہی منظور ہے، دکھ تو ہے لیکن گلہ نہیں۔ شاید اسی میں کوئی بہتری تھی۔ اسے جان کا روگ نہ بناؤ۔ میں جو ہوں۔ زندگی اور بھی بہت کچھ ہے۔ خوشیاں پھیلی پڑی ہیں۔ انھیں چُننا تمہارے اختیار میں ہے۔"

لیکن وہ نوید کی باتوں پر کبھی دھیان نہ دیتی۔ کبھی خوش نہ ہوتی۔ بانجھ دھرتی کا دکھ اور روگ اپنی جگہ تھا۔ وہ بانجھ دھرتی بھی تو نہ تھی۔ اس میں ایک بار روئیدگی پھوٹی تھی۔ وہ اس روئیدگی کے حسن سے آگاہ ہوئی تھی لیکن بدقسمتی سے وہ اس حسن کو پلکوں میں اٹھا کر آنکھوں میں آباد بھی نہ کر پائی تھی کہ خزاں نے پھوٹتے سبزے کو روند ڈالا تھا۔ آشنا ہو کر ناآشنا ہونے سے بڑا دکھ شاید اور کوئی نہیں۔

یہی دُکھ اس کی ساری ہستی کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا اور وہ زندگی کی ہر سہولت، ہر آسائش اور ہر آرام کے ہوتے ہوئے بھی اُسے سُونا، ویران، سنسان اور غیر آباد محسوس کرتی تھی۔

کوئی چار سال پہلے وہ اور نوید رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے۔ یہ کوئی محبت کی شادی نہیں تھی۔ نہ ہی دونوں کی ایک دوسرے سے پہلے جان پہچان تھی۔ بین رشتوں میں سے والدین نے نوید کو چُنا تھا۔ اور ثانیہ نے ان کے انتخاب پر سر جھکا دیا تھا۔ بی اے کے امتحان سے فارغ ہوتے ہی شادی ہو گئی تھی۔ نتیجے کا انتظار بھی ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ نوید اعلیٰ تعلیم یافتہ اچھے اور کھاتے پیتے گھرانے کا برسرِ روزگار لڑکا تھا۔ ثانیہ کے لیے ہر طرح سے موزوں تھا۔ وہ خود بھی ایک خوشحال گھرانے کی تعلیم یافتہ اور سُلجھی ہوئی شائستہ سی لڑکی تھی۔ دونوں کی جوڑی مثالی تھی۔ نوید خوب صورت اور باوقار نوجوان تھا۔ اخلاق و کردار بھی اچھا تھا۔ سوچ و فکر بھی عامیانہ نہیں تھی۔ ثانیہ اُسے پا کر اپنے آپ کو دُنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی تھی۔ خود نوید بھی اسے سرمایۂ حیات تصور کرتا تھا۔ دونوں اپنی اپنی شخصیتوں کا سچ بھلا کر اس جھوٹ پر یقین کرنے لگے تھے کہ

وہ دونوں دو نہیں ایک ہی ہیں۔ نوید، ثانیہ ہے اور ثانیہ، نوید ہے۔ دونوں کے جذبے، نظریے سوچ و فکر اور عمل کی راہیں جب ایک ہی سمت بہنے لگیں تو باور کرنا ہی پڑتا ہے کہ دونوں دو نہیں ایک ہیں۔

شادی صرف دو جسموں نہیں، دو رُوحوں کے اتصال کا بھی نام ہے۔ اس اتصال میں اعتماد اور پیار کے بندھن ہوتے ہیں۔ جب ایسا ہو جائے تو زندگی خوب صورتیوں کا نام بن جاتی ہے۔ چار سُو خوشبوئیں پھیل رہتی ہیں۔ مہک اُٹھتی ہے اور سرشاری کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ کوئی تلخی قریب نہیں پھٹکتی۔ کسی دلآزار حقیقت کا احساس نہیں ہوتا۔ زندگی کی تال پر دل جھُولتے ہیں۔

"نوید!" ثانیہ کہتی۔

"ہوں!" وہ سرشاری سے جواب دیتا۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے۔ ہیں نا؟"

"ہاں!"

"پھر بھی لگتا ہے ہم ہمیشہ سے ایک دوسرے کی قربتوں کو محسوس کرتے رہے ہیں۔ کیا تم بھی ایسا محسوس کرتے ہو؟"

"ثانیہ۔ میں نے جب سے شعور کی دُنیا میں قدم رکھا تھا، کچھ خواب سجا لیے تھے۔ اپنا لیے تھے اور۔ اور تمہیں پا کر لگتا ہے۔ میرا خواب تم ہی تھیں۔ میں نے تمہیں دیکھے بِنا اکثر محسوس کیا تھا چھُوا تھا، تم سے دل کی باتیں کی تھیں۔"

"سچ!"

"ہاں ثانیہ ــ تم میرے تصورات کا پرتو ہو۔"

"نوید میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میں بھی محسوس کرتی ہوں۔ رفیقِ حیات کا جو تصور میں نے انجانے پَن میں پالا تھا۔ تم اس کے عین مطابق ہو۔ مجھے تم نہ ملتے تو کیا ہوتا!"

"شادی تمہارے لیے تکلیف دہ احساس بن جاتی!"

"اُف"۔ وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر آنکھیں بند کر لیتی اور نوید اس پر محبتوں کی پھوار برساتے ہوئے اس کے وجود کو اس پھوار میں بھگو دیتا۔

زندگی کی شاہراہ پر پھول ہی پھول بکھرے تھے۔ نرم و نازک رنگا رنگ پھول۔ جن کی مہک جاندار تھی۔ تانیہ اور نوید اس شاہراہ پر ایک دوسرے کو تھامے سہل سہل قدم رکھتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں تو چلنے سے زیادہ اُڑنے کا احساس ہوتا تھا۔ لگتا تھا مہکتی ہواؤں کے سبک پروں پر اُڑتے چلے جا رہے ہیں۔

ہر نوجوان جوڑا اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز دھنک رنگ خوابوں اور لہلہاتے مسکراتے تصورات کی تحریک ہی سے کرتا ہے۔ بسا اوقات تو انسان ان خوشیوں کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے خود فریبی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ یہ ہواؤں کی طرح سرسراتی خوشیاں آتی اپنی اور ایسی دائمی لگتی ہیں کہ ان کے نہ ہونے کا تصور ہی نہ رہتا۔ جائز اور اصلی حق کی طرح ان پر انحصار کیا جاتا ہے۔ دُکھ غم اور رنج و فکر تو لگتا ہے، دوسروں کے لیے ہیں۔ اپنا تو ان سے دُور کا واسطہ بھی نہیں لگتا۔

تانیہ اور نوید نے بھی خوشیوں، بے بہا خوشیوں کے سنگ سنگ جینے کا آغاز کیا تھا۔ دونوں واقعی لگتا تھا' ایک ہیں۔ پسند ایک، سوچ ایک، جینے کے انداز ایک۔

چھٹیاں گزار کے نوید دفتر جانے لگا۔ تو تانیہ جو قربتوں کی عادی ہو چکی تھی، اکیلے میں گھبرانے لگی۔ یہ چند گھنٹوں کی جُدائی برداشت نہ ہو پاتی۔ اسے لگتا جیسے درد نا آشنا زندگی دُکھوں کے قریب ہو گئی ہے۔ سارا دن وہ بے قراری اور بے صبری سے گزارتی اور جب نوید آتا تو کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح اُس کی طرف بڑھتی۔

"اوہ نوید۔ میں تو یہ چند گھنٹے بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

نوید مسکرا کر اس کے کانوں میں شہد آگیں لہجے میں سرگوشی کرتا۔ "میں کون سا تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں۔"

"اِک اِک پل کس طرح گزرتا ہے وہ میں ہی جانتی ہوں۔"

"میں بھی جانتا ہوں۔"

"نوید ایسے کیسے چلے گا۔ کہیں ہم دونوں زندگی کا مفلوج انگ بن کر نہ رہ جائیں۔"

"مفلوج نہیں، مصروف انگ بننا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ میں دفتر جاؤں اور تم گھر کی دیکھ بھال کرو۔ اسے سجاؤ بناؤ۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ وقت گزاری کے لیے ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ اپنی اس چھوٹی سی جنت کو اور دلفریب بنانے کے لیے میں ایک ایک لمحہ صرف کر دوں گی۔"

"میں دفتری اوقات میں اس جنت میں واپس آنے کا بے صبری سے انتظار کروں گا۔"

"سچ نوید؟"

"ہاں۔"

تانیہ نے خود کو مصروف کر لیا۔ تین بیڈ روم کا خوبصورت گھر اس کی توجہ سے اور خوبصورت ہو گیا۔ اس نے سارے کمروں کی ترتیب بدل ڈالی۔

"اب کیسا لگتا ہے یہ گھر؟" وہ اِترا کر نوید سے پُوچھتی۔

"ایک دم جنت۔"

"واقعی؟"

"بالکل۔"

"کمروں کی نئی ترتیب پسند آئی؟"

"میری تمہاری پسند ایک ہے تانیہ، مجھے تمہاری کسی بات، کسی رائے سے اختلاف نہیں۔"

تانیہ نے باورچی خانے کا کام بھی اپنے ذمے لے لیا۔ اس نے پہلے دن اپنی پسند کا کھانا بنایا، میز لگائی، اور نوید آیا تو بڑی خوشی اور فخر سے بتایا۔ "آج میں نے اپنی من پسند چیزیں خود بنائی ہیں ——— دیکھتے ہیں کھانے پینے میں بھی ہماری پسند مشترک ہے یا نہیں۔"

"تانیہ میں نے کئی بار کہا ہے نا۔ کہ تمہاری پسند میری پسند ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہم دونوں اختلاف کے لفظ سے آشنا ہوں۔ زندگی قلقل کرتے چشمے کی طرح بہتی رہے۔ بس۔"

"چلو کھانا کھا کر تو دیکھو۔"

"کھائے بغیر ہی کہہ سکتا ہوں کہ سب چیزیں میری پسند کی ہوں گی۔ تم میری پسند سے الگ ہو نہیں سکتیں۔"

کھانا بے حد لذیذ تھا۔ تانیہ نے بڑی محنت سے ہر ڈش تیار کی تھی۔ وہ ایک ایک لقمے پر نوید سے پوچھتی۔

"کیسا ہے؟"

"کیسا لگا؟"

نوید لقمہ حلق سے اُتارتے کہہ رہا تھا: "میں نہ کہتا تھا کہ تم میری پسند سے الگ ہو ہی نہیں سکتیں۔ یقین مانو ہر ڈش میری مرغوب غذا ہے۔"

"میں نے تو اپنی مرغوب ڈشیں بنائی تھیں۔ ڈر رہی تھی کہ کہیں...."

"یہ تمہارے کمزور اعتماد کی نشانی ہے۔ ورنہ تمہیں تو اس یقین کے ساتھ ڈشیں بنانا چاہیئے تھیں کہ جو تمہیں پسند ہے وہ میری پسند کے معیار پر بھی پورا اترے گا۔"

"ایک بات کہوں نوید!"

"کہو!"

"یہ حقیقت ہے کہ کھانا میں نے اسی احساس کے ساتھ بنایا تھا کہ میری پسندیدہ چیزیں ہی تمہاری پسند ہوں گی۔"

نوید اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

لباس اور رنگوں میں بھی ان کی پسند ایک تھی۔ کبھی کسی کپڑے پر دونوں میں اختلاف رائے نہیں ہوا تھا۔ بات عجیب ہی تھی۔ لیکن تھی حقیقت۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے

کو خوش کرنے، خوش دیکھنے کے لیے اپنی پسند کو مٹا کر دوسرے کی پسند کا لبادہ اوڑھ لیتے تھے۔

دونوں میں اتنا سچا اور خالص پیار تھا کہ ہلکی سی دلآزاری بھی نہ کرتے تھے ایک دوسرے کی۔

وقت پَر لگا کر اُڑا چلا جا رہا تھا، لیکن یہ اڑتے لمحے جیسے تانیہ اور نوید کی گرفت میں تھے۔ وہ ہر لمحے سے اپنی خوشیوں کا حصہ کشید رہے تھے۔

بہت خوش تھے دونوں۔

بہت خوش۔

اور

خوشی خوشی ایک دوسرے کے لیے جی رہے تھے۔

لیکن

عجیب سی بات ہے کہ زندگی میں تغیر و تبدل نہ ہو تو یکسانیت کا شکار ہو کر ایک دم بور لگنے لگتی ہے۔ ایک ہی عمل بار بار دُہرانے سے گھس پٹ جاتا ہے اور انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ تنوع کی پسند رہے۔ زندگی ٹھہراؤ کا نہیں چلتے جانے کا نام ہے۔ یہ کسی ایک نقطے پر رُک نہیں سکتی۔ رُک جائے تو زندگی کا نام بدل جاتا ہے۔ جمود بھی تو زندگی کی موت کا نام ہے۔

نوید کا وقت تو گھر سے باہر بھی گزرتا تھا۔ دفتری کام، دوستوں سے گپ شپ، اِدھر اُدھر کی باتیں زندگی جمود کے قریب نہیں آئی تھی۔ لیکن تانیہ گھر کی چار دیواری میں رہ رہ کر کچھ یکسانیت کا شکار ہو رہی تھی۔ وہی صبح طلوع ہوتی۔ معمولات شروع ہو جاتے۔ دن ڈھلتا اور رات اُتر آتی۔ نوید کا پیار۔ چاؤ چونچلے باتیں سب ویسی ہی ہوتیں۔ جیسی مہینوں پہلے تھیں کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی۔

نئی بات۔

جس کا دل متقاضی تھا۔ جو مَن کی ضرورت تھی۔ جو تشنہ رُوح کی سیرابی تھی۔

تانیہ بچوں کی دیوانی تھی۔ پھول ایسے پیارے پیارے بچے اس کی سدا سے کمزوری رہے

تھے۔ وہ جب بہت چھوٹی تھی تب بھی بچوں سے پیار کرتی تھی۔ کسی کا بھی بچہ دیکھ لیتی تو اسے زبردستی ماں کی گود سے لے کر کھلاتی پھرتی۔ بڑی ہوئی تب بھی بچوں کے لیے مرتی۔ کسی کا بھی بچہ ہوتا اٹھا لیتی، پیار کرتی۔ گھر میں برتن مانجھنے والی نذیراں کا بچہ تو جب تک وہ کام کرتی، اسی کی گود میں رہتا تھا۔ اماں لاکھ اشارے کرتیں آنکھیں دکھاتیں، گندے مندے بچے کو اٹھانے سے منع کرتیں۔ لیکن تانیہ کے من میں قدرت نے ممتا کے جذبات اتنے وافر بھر رکھے تھے کہ انہیں لٹائے بنا چارہ ہی نہیں تھا۔

بھابیاں اپنے اپنے گھروں میں تھیں۔ بڑی آپا اپنے سسرال میں، ہر وقت ان کے بچوں تک تانیہ کی رسائی ممکن نہ تھی۔ لیکن جب بھی وہ آتیں یا تانیہ وہاں جاتی تو بچوں کی ذمے داری اپنے اوپر لے لیتی۔ کتنی خوشی ملتی تھی اسے۔ یہ وہی جانتی تھی۔

بھابیاں اکثر چھیڑا کرتیں۔ ”تانیہ سارا پیار ساری ممتا دوسرے بچوں پر ہی لٹا دے گی کچھ اپنے لیے بھی بچا کر رکھ۔“

آپا کہتی۔ ”اپنا وقت آئے گا تو سارے شوق ختم ہو جائیں گے۔ دور بھاگے گی بچوں سے۔“

وہ ان کی باتیں سنتی اور بچوں کو اچھالتے پیار کرتے مسکرائے جاتی تھی۔

’اپنے بچے‘! وہ تصور ہی تصور میں ننھے منے گل گوتھنے سے بچوں سے لپٹ لپٹ جاتی اسے بھابیوں اور آپا سے اختلاف تھا کہ بچے دو ہی اچھے۔ وہ تو بہت سارے بچوں کی خواہش رکھتی تھی۔ اس نے صرف دو بچوں کے بارے میں تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ اس بچے کی طرح تھی جو ڈھیر سارے کھلونوں کی خواہش رکھتا ہے۔ بچے بھی تو کھلونے ہی لگتے تھے اسے۔

شادی کے بعد جب جذباتی ریلوں میں کچھ ٹھہراؤ آیا۔ تو اسے بوریت، یکسانیت اور تنہائی سے چھٹکارا پانے کے لیے ان کھلونوں کا خیال آیا۔ یہ خیال دلانے میں بھابیوں، آپا اور دوسرے لوگوں کا بھی ہاتھ تھا۔

”ارے تانو، ابھی تک ویسی کی ویسی ہے۔“

”چھ سات مہینے گزر گئے شادی کو۔“

”کوئی خوشخبری؟“

”فیملی پلاننگ شروع میں نہیں کرنا چاہیئے۔ ایک دو بچوں کے بعد ٹھیک رہتی ہے۔“

”تم تو بچوں کی دیوانی تھیں۔ بھلا دیا نوید نے سب کچھ۔“

”بھئی دیر نہیں ہونی چاہیئے۔ بچے ازدواجی زندگی کی خوشیوں کے ضامن ہوتے ہیں۔“

”بچہ، میاں بیوی کو اکٹھا رکھنے کی سب سے مضبوط کڑی ہے۔“

”بچوں کے بغیر گھر سونا ہوتا ہے۔“

”بچہ عورت کو تحفظ دیتا ہے۔“

”فیملی پلاننگ شروع میں کی جائے تو کئی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔“

”بعض اوقات بچے کی پیدائش ہی مشکوک ہو جاتی ہے۔“

”اتنے مہینے عیش و آرام لوٹ لیا۔ اب آجاؤ راہ پہ۔“

”میاں بیوی کے رشتے کو بچہ اٹوٹ بنا دیتا ہے۔“

”اب بچہ ہو جانا چاہیئے۔“

اٹھتے بیٹھتے تانیہ کو یہ باتیں سننا پڑتیں۔ بچے کے لیے وہ خود بھی بے تاب تھی۔ ان باتوں سے اس کی بے تابی کو تحریک ملتی۔ وہ چاہتی یہ باتیں نوید سے بھی کہہ دے۔ لیکن حیا مانع ہوتی وہ کچھ کہنا چاہتی لیکن کہہ نہ پاتی۔

چند مہینے اور گزر گئے۔

تانیہ کے ذہن میں اب سوائے بچے کے اور کوئی بات نہ ہوتی۔ نوید نے کبھی بھول کر بھی بچے کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ تو خوش تھا، مطمئن تھا اور پرسکون تھا۔

”نوید!“ ایک دن تانیہ کے دل کی بات لبوں تک آ ہی گئی۔

”ہوں!“

"ایک بات کہوں"

"سو باتیں کہو جان"

"سو نہیں صرف ایک"

"ہاں کہو"

وہ چند لمحے چپ رہی۔ اس کے قریب صوفے پر بیٹھی اپنی لمبی خوبصورت انگلیوں میں پڑی انگوٹھیوں کو اضطرابی انداز میں گھمائے گئی۔

"کیا بات ہے؟" نوید نے اس کی جھولتی لٹ چہرے سے پرے ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"نوید!" وہ جھینپتے ہوئے مسکرائی۔

"ہوں"

"میں۔"

"کیا بات ہے! یوں جھجک کیوں رہی ہو۔ کہہ کیوں نہیں دیتیں۔ کیا کہنا چاہتی ہو!" نوید نے اسے اپنے قریب کر لیا۔

اس نے اپنا سر نوید کے کندھے پر رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بولی۔ "نوید۔ کیا تم زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں کرتے؟"

"کمی!"

"ہاں کمی۔ سُوناپن۔ خاموشی۔"

"کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ اتنی بھری پُری زندگی میں ان چیزوں کا کیا کام۔ میری تو زندگی لبالب پیمانے کی طرح بھری ہوئی ہے۔ اتنی بھری ہوئی ہے کہ چھلک چھلک پڑتی ہے۔" اس نے زور سے اسے اپنے ساتھ لگا کر دبوچا۔

"نہیں نوید۔"

"کیا نہیں؟"

"بچے کے بغیر۔۔"

"اوہ۔ تانیہ۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولا۔ "تو تم یہ بات کہنا چاہ رہی تھیں"

وہ اس کی گود میں مُنہ چھپائے ہوئے مسکراتی آواز میں بولی۔ "ہاں۔ ہاں نوید۔ اب ہماری زندگی میں کوئی مہکتا پھول کھلنا چاہیئے۔"

"ہماری زندگی مہکتے پھولوں کا ڈھیر ہے۔"

"نہیں۔ اس پھول کی مہک سے تم آشنا نہیں ہوا بھی۔"

"لیکن تانیہ۔"

"کیا!"

"ہم فی الحال اس جھنجٹ میں نہیں پڑیں گے۔"

"کیا!" تانیہ نے ایک دم اُٹھتے ہوئے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اثباتی انداز میں سر ہلانے لگا۔

"لیکن کیوں!"

نوید نے اپنی پانچ انگلیاں اسے دکھاتے ہوئے ہنس کر کہا "پانچ سال بعد دیکھیں گے۔"

تانیہ کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی تھیں اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا کلیجہ تھام لیا تھا۔

نوید اس کی حالت نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ "یہ تمہیں بچوں کا ایکا ایکی کیسے خیال آگیا۔؟"

"مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں نوید۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"اوہو!"

"ہاں نوید۔ بہت اچھے لگتے ہیں۔ پیارے پیارے مُنّے مُنّے بچے۔"

نوید نے سر ہلایا اور گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "بچے اچھے لگتے ہیں مجھے بھی۔ لیکن۔۔۔۔"

"لیکن ؟"

"فی الحال میں اُن کی ذمّے داریوں کا متحمل ہونا نہیں چاہتا۔" وہ بولا۔ ثانیہ نے ہونقوں کی طرح اسے دیکھا۔

"دیکھو نا ثانیہ، اس وقت ہم دونوں زندگی سے ساری خوشیاں، سارا حسن، ساری مہک کشید رہے ہیں۔ تم ہو اور میں ہوں — میں ہوں اور تم ہو۔ ہمارے درمیان کوئی نہیں۔ بچّے۔ جنجال — ذمّے داری — اُف میں تو ابھی سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"نوید!"

"ہاں ثانیہ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ میری کچھ پلاننگ ہے۔ مجھے ان خطوط پر سوچنا اور عمل کرنا ہے۔ ہمیں پوری طرح سٹیبل ہوتے کم از کم پانچ سال لگیں گے۔"

"پانچ سال!"

"ہاں۔ میں — میں ایک بڑی اور خوب صورت کوٹھی بنوانا چاہتی ہوں۔ بزنس مینجمنٹ کا کورس کرنے امریکا جانے کا ارادہ ہے۔ زندگی کی سہولتیں اور آسائشیں اکٹھی کر لوں گا۔ تب بچّے —"

"کیا اب ہمیں زندگی کی آسائشیں اور سہولتیں میسّر نہیں ہیں"!

"میں اس جگہ رکنا نہیں چاہتا ہوں۔"

"آگے بڑھنے میں بچّے مانع تو نہیں ہوں گے۔"

"کیسے نہیں ہوں گے۔ بیڑیاں بن جائیں گے میرے بڑھتے قدموں کی۔ میں چند قدم بھی نہ چل پاؤں گا ثانیہ بیگم۔ انہی جھنجٹوں میں کہیں گم ہو جاؤں گا۔ کھو جاؤں گا اور محترمہ بڑے انکسار کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ میں ابھی کھونا نہیں چاہتا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"حقیقت کی — سچ کی جو جھوٹ نہیں ہے۔"

"نوید — میں یکسانیت سے دو بھر رہی ہوں۔ مجھے تبدیلی چاہیئے — اور یہ — یہ صرف بچّے..."

"بھئی ابھی نام نہ لو — چینج چاہتی ہو تو چلو۔ امریکا جانے کا پلان بناتے ہیں — مجھے جانا تو ہے ہی" دو سال بعد نہ سہی ابھی سہی۔"

ثانیہ اُسے تکتی رہی۔

اور

وہ اپنی پلاننگ کا ایک ایک نقطہ اسے بتاتا رہا، سمجھاتا رہا۔ بچّوں کی اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔

ثانیہ گُنگ سی بیٹھی ذہنی دھچکے کھا رہی تھی۔ ایک تو یہ موضوع ہی اس کے لیے انتہائی نازک اور حساس تھا۔ دوسرے وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اس میں اور نوید میں کبھی بھی کسی مسئلے پر اختلافِ رائے ہو سکتا ہے۔ آج نوید اس سے اتنے اہم، اتنے سنجیدہ اور ایسے پیارے موضوع پر اختلاف کر رہا تھا۔ صرف اختلاف ہی نہیں، اسے قائل کر رہا تھا۔

لیکن

وہ قائل کیسے ہو جاتی!

دوہرے صدمے کے بوجھ نے اس کا ذہن ماؤف سا کر دیا۔ وہ یقین نہ کرنے کی تگ و دو کر رہی تھی۔ ایسی حقیقت کا جو یقینی تھی۔ اور جس کا کوئی پہلو ڈھک چھپ کر بے یقینی کا یقین نہیں دلاتا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اب تک وہ سچ کی سولی پر لٹکے جھوٹے خوابوں میں جی رہی تھی۔

کئی دن وہ بوکھلائی بوکھلائی سی رہی۔ اس اختلافِ رائے نے اسے یہ بات باور کرا دی تھی کہ وہ اور نوید دونوں ایک نہیں، دو الگ الگ حقیقی وجود رکھنے والے انسان ہیں۔ ٹوٹ کر بکھرنے والی کیفیت اس پر طاری تھی اور صدمے سے نڈھال ہو رہی تھی۔ وہ بہت دیر روئی۔

نوید اس کی حالت دیکھ رہا تھا۔ دُکھ کی گہرائیوں تک جانے اور پہنچنے کی ضرورت نہیں تھی وہ اسے ثانیہ کی جذباتیت سے منسوب کر رہا تھا اور اس کا دھیان ہٹانے کے لیے بھی کوشاں تھا

کبھی اسے باہر گھمانے لے جاتا۔

کبھی اس کی بھابیوں سے ملانے لے جاتا۔

کبھی بڑی آپا کے پاس دن گزارنے کو جانے دیتا۔

کبھی بازار لے جاکر ڈھیروں شاپنگ کروا دیتا۔

لیکن

ثانیہ کے لبوں کی وہ جیتی جاگتی مسکراہٹ واپس نہیں آئی۔

پھر

یہ

جیتی جاگتی مسکراہٹ تو اس دن اس کے لبوں پر پھوٹی، جب اس کی آنکھوں میں بھی مستی کے رنگ چھلک چھلک گئے۔

اس نے اچانک ہی اپنے اندر کچھ تبدیلی پائی۔

کچھ محسوس کیا۔

کچھ جانا۔

کچھ پتا چلا تو وہ نوید سے اپنی خوشی چھپا نہ سکی۔

"کیا۔۔ کیا ہوا۔۔ اتنی خوش کیوں ہو! بڑے دنوں بعد موڈ ٹھیک ہوا ہے۔"

"نوید!"

"ہوں"

"وہ ۔۔ وہ ۔۔"

"وہ کیا ۔۔!"

اس کے جواب میں اس نے سرشاری کے عالم میں نوید کے کان میں سرگوشی کی۔

"کیا!" نوید نے اس کی باہیں گلے سے ہٹا کر حیرانگی سے اسے دیکھا۔

وہ اتراتے ہوئے سر اثبات میں ہلانے لگی۔ پھر شرما کر اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

"کیا۔ یہ سچ ہے!" نوید بوکھلا گیا۔

اس نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا: "مجھے محسوس ہو رہا ہے نوید ۔ پورا ہفتہ اوپر ہے۔"

"نہیں۔۔ نہیں ۔۔" نوید نے سر جھٹکا۔

"کیسے نہیں ۔ نوید ۔ خدا نے ۔ اس خالق نے میرے اندر تخلیق کا عمل شروع کر دیا ہے ۔ نوید۔ میری خوشیاں ۔ ۔ ۔"

"لیکن مجھے کوئی خوشی نہیں۔"

"نوید۔ ناشکری نہ کرو۔"

"اس میں شکر کی کوئی بات نہیں۔"

ثانیہ نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پہ رکھ دیا۔ وہ الجھا الجھا اسے تکتا رہا۔ پھر پیر پٹختے ہوئے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی ساری پلاننگ اپ سیٹ ہو گئی تھی۔

ثانیہ دکھی سی ہو گئی۔

لیکن

یہ کیفیت اس پہ زیادہ دیر طاری نہ رہی۔ اس کیفیت کا سکون اور سکھ اتنا اہم، اتنا بڑا اور اتنا دلنواز تھا کہ یہ دکھ غیر محسوس سا ہو گیا۔ ویسے وہ بہت دن نوید سے روٹھی روٹھی رہی۔

ڈاکٹر نے ثانیہ کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ وہ ماں بننے کے عمل سے گزر رہی تھی۔

اس پہ سرشاری کی کیفیت طاری تھی۔

بچہ۔

اپنا بچہ۔

یہ تصور ہی اتنا جانفزا تھا کہ ثانیہ کو ہر طرف رنگا رنگ مہکتے پھولوں ہی کا احساس ہوتا۔

خوشیوں کے دھارے اس کے اندر سے پھوٹ رہے تھے۔ اپنے آپ پہ مان محسوس ہوتا تھا۔ ادھورے پن کی تکمیل لگتی تھی۔ نوید کو پا کر بھی وہ شاید ایسی الوہی خوشیوں کا احساس نہ کر پائی

تھی اب تو اس کی دُنیا، اس کی دُنیا، اس کی سوچ، اس کے خیال اتنے وسعت پذیر تھے کہ اب تک پائی ہوئی بڑی بڑی خوشیاں بھی چھوٹی اور معمولی لگ رہی تھیں۔

وہ مصروف ہوگئی — اپنے آپ ہیں — اپنے آنے والے بچّے ہیں۔ اسے لگتا بہت سارے کام کرنے کو ہیں۔ وقت کم ہے۔ اسے بہت کچھ نپٹانا ہے۔ تیاریاں کرنی ہیں۔ ننھی مُنّی چیزیں اکٹھی کرنی ہیں۔ کھلونے خریدنے ہیں۔ وہ اپنے کاموں میں لگ گئی۔ کبھی سلائیاں بُن رہی ہے۔ کبھی مشین پر جھکی ہے۔ کبھی ڈھیروں چیزیں خرید رہی ہے۔

بھابی نے اسے اس طرح مصروف دیکھا تو ہنس کر کہا: "تانیہ یہ کام تمہارے کرنے کے نہیں ہیں۔"

"کیوں؟"

"پہلی بار تو سب کچھ بہنوں، بھابیوں، نانیوں، دادیوں کی ذمّے داری ہوتی ہے۔ فکر نہ کرو تمہیں ہر چیز بنی بنائی مل جائے گی۔"

"نہیں بھابی۔ میں تو ہر چیز اپنے ہاتھ سے بناؤں گی۔ یہ سارے کام آپ لوگوں نے کر دیئے تو میں بھلا کیا کروں گی؟"

"تم ننھی مُنّی جان کی آمد کا انتظار کرو۔"

"وہ تو میں کر رہی ہوں۔ ایک ایک لمحہ انتظار کے لُطف آمیز کرب سے گزرتے گزر رہی ہوں بھابی۔ لوگ تو دن گنتے ہوں گے، میں پَل پَل گن رہی ہوں۔"

"تیرے شوق کی انتہا ہے۔"

"بھابی آپ نہیں جانتیں کہ جب میں اپنے آنے والے بچّے کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے کیا ہونے لگتا ہے۔"

وہ ایسی ہی باتیں نوید سے بھی کہتی تو وہ کبھی ہنس کر اور کبھی بیزاری سے کہتا "بچّے کے آنے تک تم پاگل ہو جاؤ گی۔"

وہ اس کی بات پر اترا کر قہقہہ لگاتی، پھر کہتی: "سُنا کرتی تھی کہ بعض مرد اپنے بچّوں ہی سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ لگتا ہے تم بھی ان مردوں میں سے ہو۔"

"تم بھی تو ان عورتوں میں سے ہو۔ جو بچّوں کی خاطر شوہروں سے بے پروا ہو جاتی ہے۔"

"میں تم سے بے پروا کب ہوئی ہوں؟"

"تھوڑی اب ہوئی ہو۔ زیادہ ان حضرت کے آنے پر ہو جاؤ گی۔"

وہ نوید کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیتی۔

"نوید!"

"ہوں۔"

"تمہیں بیٹی چاہیئے یا بیٹا؟"

"بیٹی نا بیٹا — مجھے صرف تانیہ چاہیئے۔"

"ہائے ہائے — کیسی باتیں مُنہ سے نکالتے ہیں۔ تانیہ یہیں ہے تمہارے پاس — بچّے کی بات کرو — بیٹی پسند ہے یا بیٹا؟"

"تم اپنی کہو۔"

"مجھے تو جو مل گیا پسند ہوگا۔ بیٹا ہو یا بیٹی اللہ کی دین ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"خواہش نہیں؟"

"اوں ہوں۔"

"نوید تم باپ بننے والے ہو۔ تمہاری کچھ ذمّے داریاں ہوں گی۔"

"جانتا ہوں۔"

"تو اِن ذمّے داریوں کا احساس ہنسی خوشی کر دنا۔ بُری بات ہے۔ جب بھی بات کرتے ہو۔ جلے کٹے لہجے میں کرتے ہو۔ تم خوش نہیں ہو؟"

"ہوں بابا ہوں۔"

"سچی؟"

"تمہاری خاطر۔ صرف تمہاری خاطر۔ تم خوش ہو اور میں تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ابھی بچے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا پلان پانچ سال بعد کا تھا۔"

وہ اس کی بات پر ہنس پڑی۔ "میرا پلان نہیں تھا نا۔"

"بس ٹھیک ہے۔ اب مجھے پھر سے پلاننگ کرنا پڑے گی۔ لگتا ہے امریکا میں اکیلا ہی جاؤں گا۔"

"وہ کیوں؟"

"تو اور کیا۔ تم اپنے بچے کے ساتھ یہیں رہنا۔"

"تو کیا بچہ ساتھ نہیں جا سکتا؟"

"اتنے اخراجات کون پورے کرے گا؟"

"نہ سہی۔ جانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔"

"جانا تو ضرور ہے۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ جاؤ گے تو بیوی بچے کے ساتھ۔"

"اچھی دھونس ہے۔"

"دھونس نہیں جناب، حقیقت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم اکیلے جا ہی نہیں پاؤ گے۔"

"کیوں جی؟"

"اس لیے کہ تم میرے بنا نہیں رہ سکتے۔"

"اسی لیے تو پانچ سال کا پلان۔۔۔"

"اوں ہوں۔ تم بچے کے بنا بھی نہیں رہ سکو گے نوید۔ میں جانتی ہوں۔"

"کیسے جانتی ہو؟"

"ایسے کہ میری طرح تم بھی اپنے بچے کا اسی شدت سے انتظار کر رہے ہو۔"

نوید ہنس پڑا۔

"کیا نہیں کر رہے انتظار؟" تانیہ نے وثوق اور اعتماد سے پوچھا۔ "سچ بتاؤ۔"

نوید نے اُسے بانہوں میں لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "تانیہ بچے مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔ صرف اپنے منصوبوں کی وجہ سے میں ابھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ذمے داری آن پڑے۔ پر اب، ٹھیک ہے، خدا کو یہی منظور تھا۔ اور پھر تم بھی تو اتنی خوش ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری خوشیوں کا حصے دار نہ بنوں۔"

"اوہ۔ نوید۔ تم کتنے اچھے ہو۔" تانیہ اس کی بانہوں میں سمٹ گئی۔

دن ہنسی خوشی گزرنے لگے۔

ہر عورت کی طرح تانیہ بھی اوّلین ایام میں کچھ تکالیف سے دوچار ہوئی۔ اس کے اندر آتی بڑی تبدیلی رُونما ہو رہی تھی۔ وجود میں ایک نیا وجود ڈھل رہا تھا۔ طبیعت خراب ہو جاتی تھی۔ کھانا ہضم نہ ہوتا۔ کئی چیزوں سے دل بیزار ہو گیا۔ کئی چیزیں من بھانے لگیں۔ صبح صبح ابکائیاں آتیں تو انتڑیاں دوہری ہو جاتیں۔ کھایا پیا الٹ دیتی۔ نوید اس کی حالت دیکھتا تو ہمدردی سے کہتا: "کتنی تکلیف میں ہو۔"

"یہ تکلیف ہر ماں کو سہنا پڑتی ہے۔"

"تمہیں ملال نہیں؟"

"کس بات کا؟"

"اپنے آپ کو گرفتارِ مصائب کرنے کا۔"

"نوید! کئی بار کہا ہے ایسی باتیں مت کیا کرو۔ جتنی بڑی خوشی مجھے ملنے والی ہے اس کے سامنے یہ تکالیف ہیچ ہیں۔"

"تمہارا تو دماغ ہی الٹ گیا ہے۔"

وہ اس کی بات پر مسکرا دیتی۔ اس کے چہرے پر ایسی شفیق اور بھرپور مسکراہٹ پھیل جاتی کہ

نوید کو لگتا کائنات کا سارا حُسن اس میں سمٹ آیا ہے۔

تین چار ماہ گزرنے پر تانیہ کی طبیعت آپ ہی آپ سنبھل گئی۔ اب نہ طبیعت میں سُستی رہی، نہ کھایا پیا کبھی اُلٹا، نہ ہی ابکائیوں نے انتڑیاں دوہری کیں۔ وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ چاق و چوبند تھی۔ چہرے پر بھی بلا کا نکھار تھا۔ تازگی اور جگمگاہٹ تھی۔ نوید تو نوید، تانیہ جب اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی تو اپنے آپ پر بے طرح پیار آجاتا۔ ممتا کے نور کے اپنے ہی انداز ہوتے ہیں۔

دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔

"تانیہ!" ایک دن نوید نے کہا۔

"جی!"

"ایک چکر مری کا نہ ہو جائے!"

"مری۔ اتنی سردی میں!"

"برف پڑی ہے۔ میرے دو دوست اپنی فیملیز کے ساتھ ہو آئے ہیں۔ میرا جی بھی چاہتا ہے۔ پھر یہی تو وقت ہے، جو گھوما پھرا جا سکتا ہے پھر تو..."

"پھر تو!"

"بھئی پھر تو تم پہاڑ پر جانے کے!" نوید نے ہاتھوں سے پیٹ باہر نکلنے کا اشارہ کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"او۔ ہو!" تانیہ ہنس پڑی۔

"اس کے بعد جب کوئی ننھا مُنّا یا ننھی مُنّی آ گئی تو گھومنا پھرنا خواب ہی بن جائے گا!"

"کیوں بھلا!"

"تمھارے انداز بتا رہے ہیں کہ تم بے حد مصروف، بے حد بور ہو جاؤ گی۔ سیر سپاٹے کا نام لوں گا تو تمھیں بے شمار کام یاد آ جائیں گے۔ کیوں کہ تم ان کاموں کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لو گی۔"

نوید نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ہنس ہنس کر کہا تو تانیہ اترا کر اُسے تکتے ہوئے بولی۔

"یہ تو ہو گا ہی۔"

"اس لیے تو کہہ رہا ہوں بھلی لوگ۔ چلو مری چلتے ہیں۔ فرصت کے دنوں کا کچھ تو فائدہ اٹھانے دو۔"

تانیہ اس کی بات پر مسکراتے ہوئے بولی: "ٹھیک ہے۔"

"تو تیاری کر لو۔"

"کتنے دن کے لیے جاؤ گے!"

"یہی دو چار دن۔ ایک آدھ دن پنڈی گزاریں گے۔"

"دفتر بند!"

"نہیں تو۔ شعیب ہے نا۔ تم میرے کام کی فکر نہ کرو۔ اچھا تو آج ہی تیاری کر لو کل صبح صبح نکل جائیں گے۔"

"گرم کپڑے درکار ہوں گے۔ یہاں اتنی ٹھنڈ ہے، وہاں تو اور بھی ہو گی۔"

"ہاں ہو گی تو۔ اپنی شالیں اور میرا چُغہ ضرور رکھ لینا لیکن بہت زیادہ سامان اکٹھا نہیں کرنا۔"

"جی بہت اچھا۔ آپ دفتر تشریف لے جائیں۔ واپس تک میں ساری تیاری کر لوں۔ ٹھیک!"

"ٹھیک۔"

نوید چلا گیا۔ تانیہ خوشی خوشی تیاریاں کرنے لگی۔ واقعی یہی وقت تھا جو وہ آسانی سے گھومنے پھرنے جا سکتی تھی۔ بچہ ہونے کے بعد تو اس طرح فرصت ملنے کا امکان و سوال ہی نہ تھا۔

تانیہ نے سوٹ کیس اور بیگ تیار کیے۔ نوید کا چغہ اسٹور میں گرم کپڑوں کے بڑے بکس میں پڑا تھا۔ یہاں تو سردی اتنی پڑ ہی نہیں رہی تھی۔ جو چغہ استعمال میں آتا۔ لیکن مری لے کر جانا ضروری تھا۔ نوید بھی کہہ گیا تھا۔

تانیہ اسٹور میں گئی۔ بڑے بکس کے اوپر دو اور بکس پڑے تھے۔ جو خاصے وزنی تھے۔ اس نے گھسیٹ کر ایک بکس اتارا۔

"اُف" اس کے لبوں سے نکلا۔ دوسرا بکس اتارنے کے لیے اس نے ملازم کو آواز دی۔ لیکن وہ شاید باہر گیا تھا۔ جواب نہ پاکر تانیہ نے خود ہی اُسے گھسیٹا۔

لیکن

بکس اُٹھا کر زمین پر رکھتے رکھتے اس کی کمر میں ایک ٹیس سی اُبھری۔ وہ بکس وہیں چھوڑ دونوں ہاتھوں سے کمر تھام کر جھکی جھکی سی کھڑی ہوگئی۔ ٹیس اتنی شدید تھی کہ اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے

چند لمحے وہ آنکھیں بند کیے اسی طرح کھڑی رہی۔

پھر

ہولے ہولے سیدھا ہونا چاہا۔

لیکن

ہو نہ سکی۔ کمر لگتا تھا ٹوٹ ہی گئی ہے۔ اس کے مُنہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

چیخ کی آواز سُن کر رحمتے کپڑے وہیں چھوڑ، صابن لگے گیلے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتی ادھر بھاگی آئی۔

"کیا ہوا بی بی؟" اس نے تانیہ کو اس طرح جھکے دیکھا تو جلدی سے پوچھا۔

تانیہ درد سے بے حال ہوتے ہوئے بولی: "رحمتے مجھے بیڈ تک لے چلو۔"

وہ سہارا دے کر اسے کمرے میں لے آئی اور بیڈ پر لٹا دیا۔ لیکن تانیہ سے سیدھا لیٹا نہ گیا کمر پکڑے وہ دوہری ہو رہی تھی۔

رحمتے کو جب یہ پتا چلا کہ اس نے وزنی بکس اٹھایا ہے تو سینے پر ہاتھ مار کر بولی: "ہا۔ یہ کیا کیا بی بی آپ نے؟"

تانیہ درد سے بے حال ہو رہی تھی۔ رحمتے اس کی کمر سہلاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

"ایسی حالت میں تو ذرا سا وزن بھی نہیں اُٹھانا چاہیئے تھا۔ آپ نے کیا کر دیا بی بی۔ مجھے بُلا لیا ہوتا باہر ہی تو نل پر کپڑے دھو رہی تھی۔ اللہ خیر کرے۔"

رحمتے کے سہلانے سے بھی تکلیف رفع نہ ہوئی۔ تانیہ سے درد برداشت ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"صاحب کو بلا لیں جی۔" رحمتے نے کسی خدشے کے پیشِ نظر جلدی سے کہا۔ "ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔"

رحمتے تانیہ کے کہنے پر فون اُٹھا لائی۔ تانیہ نے بمشکل فون ملایا۔ دفتر میں شعیب تھا۔ نوید کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔

"وہ آئیں تو انہیں فوراً گھر بھیج دینا۔" تانیہ نے کراہتے ہوئے کہا۔

تکلیف کم نہیں ہو رہی تھی۔ تانیہ نے بڑی بھابی کو فون پر بتایا۔ تو وہ بے طرح گھبرا کر بولیں: "یہ تو نے کیا کر دیا تانیہ۔ میں ابھی آتی ہوں۔ آرام سے لیٹی رہو۔ ہلنا جُلنا نہیں۔"

"ہلا جُلا تو جا ہی نہیں رہا بھابی!" وہ روتے ہوئے بولی۔

"میں آتی ہوں۔"

بھابی نے بڑی آپا کو بھی مطلع کیا۔ دونوں آگے پیچھے پہنچ گئیں۔ تانیہ کی حالت دیکھ کر دونوں پریشان ہوگئیں۔

نوید ابھی تک نہیں آیا تھا۔

"اب کیا کریں؟"

نوید ابھی تک نہیں آیا تھا۔ بھابی نے دوبارہ فون کیا۔ وہ اب بھی دفتر میں نہیں تھا۔

"اب کیا کریں؟" بھابی نے آپا سے کہا۔

"اسپتال لے جانا چاہیئے۔ گاڑی تو ہے۔ نوید کے انتظار میں رہے تو خدانخواستہ کچھ ہو نہ جائے اسے درد بہت زیادہ ہے۔"

"حماقت کی ہے اس نے۔"

"اتنا وزنی بکس گھسیٹ کر اٹھایا۔"

"بلیڈنگ بھی ہو رہی ہے۔ ایک دم ہی بہت زیادہ ہونے لگی ہے۔"

"اسپتال لے چلتے ہیں۔ کہیں گڑبڑ ہی نہ ہو جائے۔"

وہ ثانیہ کو گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئے۔ نوید کو پتا چلا تو حواس باختہ سا ہو گیا۔ وہ بھی اسپتال جا پہنچا۔

اس وقت ثانیہ کو آپریشن تھیٹر لے جایا جا چکا تھا۔ بلیڈنگ بے انتہا ہو رہی تھی۔ آپریشن ضروری ہو گیا تھا۔

اور

پھر

وہ ہو گیا۔

جو ثانیہ کے لیے تو ہرگز نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ ثانیہ کی جھولی بھرنے سے پہلے ہی خالی ہو گئی۔ بچہ ضائع ہو گیا۔ ثانیہ کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ بر وقت اسپتال نہ لایا جاتا تو اس کی جان کا خطرہ بھی موجود تھا۔ سب نے تو اس کی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

لیکن

ثانیہ کو جب ہوش آیا اور صورتِ حال سے آگہی ہوئی تو وہ پاگلوں کی طرح چیخ اٹھی۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرا بچہ۔ میرا بچہ۔"

دو تین دن ثانیہ کے حواس مختل رہے۔ وہ کبھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی، کبھی چیخنے چلانے لگتی۔ اسے نارمل کرنے کے لیے ڈاکٹر کو بڑے جتن کرنا پڑے۔

ایک ہفتے کے بعد وہ گھر آئی۔ تو بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ نوید اس کی دیکھ بھال بڑی تن دہی سے کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے بے حد فکر مند بھی تھا۔ سارا سارا دن اور ساری ساری رات تیمارداری میں گزار رہا تھا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے ثانیہ کو بہلانے کی بھی کوشش کرتا۔

اس دن وہ ثانیہ کے سرہانے پٹی پر بیٹھا اس کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ "ثانیہ ہمت سے کام لو۔ بچوں کا کیا ہے اور آجائیں گے۔ تمہاری یہ حالت . . . ."

"نوید۔" اس نے نوید کا ہاتھ جھٹک کر غصے سے کہا۔ "تم تو یہی چاہتے تھے نا۔"

"نہیں ثانیہ نہیں۔ خدا کی قسم مجھے تو اب تم سے زیادہ اپنے بچے کی آمد کا انتظار تھا۔"

"جھوٹ۔ تم نے جان بوجھ کر میرا بچہ ضائع کیا ہے۔"

"کیا۔ !"

"ہاں۔" وہ خونخوار نظروں سے اسے دیکھتی بستر سے اٹھ بیٹھی۔

"ثانیہ۔ پلیز۔ ہوش کی باتیں کرو۔"

"ہوش تو اب آیا ہے مجھے۔ تم نے اسی لیے مری کا پروگرام بنایا تھا۔ اسی لیے مجھے جھولا جھولنے کے لیے کہا تھا۔"

"ثانیہ۔ !"

"میں سب جانتی ہوں۔ تم نے بچے سے چھٹکارا پانے ہی کے لیے یہ چال چلی تھی۔ تم میرے بچے کے قاتل ہو۔

تم نے میرا بچہ مار ڈالا ہے۔ تم پانچ سال سے پہلے بچے. . . ."

"ثانیہ !" نوید نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

ثانیہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کئی دن اسی وہم اور شک میں مبتلا رہی۔ نوید کے لیے یہ وقت انتہائی کٹھن اور صبر آزما تھا۔ وہ ثانیہ کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ وہ نہ سمجھتی تو غصے میں آجاتا۔ اسے جھڑکتا، جھنجھوڑتا اور حالات کو سمجھنے کے قابل بنانے کی کوشش کرتا۔ اس نے بھابی اور آپا سے بھی اس سلسلے میں تعاون اور مدد مانگی۔

زخم کو نہ چھیڑا جائے تو وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی بھرنے لگتا ہے۔ بھابی اور آپا نے نوید کو یہی مشورہ دیا کہ ثانیہ کو اس کی حالت پر چھوڑ دے۔ ثانیہ جیسی لڑکی کے لیے یہ صدمہ واقعی ناقابلِ برداشت تھا۔ اس لیے اسے جی بھر کر ماتم کرنے اور دوسروں کو کوسنے، موردِ الزام ٹھہرانے کی چھوٹ دے دی جائے گی۔ خود ہی سنبھل جائے گی۔

لیکن

بعض اوقات انسانی تدبیروں اور عقلمندی کے مشوروں پر تقدیر کھل کر قہقہے لگاتی ہے۔ اسے احساس دلاتی ہے کہ انسان بعض حالتوں میں انتہائی مجبور اور پابند ہے۔ جو چاہتا ہے کر نہیں سکتا۔ جو ہوتا ہے اسے روکنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اپنی ہار کو صبر و شکر کے ساتھ تسلیم کر لینے ہی میں مصلحت ہوتی ہے۔

ثانیہ کی بدقسمتی یہی نہیں تھی کہ اس کی جھولی بھرنے سے پہلے ہی خالی ہوگئی۔ بدنصیبی تو یہ ہوئی کہ اس کے اندر اس طرح ٹوٹ پھوٹ ہوئی کہ آئندہ ماں بننے کی صلاحیت ہی ختم ہوگئی تھی۔

ڈاکٹر نے جب چھ ہفتے بعد اس کا معائنہ کیا تو بڑے افسوس سے یہ انکشاف کیا کہ ثانیہ آئندہ کبھی بھی ماں نہ بن سکے گی۔

اس بات سے نوید کو بے حد صدمہ ہوا۔ لیکن ثانیہ تو بن موت ہی مر گئی۔ ڈاکٹر کی بات وہ خود نہ سن لیتی تو شاید نوید اسے بہلاؤوں کے سہارے لیے چلتا۔ لیکن ظلم تو یہ ہوا کہ اس نے اپنے کانوں سے یہ وحشت ناک خبر سن لی۔

اس کا جو ردِعمل ہونا تھا۔ تمام تر خوفناکی کے ساتھ ہوا۔ ثانیہ صدمے سے نڈھال ہو کر ایسی بیمار پڑی کہ بچنے کی اُمید ہی نہ رہی۔

صدموں کی حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے تو ان سے نپٹنا قدرے سہل ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت انسان اسی وقت تسلیم کرتا ہے جس وقت اپنا سر رضائے الٰہی کے سامنے جھکا دیتا ہے، اپنی ہار مان کر اس کی برتری کو مان لیتا ہے، سب کچھ اسی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود بیگانہ ہو جاتا ہے۔ صرف اسی طرح اسے سکون اور تقویتِ قلبی میسر آتی ہے۔ انسان کے سامنے یہ راہ نہ ہوتی تو وہ صبر کے مفہوم اور اثرات سے آگاہ ہی نہ ہوتا۔ حادثات، صدمات اپنی مہربانیوں سے اس کے ذہن کو ماؤف کر دیتے اس کا دماغ ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ اور یہ دُنیا پاگلوں کا اجتماعی مسکن بن جاتی۔

نوید نے بڑی ہمت اور محبت سے ثانیہ کو اس نقطے سے روشناس کرایا۔

"ثانیہ اللہ کی رضا یہی تھی۔"

"صبر سے کام لو۔ خدا صدمہ سہنے کی ہمت دے گا۔"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہم سوائے سرِ تسلیم خم کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔"

"خدا کو یہی منظور تھا۔ ہم تم معترض ہونے والے کون؟ وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ بندہ تو بے بس ہے، عاجز ہے، مجبور و لاچار ہے۔ اپنی حیثیت کو سمجھو ثانیہ۔ خدا کا شکر ادا کیا کرو۔ سب کچھ اسی پر چھوڑ دو۔ جب میں ہوں۔ تو پھر غم کیوں کرتی ہو۔ میں خدا سے تمہاری زندگی اور قسمت کی دُعا کرتا ہوں۔ تم میرے لیے یہی کیا کرو۔"

"اپنے آپ کو تنہا کبھی نہ سمجھنا ثانیہ۔ ہم دونوں زندگی بھر کے ساتھی ہیں۔ موت ہی ہمیں جُدا کرے گی۔ زندگی نہیں۔"

ثانیہ سنبھلنے لگی۔ اس نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ یہ رضائے الٰہی تھی۔

لیکن

اس کے باوجود اپنے اندر ممتا کے بھرتے طوفانوں کو نہ دبا سکی۔ وہ اکثر نوید سے کہتی۔ میں کیا کروں نوید۔ میرے اندر جو پیدائشی ماں چھپی بیٹھی ہے۔ وہ چین لینے نہیں دیتی۔ میں اس کا کیا کروں؟"

نوید بڑا متاثر ہوتا۔ لیکن ثانیہ سے ہنس کر کہتا: "اسے مار ڈالو۔"

"وہ مرتی نہیں نوید۔ اور چاہت سے جینے لگی ہے مجھے بچوں کی ضرورت ہے۔"

اس رات بھی جب وہ نوید کے بازو پر سر رکھے بستر پر چت پڑی تھی۔ اور نوید اسے امریکا جانے کے متعلق بتا رہا تھا۔ وہ اس کی باتیں سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے بچہ چاہیئے نوید۔ مجھے امریکا جانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے بچہ اور صرف بچہ چاہیئے۔"

"لیکن . . . ."

"یہی کہو گے ناکہ اب میرے بچہ نہیں ہو سکتا۔"

[illegible] اور قدرت کا فیصلہ ہے۔"

"نوید ۔ یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا۔ ہزاروں عورتیں اور بھی تو ہیں۔ ایسی بھی ہیں جنھیں سرے سے بچّوں کی خواہش ہی نہیں ہوتی۔ لیکن دھڑا دھڑ بچّے جنے جاتی ہیں۔ وہ ۔ وہ ہمارے رشتے کی بھابی عاصمہ ہیں نا۔ جن کے سات بچّے ہیں ۔ اب نہ چاہنے کے باوجود آٹھویں بچّے ۔۔۔۔"

"تانیہ کوئی اور بات کرو ۔ پلیز۔۔"

"وہ یہ بچّہ نہیں چاہتیں۔ کیا ہوتا جو خدا ان کی جگہ ہمیں دے دیتا یہ بچّہ ۔"

نوید نے اپنا بازو اس کے سر کے نیچے سے نکال لیا اور آدھا دھڑ اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ وہ پھر بہک رہا تھی ۔ نوید کا دل کٹنے لگا۔

"نوید!" تانیہ نے باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔

"ہوں"

"کیا واقعی ہمارے وہاں کوئی بچّہ نہیں ہوگا!"

"ہاں"

"بچّوں کے بغیر زندگی سونی اور ویران ہوتی ہے"

نوید نے سر تکیے پر رکھ دیا۔ تانیہ کی باتوں کا وہ کیا جواب دیتا۔ وہ خود ہی بولے چلی گئی۔

کچھ دیر بعد تانیہ نے نوید کو جھنجوڑ کر کہا "سو گئے ہو!"

"نہیں"

"نوید!"

"ہوں!"

"مجھے بچّے کی ضرورت ہے نوید۔ مجھے بچّہ چاہیئے"

نوید اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تانیہ کو بھی اٹھا کر بٹھا دیا۔ پھر اِک لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔ اسے سمجھایا حالات سے سمجھوتہ کرنے کو کہا۔

"تانیہ تم جو کچھ سوچتی رہتی ہو نا۔ وہ اللہ کو پسند نہیں۔ اس کی مرضی یہی تھی۔ ہم بندے ہیں

ہمیں اس کی رضا کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے۔ دُکھ اور صدمہ مجھے بھی ہوا ہے۔ لیکن میں نے ان سے نباہ کر لینے کا عہد کر لیا ہے۔ کیا ہوگا اگر ہمارے بچّے نہیں ہوں گے۔ دُنیا میں اور بھی سینکڑوں مشاغل ہیں۔ جن کے سہارے جیا جا سکتا ہے۔ کوئی تعمیری کام سوچو۔ وقت بھی گزرے گا اور خدا بھی خوش ہوگا۔"

"ایک بچّے کو پیدا کرنے اور پالنے سے بڑا بھی کوئی تعمیری کام ہے!"

"اوہ خداوندا ۔ بس بھی کرو۔ تھک گیا ہوں میں یہ رٹ سُن سُن کر"

تانیہ چند لمحے چپ رہی۔ نوید نے اِک گہری سانس لی اور تانیہ کو ٹکر ٹکر تکنے لگا۔ وہ بے حد قابلِ رحم نظر آ رہی تھی۔

"نوید۔ میں تمہارے ساتھ، اپنے ساتھ کیسے جھوٹ بولوں! مجھے بچّے چاہئیں۔"

"ٹھیک ہے" نوید جھنجلا کر بولا۔

"کیا ٹھیک ہے!" وہ تجسّس سے اس کی طرف جھکی۔

"تمہیں بچّے چاہئیں!"

"ہاں"

"تو پھر میرے لیے ایک عدد بیوی ڈھونڈو۔ بچّے ہو جائیں گے۔ تم اپنی حسرت انھیں پال کر پوری کر لینا۔"

"ہاں ۔" تانیہ کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

لیکن

دوسرے لمحے گھور اندھیرا پھیل گیا۔ وہ دُکھی سی بولی "کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"ایسا کر سکتی ہو! اپنے آپ سے پوری ایمانداری سے سوال کر کے مجھے بتاؤ تانیہ ۔ کیا تم ایسا کر سکتی ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے نوید کو دیکھا۔ پھر بے اختیارانہ اس کے سینے پر سر

رک کر ہچکیوں سے روتے ہوئے بولی "نہیں نوید۔ میں تمہیں شیئر نہیں کر سکتی۔"

نوید نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب تم یہ بھی نہیں کر سکتیں اور یہ بھی جانتی ہو کہ تمہارے بچّے نہیں ہو سکتے۔ تو پھر ہر وقت کیوں بھٹکتی رہتی ہو۔ اپنی ناامیدی کو تسلیم کیوں نہیں کر لیتیں۔ اپنی نامرادی سے سمجھوتہ کیوں نہیں کر لیتیں۔ میں نے بھی تو کیا ہے۔ مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے۔ تم، جو میری ہو۔"

وہ سسکتی رہی۔

نوید بولا۔ "آئندہ میں تمہارے منہ سے کوئی ایسی بات نہیں سنوں۔ سمجھیں۔ وعدہ کرو کرنی ہونا۔ وعدہ۔"

ثانیہ نے یونہی سر ہلا دیا۔

نوید اسے تسلیاں دلاسے دیتا رہا۔ اپنی بے پایاں اور بے لوث محبت کے سہارے جینے کی آس دلاتا رہا۔

نوید نے امریکا جانے کے انتظامات مکمل کر لیے۔ ثانیہ بھی ساتھ جا رہی تھی۔ وہ بھی تیاریوں میں مگن ہو گئی۔ ذہن اس طرف لگ گیا۔ اور بڑی حد تک وہ پرسکون ہو گئی۔ تین سال دونوں نے امریکا میں گزارے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ نوید نے اُسے خوب گھمایا پھرایا۔ ثانیہ نے بھی وقت گزاری کے لیے چھوٹے موٹے کورسز کیے۔ بہت سے لوگوں سے ملی۔ کئی ایک سے دوستانہ مراسم بھی قائم ہوئے۔ وقت اتنا مصروف گزرا کہ تین سال یوں لگا پلک جھپکنے میں گزر گئے ہیں۔

ثانیہ کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ ماحول اور وقت نے اسے میچور کر دیا تھا۔ اب وہ پہلی سی جذباتی لڑکی نہیں تھی۔ نوید اس کے ذہنی رویوں کی صحت مند تبدیلی سے بہت خوش تھا۔

لیکن۔

بات یہ نہیں تھی کہ ثانیہ کے دل سے بچّے کی لگن مٹ گئی تھی۔ اس کے اندر پیدائشی ماں اب بھی ہاتھ پھیلائے اپنے چھوٹے بچّے کی راہ تک رہی تھی۔ فرق صرف یہ آ گیا تھا کہ اب ثانیہ نے اپنی

نامرادی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ یہ بات اس نے تجربے سے سیکھی تھی۔ امریکا کے قیام دوران اس نے اپنا پورا چیک اپ کروایا تھا۔ ایک نہیں دو تین گائناکالوجسٹ نے اس کا معائنہ کیا تھا۔ انہوں نے بھی وہی کہا تھا جو یہاں کے ڈاکٹر نے کہا تھا۔ لاعلاج مرض کی تشخیص ہو گئی تھی۔ بیقراریوں کو بالآخر خود ہی قرار آ گیا تھا۔ پھر یہاں ثانیہ کئی جوڑوں سے ملی تھی۔ اولاد والے جوڑے۔ بے اولاد جوڑے۔ لے پالک بچّوں کو پالنے والے جوڑے۔ یہاں اس نے مشاہدہ کیا تھا کہ لاولد ہونے کو کوئی جان کا روگ نہیں بناتا۔ ایسے معمر جوڑوں سے بھی وہ ملی تھی جو بے اولاد تھے۔ اور پھر بھی خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔ بچّوں کی محبت کو جانوروں سے پیار کر کے پورا کر لیتے تھے۔ ایسے میاں بیوی بھی دیکھے تھے جن کے بچّے نہیں ہو سکتے تھے۔ اور انہوں نے تسکین کے لیے یتیم خانے سے بچّے حاصل کر کے پال لیے تھے۔ اس نے ایسے ماں باپ بھی دیکھے تھے جو تین بچّے پال سکتے تھے۔ دو اپنے پیدا کیے تیسرا یتیم خانے سے لے کر پال لیا۔ قوم کا ایک بچّہ گھریلو فضا میں پل گیا۔ ثانیہ ان سے مل کر بہت متاثر ہوئی تھی۔ اس کی ہیجانی کیفیتوں کو سکون مل گیا تھا اور اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ پاکستان واپس آ کر وہ بھی کسی بے سہارا بچّے کو گود لے کر اپنی تسکین بھی کرے گی اور ایک بے سہارا بچّے کا سہانا مستقبل بھی بنائے گی۔

واپس آ کر سٹیبل ہوتے ہوتے بھی سات آٹھ ماہ لگ گئے۔

ثانیہ کا مصروفیت میں دھیان شاید بٹا ہی رہتا۔ لیکن اچانک ہی ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جو وہ بچّے کے متعلق پھر سے سوچنے لگی۔

یہ واقعہ عاصمہ بھابی سے متعلق تھا۔ اس کے آٹھویں بچّے کی پیدائش متوقع تھی کہ اس کے میاں کو فالج کا اٹیک ہو گیا۔ مالی حالات پہلے ہی اچھے نہ تھے۔ اس پہ دوہری افتاد۔ وہ بے حد پریشان تھی۔ اُس نے ثانیہ سے کہا۔ "تمہارے بچّے نہیں ہیں۔ یہ ہونے والا بچّہ تم گود لے لو تو میری پریشانی بہت حد تک کم ہو جائے گی۔"

"آپ دے دیں گی بچّہ مجھے؟" ثانیہ نے بے صبری سے پوچھا۔

"میں کیا کروں گی اس کا۔ میرا بس چلتا تو ضائع کروا دیتی۔ ہمارے حالات تو دیکھ ہی رہی ہو۔ میں اس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوں۔ تم چاہو۔ تو میں یہ بچہ تمہیں دے دوں گی۔ پیدا ہوتے ہی لے لینا۔ میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ میرا اس بچے پر کوئی حق نہیں ہوگا۔ کبھی واپس نہیں لوں گی۔"

ثانیہ کے دل میں اُمنگ اُٹھی۔ اور اس نے اسی دن نوید سے بات کی۔

"نوید ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"کہو۔"

"تم مانو گے؟"

"پہلے بات تو سُنوں۔"

ثانیہ نے چند لمحے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے تمہید باندھی۔ پھر بولی۔ "ہمارا گھر بالکل سُونا ہے۔"

"تو پھر!"

"بچہ ہونا چاہیے۔"

"پھر وہی باتیں شروع کر دیں۔"

"سنو تو سہی۔"

"ہوں!"

"نوید۔ میں بچہ گود لینا چاہتی ہوں۔"

"کیا!"

"ہاں نوید۔ تم اجازت دو تو۔"

نوید کچھ نہیں بولا۔ صرف اس کا مُنہ تکتا رہا۔

"نوید۔ میں جانتی ہوں۔ تمہارے بچے ہو سکتے ہیں۔ لیکن میں تمہیں شیئر نہیں کر سکتی۔ ایسا تصور بھی میرے لیے محال ہے۔"

"تو پھر زندگی گزر رہی ہے، گزارتی چلی جاؤ۔"

"یہ بھی ممکن نہیں۔ ہم بچہ گود لے لیتے ہیں نوید۔ گھر میں رونق ہو جائے گی۔ زندگی یونہی بے مقصد گزر رہی ہے، اس کا مصرف۔"

"کسی کا بچہ گود لو گی؟"

"ہاں۔ کیا حرج ہے۔ بچہ تو ہوگا!"

"نہیں ثانیہ۔" نوید نے منفی انداز میں سر ہلایا۔

"کیوں؟" ثانیہ نے پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بس۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ کوئی وجہ بھی ہو انکار کی۔"

"وجہ یہی ہے کہ میں کسی دوسرے کا بچہ گود لینے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"لیکن کیوں؟"

"تمہارے اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔"

"پھر بھی نوید۔"

نوید ثانیہ کی کسی بات کا جواب دینے کے بجائے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

کئی دن دونوں میں اس سلسلے میں بات نہیں ہوئی۔ ہاں ثانیہ کے ذہن میں مسلسل خیالات کے تانے بانے بُنتے رہے۔ وہ بچہ گود لینا چاہتی تھی۔ عاصمہ کا ہونے والا بچہ اُسے باآسانی مل سکتا تھا۔ وہ یہ موقع کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے ہی خاندان کا بچہ تھا۔ پھر عاصمہ کے بچے خوبصورت اور ذہین بھی تھے۔ آنے والا بچہ بھی پہلے بچوں ہی کی طرح کا ہوگا۔

ثانیہ نے عزم تو کر لیا تھا لیکن نوید کو سانچے میں ڈھالنا ذرا مشکل نظر آ رہا تھا۔ ثانیہ نے بھی ہر مشکل سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا۔

اور پھر اس دن اس نے نوید سے کہہ ہی دیا۔ "نوید یا تو بچہ گود لینے کی ہامی بھر لو۔ یا پھر وجہ بتاؤ۔"

"وجہ یہی ہے کہ میں کسی دوسرے کے بچے کو گود لینے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے بچے نہیں ہو سکتے اور یہ بھی کہ میں بچوں کی دیوانی ہوں۔"

نوید نے تانیہ کی طرف دیکھا اور پھر اس کی سنجیدگی کو نظر انداز کرتے ہوئے مُسکرا کر بولا۔"میرے ایک دوست نے اسکول کھول رکھا ہے۔ اس سال اس نے نرسری بھی شروع کی ہے۔ بہتر نہ ہو گا کہ تم اسکول جوائن کر لو۔ نرسری کا سیکشن بھی تمہیں دلا دوں گا۔ صبح ساڑھے سات سے ساڑھے گیارہ بجے تک ایک نہیں کئی بچوں سے دل بہلایا کرنا۔"

تانیہ کندھے اُچکاتے ہوئے بولی۔"تجویز بُری نہیں۔ لیکن میں ہول ٹائم کی خواہاں ہوں۔"

"یہ تو مشکل ہے۔"

"نوید بات مذاق میں نہیں اُڑاؤ۔ مجھے وجہ بتا دو۔ تم کیوں بچہ گود نہیں لینا چاہتے؟"

نوید سنجیدگی سے بولا۔"تانیہ جو بچہ میرا نہیں ہوگا۔ میں اسے کیسے اپنا سکوں گا جس کی رگوں میں میرا خون نہیں ہوگا۔ وہ میرے لیے اجنبی ہی تو ہوگا۔ پرائے بچوں سے وقتی طور پر پیار کیا جا سکتا ہے لیکن انہیں مستقلاً اپنایا نہیں جا سکتا۔ یہ میرا خیال ہے۔"

"تمہارا خیال سو فیصد درست تو نہیں ہو سکتا۔ پالنے کی محبت اپنی جگہ بہت مضبوط ہوتی ہے۔ گھر میں جانور رکھیں تو ان سے پیار ہو جاتا ہے۔ یہ پالک تو انسانی بچہ ہوگا۔"

"اور جس انسانی بچے کو میں پیار، توجہ اور شفقت نہ دے سکوں۔ کیا یہ ظلم نہ ہوگا؟"

"تم دو گے۔"

"میں نہیں مانتا۔ صرف خون کے رشتے اپنا آپ منوا سکتے ہیں تانیہ۔" تانیہ چُپ رہی۔

نوید کچھ رُک کر دوبارہ بولا۔"مجھے یقین تھا کہ تم کبھی نہ کبھی بچہ گود لینے کی ضد کرو گی۔ اسی لیے میں عرصے سے اس پہلو کو ذہن میں رکھ کر اپنے آپ کا تجزیہ کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں وہ پیار، توجہ اور شفقت جو ایک بچہ چاہتا ہے، جس کا وہ مستحق ہوتا ہے، کبھی اس غیر بچے کو نہیں دے سکوں گا، اور یہ اس کی حق تلفی ہوگی۔ اور میں دانستہ کسی کی حق تلفی کر کے

اپنے اعصاب اور ذہن پر مستقل بوجھ ڈال لوں، یہ ٹھیک نہیں۔"

تانیہ نے ایک گہری سانس چھوڑی۔

نوید اس کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولا۔"تانیہ میرے بچے ہو سکتے ہیں۔ تم جانتی ہو لیکن میں نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں اور تم جانتی ہو کیوں؟"

تانیہ کچھ نہیں بولی تو وہ بولا۔"اس لیے کہ تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ میں تمہیں دُکھ نہیں دے سکتا۔ تمہارے بچے نہیں ہو سکتے۔ اگر یہی بات میرے ساتھ ہوتی۔ تو کیا تم مجھے چھوڑ دیتیں؟"

وہ رُکا اور پھر خود ہی بولا۔"نہیں۔ تم مجھے کبھی نہیں چھوڑتیں۔ میں بھی یہی کر رہا ہوں۔ بچوں کی خاطر تمہیں چھوڑ کر کسی دوسری عورت کو تمہاری جگہ دے دوں۔ نا ممکن۔ انتہائی ناممکن۔"

تانیہ نوید کے گلے لگ کر سسکنے لگی۔

اس دن بات آئی گئی ہو گئی۔

لیکن

"تانیہ اپنے ذہن سے یہ بات نہ نکال۔ بلکہ جوں جوں عاصمہ کی ڈلیوری کے دن آ رہے تھے وہ زیادہ بے چین ہو رہی تھی۔

اس لیے اُٹھتے بیٹھتے یہی اصرار کرنے لگی۔

نوید کسی طور غیر بچہ گود لینے کے حق میں نہیں تھا۔

"وہ کوئی غیر بچہ نہیں ہوگا۔ عاصمہ میرے رشتے کی بہن، بھابی ہے۔ پھر اس کے بچے کتنے خوب صورت ہیں۔ ذہین ہیں۔ یہ بچہ بھی ....."

"تانیہ!" نوید اُلجھ گیا۔"میں نے سینکڑوں بار کہا ہے میں کوئی غیر بچہ گود نہیں لوں گا۔ تمہاری تسکین کی خاطر میں اپنا سکون منتشر نہیں کر سکتا۔ مجھے بچوں کی خواہش ہے۔ لیکن میں نے اس حقیقت سے فرار کی کبھی کوشش نہیں کی کہ تم میری خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتیں۔ اس لیے میں نے یہ خواہش

ہی دل سے نکال دی ہے۔ دُنیا میں سینکڑوں لوگ بے اولاد ہیں ایک ہم بھی سہی۔ میں نے اس دن تمہیں مذاق میں نرسری جوائن کرنے کا کہا تھا۔ لیکن اب پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ چاہو تو وقت گزاری اور شغل کے لیے جوائن کر سکتی ہو۔"

ثانیہ اس کی لمبی چوڑی تقریر کو سُنی ان سُنی کرتے ہوئے بولی: "تم مجھ سے پیار کرتے ہو!"

"یہ کہنے یا جتلانے کی ضرورت نہیں۔"

"تو پھر میری خاموشی کی خاطر تم اتنا بھی نہیں کر سکتے نوید!"

"او ثانیہ۔ پلیز اس موضوع پہ بات نہ کیا کرو۔"

"یہ موضوع میری زندگی ہے۔"

ثانیہ رونے لگی۔ نوید مضطرب و بے چین نظر آنے لگا۔

پھر

اس دن جب ثانیہ اسی طرح رو رو کر نوید سے بچہ گود لینے کے لیے اصرار کر رہی تھی اور نوید بار بار انکار کر رہا تھا۔ تو ثانیہ بولی: "چلو تم بچے سے کوئی سروکار نہیں رکھنا۔ میں مائنڈ نہیں کروں گی۔"

"تم بچے کی خاطر مجھے نظر انداز کرو گی!"

"یہ بات نہیں۔ بچہ میری ضرورت ہے۔"

وہ رو رو کر ضد کرتی رہی، اصرار کرتی رہی، اسے مجبور کرتی رہی۔

"تم بچے کے لیے اس طرح دیوانی ہو گی، میں نہیں جانتا تھا۔"

ثانیہ روتے ہوئے بولی: "اب تو جان لیا ہے نا۔ اب تو مان جاؤ۔ بچہ میری زندگی ہے۔ اس کے بغیر میں مر جاؤں گی نوید۔ مر جاؤں گی۔"

"ثانیہ ہوش کی باتیں کرو۔"

"مجھے بچہ چاہیئے۔" وہ زور سے بولی۔

"مجھے غیر کے بچے کی ضرورت نہیں!" وہ بھی غصے میں آگیا۔

"تو۔ تو پھر؟"

"پھر یہی صورت رہ جاتی ہے کہ میں دوسری شادی کر کے تمہاری بچوں کی خواہش پوری کر دوں۔ بولو۔ منظور ہے؟"

"نوید!"

"میں سنجیدہ ہوں۔"

"تم۔ تم۔"

"دیکھو ثانیہ میں یہ نہیں چاہتا۔ لیکن تمہاری یہی ضد رہی تو پھر اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہ ہوگی۔ سوچ لو۔ اچھی طرح سے۔ اسی طرح زندگی گزارنا چاہتی ہو۔ تو ٹھیک۔ میں خوش ہوں ناخوش نہیں۔ لیکن اگر تم بچوں کے بغیر جی نہیں سکتیں۔ تو میں یہی کر سکتا ہوں۔ دوسری شادی کرلوں۔ بچے ہو جائیں تم انہیں پالو سنبھالو۔"

"تو۔ تم بچہ گود نہیں لوگے۔ عاصمہ بھابی کا بچہ۔"

"نہیں نہیں۔ نہیں۔"

"نوید۔ یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے!"

"آخری اور اٹل۔ تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک چن لو۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہوگی۔"

"تیسری راہ بھی تو ہے۔" ثانیہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"گود لینے کی!"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ تو نوید فیصلہ کن انداز میں بولا: "بالکل نہیں۔ صرف دو راستے ہیں۔ سمجھیں۔"

اور

اب

کئی دنوں سے تانیہ سوچ رہی تھی۔ دیوانگی سے بھی اور فرزانگی سے بھی۔ راستے دونوں ہی دشوار تھے۔ تیسری راہ کی تو نوید نے گنجائش ہی نہیں رکھی تھی۔ تانیہ کئی دفعہ نوید سے بدظن ہوئی۔ وہ پرلے درجے کا خود غرض شخص لگا۔ ہٹ دھرم ضدی اور اپنی انا کا قیدی۔ نوید اسے بارہا احساسِ کمتری کا شکار بھی محسوس ہوا۔ اسے اس نے روایتی مرد بھی گردانا جو صدیوں قرنوں سے اپنی من مانی کرتے اور عورت کو ظلم کا شکار کرتے آیا ہے۔

لیکن

یہ سوچوں کا ایک ہی رُخ تھا۔ دوسرا رُخ دیکھتی تو یہ ساری باتیں ہیچ نظر آتیں۔ نوید ان سے بہت اُونچا بہت پرے۔ اور بہت سچا آدمی لگتا۔ وہ کسی دوسرے بچے کو توجہ پیار اور شفقت نہیں دے سکتا تھا۔ یہ بیج اس کے وجود کے اندر سے اُگا تھا۔ اس نے اس بیج کو چھپایا نہیں تھا۔ برملا کہہ دیا تھا۔ وہ کسی پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بیج کسی کی حق تلفی نہیں کر سکتا تھا۔ ظاہرداری اور فریب کا لبادہ وہ نہیں اوڑھ سکتا تھا۔ اس لیے اس نے واشگاف الفاظ میں تانیہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ غیر بچے کو گود نہیں لے گا۔ وہ تو بچوں کے بغیر بھی تانیہ کے ساتھ ہنسی خوشی جینے پر رضامند تھا۔

تو

پھر

ایسا شخص خود غرض کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ جھوٹا نہیں تھا۔ فریبی نہیں تھا۔ ہٹ دھرم اور ضدی نہیں تھا۔ اس نے تو دونوں راہیں تانیہ کے سامنے پوری سچائی سے رکھ دی تھیں۔

انتخاب تو اس پر چھوڑ دیا تھا۔

لیکن

یہ انتخاب ہی تو سب سے کٹھن مرحلہ تھا۔

کبھی کبھی تو تانیہ اپنے آپ کو کوسنے لگتی۔ اپنا وجود خود غرضی کا پیکر لگنے لگتا۔

اس کی سوچیں دو رویہ متوازی سڑکوں کی طرح چل رہی تھیں۔ نہ اس سڑک کا کوئی اختتام تھا نہ اس کا۔ سوچ سوچ کر دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

نوید کو کسی دوسری عورت سے شیئر کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ تو کسی عورت پر اس کی نظر پڑتے بھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ نوید اس کا تھا۔ صرف اور صرف اس کا تھا۔ اس نے کئی بار اپنے آپ کو ٹٹولا۔ کہیں گنجائش نظر نہ آئی۔

لیکن

دوسری طرف بچہ بھی اس کی ضرورت تھا۔ زندگی تھی۔ بانجھ دھرتی کا روگ چھپا نہیں تھا۔ جس دھرتی سے کوئی کونپل نہ پھوٹے۔ جس پر کوئی سبزہ نہ لہلہائے۔ اس پر ویرانی کی دھول ہی اڑتی رہتی ہے۔ وہ ایسی دھرتی کا روپ بھی نہیں دھارنا چاہتی تھی۔ کونپل اور سبزہ مستعار ہی سہی، اس کی ویرانی کو پاٹ تو سکتا تھا۔ اس کے بانجھ پن پہ پردہ تو ڈال سکتا تھا اسے حسن و نکھار تو بخش سکتا تھا۔

اس نے بہت سوچا۔

بہت سوچا۔

بہت ہی سوچا۔

اور پھر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔

دو متوازی چلنے والی سڑکیں آپ ہی آپ کسی مقام پر آ کر ایک ہو گئیں۔ اب تانیہ کو منزل پر پہنچنا دشوار نہ رہا۔

وہ فیصلہ کر کے انتہائی مطمئن ہو گئی۔

پھر

اس رات

جب دونوں ساری مصروفیات نپٹا کر رات سونے کے لیے اپنے بیڈ روم میں آ گئے۔

نوید نے ٹیپ آن کر دیا اور اس کی دل پسند موسیقی کا ترنم ہوتے ہوئے کمرے میں بکھرنے لگا۔ وہ بیڈ کے سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ کے کش لیتے ہوئے موسیقی کی لہروں میں مستی سے جھومنے لگا۔

تو

ثانیہ کھڑکی کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔

"ہیلو جانِ من" نوید نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے بازو پشت پر سے جاتے ہوئے کھڑکی کے قریب کھڑی ثانیہ کو چھونا چاہا۔

"نوید۔" ثانیہ خود ہی صوفے کی پشت پر اس کے ہاتھوں کی گرفت میں آگئی۔

"ہوں"

"تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں"

نوید اچھل پڑا۔ جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کی ٹھوڑی اونچی کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ "کچھ خاص باتیں؟"

"ہاں" ثانیہ نے چہرہ اس کے ہاتھ سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"بڑی سنجیدہ ہو"

"بات بھی سنجیدہ ہے"

"واقعی؟"

"ہاں"

"تو پھر کہو"

ثانیہ چند لمحے چپ رہی۔ بظاہر تو پُرسکون تھی۔ لیکن جس لمحے پر وہ جست لگانے والی تھی۔ وہ بڑا انقلابی تھا۔

"ہاں کہو۔ کیا کہنا ہے"؟

"نوید۔ تم نے میرے سامنے دو راستے کھلے چھوڑ دیے تھے۔"

"اوہ خدایا۔ وہی گھسا پٹا موضوع۔ کوئی اور بات کرو۔"

"نوید۔ میری زندگی کو تم نے جس موڑ پر چھوڑا۔ وہ فیصلہ کن۔۔۔"

"ثانیہ!"

"میں نے فیصلہ کرلیا ہے" ثانیہ بولی۔

نوید نے غور سے اسے دیکھا اور دھیرے سے بولا "واقعی"؟

"ہاں۔ اور اس سے میں تمہیں آگاہ کرنے والی ہوں"

نوید خاموشی سے اسے تکتا رہا۔ کمرے کی فضا بڑی گمبھیر ہوگئی۔ روشنی کے باوجود نوید کو سیاہی کے غبار پھیلتے محسوس ہوئے۔

"نوید۔ مجھے بچے چاہئیں۔ تم شادی کرلو۔ تمہارے بچے" ثانیہ کی آواز رک گئی۔

"ثانیہ!" نوید نے اس کے لرزتے وجود کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

ثانیہ نے قوت مجتمع کی اور نوید کی طرف دیکھے بغیر بولی "بڑے دنوں کی کشمکش اور تذبذب کے بعد میں اس موڑ پر پہنچی ہوں۔ تم نے تیسری راہ نہیں چھوڑی تھی۔ صرف دو راستے میرے سامنے رکھے تھے۔ میں۔ میں تمہیں دوسری شادی کی بخوشی اجازت دیتی ہوں۔ تم مجھے اس سلسلے میں خود غرض کہہ سکتے ہو۔ میں اپنی غرض کے لیے تمہیں دوسری شادی کی اجازت دے رہی ہوں"

"ثانیہ!" شدتِ جذبات سے نوید کی آواز پھٹ گئی۔ اس کا مضبوط جوان جسم بھی اس کے اس فیصلے سے لرز اٹھا۔

"تم۔ ثانیہ تم۔ بچے کے لیے اتنی بڑی قربانی دینے کو تیار ہوگئی ہو۔"

"کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ وعدہ کرو نوید کہ تم۔ مجھے اب بچے سے محروم نہیں رکھو گے۔ میرا نہیں تمہارا اپنا بچہ تو ہوگا نا۔ اپنا بچہ۔ جسے تم بھرپور توجہ، پیار اور محبت دے سکو گے"

"تانیہ ۔" نوید نے بازوؤں میں اسے بھینچ کر اس طرح سینے سے لگالیا ۔ جیسے وہ دو الگ الگ نہیں ، ایک ہی وجود کے دو رُخ ہوں ۔

بچے کی خاطر تانیہ یہ انتہائی اقدام بھی کرگزرے گی ، نوید نے سوچا بھی نہیں تھا ۔

اس نے لرزتی کانپتی تانیہ کو بیڈ پر لٹا دیا ۔ اور خود انتہائی اضطراب اور بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا ۔

تانیہ سنبھل کر بولی " میری خواہش پوری کر دوگے نا نوید ۔ تمہارے بچے میرے ہی بچے ہوں گے نا ۔ اس گھر کی ویرانی اور سناٹا دُور ہو جائے گا ۔ نوید ۔ میری خالی جھولی میں بچہ آجائے گا ۔ نا ؟"

"ہاں آجائے گا ۔ ضرور آجائے گا ۔" نوید نے بے تاثر لہجے میں کہا ۔

"اوہ نوید ۔ تم بڑے عظیم ہو ۔" تانیہ نے آنکھیں بند کر کے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا ۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے ۔

نہ جانے اظہارِ تشکر سے ، یا کرب و اذیت سے ۔

رات رُک رُک کر ، ٹھہر ٹھہر کر گزرتی رہی ۔

نیند دونوں ہی کو نہ آئی ۔

لیکن چپ دونوں ہی رہے ۔

اس چپ میں اتنا شور تھا ، اتنی شوریدگی تھی ، اتنا ہنگامہ تھا ۔ کہ دونوں پر بے قراری اور بے چینی ہی غالب رہی ۔ تانیہ صبح صبح ہی بستر سے اُٹھ گئی ۔ نوید کسلمندی سے بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا ۔

اس دن وہ دفتر بھی نہیں گیا ۔

اور اسی دن بھابی کا فون آیا ۔ انہوں نے اطلاع دی تھی کہ عاصمہ کے بیٹا ہوا ہے ۔ اسے گود لینا ہے تو ابھی لے لے ۔ فون نوید نے ہی ریسیو کیا ۔

"کس کا فون تھا ؟" تانیہ نے چائے کی پیالی واپس رکھتے ہوئے پوچھا ۔

"بھابی کا ۔" نوید نے تانیہ کی طرف غور سے دیکھا ۔ جس کے چہرے پر رات کی بیقراریوں کے

عکس ساتھ ساتھ فیصلے کی سنگین چھاپ بھی تھی ۔

"کیا کہتی تھیں ۔ مجھے نہیں دیا فون ۔" تانیہ نے پوچھا ۔

"تمہاری عاصمہ بھابی کے بیٹا ہوا ہے ۔" نوید نے تانیہ کے چہرے پر نظریں بدستور جمائے رکھیں ۔

تانیہ کے چہرے پر لپک جھپک کئی رنگ آئے ۔ لیکن اس نے جلد ہی اپنے اوپر قابو پالیا

"چلو تانیہ تیار ہو جاؤ ۔" چند لمحوں بعد نوید نے کہا ۔

"کہاں جانا ہے ؟"

"تم تیار تو ہو جاؤ ۔"

"میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ۔ شاید میں اس وقت کہیں نہ جانا چاہوں ۔"

"ٹھیک ہے تم آرام کرو ۔ میں جاتا ہوں ۔"

نوید جلدی جلدی ناشتے سے فارغ ہو کر کمرے میں چلا گیا ۔ تھوڑی دیر بعد وہ تیار ہو کر گاڑی کی طرف جا رہا تھا ۔ تانیہ اس کے ساتھ ساتھ آئی ۔

گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے پوچھا "کب تک لوٹو گے ؟"

"پتہ نہیں ۔" نوید نے کہا ۔

تانیہ اس مبہم جواب سے کچھ پریشان ہو گئی ۔

دو تین گھنٹوں بعد جب نوید لوٹا تو اس کے ساتھ بھابی بھی تھیں ۔ تانیہ اپنے بیڈ روم میں بستر میں لیٹی تھی ۔ سوئی نہیں تھی مگر سونے کی ناکام کوشش کرتی رہی تھی ۔

نوید اور بھابی آگے پیچھے بیڈ روم میں داخل ہوئے ۔ بھابی کے بازوؤں میں کچھ تھا ۔

"تانیہ !" نوید نے اُسے پکارا ۔ تو وہ بستر سے اُٹھ بیٹھی ۔

نوید نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا ۔ پھر بھابی کی طرف مُڑا اور ان کے ہاتھوں سے نیلے کمبل میں لپٹا بچہ لے کر تانیہ کی جھولی میں ڈالتے ہوئے بولا "مُبارک ہو ۔"

"یہ ۔ یہ کیا ۔ ؟" وہ گڑبڑا سی گئی ۔

"بیٹا ۔ ہم دونوں کا ۔" نوید نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

تانیہ ہراساں سی کبھی بچے اور کبھی نوید کو تک رہی تھی ۔

بھابی نے بھی مبارک باد دی اور بولی "نوید نے مجھے سب کچھ بتایا ہے ۔ تمہاری قربانی سے وہ اتنا متاثر ہوا ہے کہ تمہارے لیے عاصمہ کا بچہ گود لینے کو بخوشی تیار ہو گیا ہے ۔"

نوید ، تانیہ کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کی کمر میں بازو حمائل کرتے ہوئے بولا "سچ مانو ۔ تمہاری خواہش کی شدت کا مجھے رات ہی احساس ہوا ۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بچے کے لیے تم اتنا بڑا ظلم اپنے آپ پر کر گزرنے کو تیار ہو جاؤ گی ۔ لیکن میں اپنی تانیہ پہ یہ ظلم کیسے کر سکتا ہوں ۔"

بھابی کمرے سے نکل گئیں نوید نے تانیہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا "اب تو خوش ہو نا ؟ واقعی بہت خوب صورت اور پیارا بچہ ہے ۔"

"لیکن ۔ لیکن نوید ۔" تانیہ اب تک پورے حواس میں نہ آئی تھی ۔ ہل چل سی ہو رہی تھی اس کے اندر ۔ وہ خوف زدہ بھی نظر آ رہی تھی اور بے یقینی سے بھی دو چار تھی ۔ گھبرا کر بولی "لیکن آپ تو کسی غیر بچے کو توجہ پیار ۔ ۔ ۔ ۔"

نوید نے تانیہ کو بازو کی لپیٹ میں لیتے ہوئے مسکرا کر کہا ۔ "گھر میں جانور رکھیں تو اس سے پیار ہو جاتا ہے ، یہ تو انسان کا بچہ ہے تانیہ ۔ اور پھر جو تمہیں پیارا وہ ہمیں پیارا ۔ کیوں جی کیسے ؟ ویسے یہ تیسری راہ بری بھی نہیں ۔ ۔ ۔"

"تم بہت عظیم ہو نوید ۔ بہت عظیم ۔" تانیہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے نوید نے اسے گلے لگا لیا ۔

زندگی ایک بار پھر جی اٹھی ۔ گلرنگ قہقہے اور دھنک رنگ خوشیاں اس کا مزاج

دوسرے دن وہ خوب بن سنور کر سیماں کے ہاں جانے کے لیے تیار تھی۔ ساس نے سیف کھول دی۔

"لے لو جو کچھ پہننا ہے۔ سیماں کی سسرال جانا ہے۔ ٹھیک ہی کہتی تھی وہ، زیور ایسے موقعوں پر ہی تو پہنا جاتا ہے۔"

اس نے دو سیٹ گلے میں ڈالے اور باقی ڈبوں سے چپکے سے زیور نکال کر بٹوے میں ڈال لیا۔ ہاتھوں میں جتنی انگوٹھیاں آسکتی تھیں ڈال لیں۔ جڑاؤ کڑے اور درجن بھر چوڑیاں بھی پہن لیں۔

تقریب تو ایک بہانا تھی۔ سیماں کے گھر سے جب وہ واپس لوٹی تو زیور اس کے بدن پر نہیں تھا۔ ساس کی نظر اس پر پڑی چھوٹتے ہی پوچھا۔

"گلوبند اور ہار جو پہن کر گئی تھیں وہ؟"

"سیماں کے ہی گھر رکھ آئی ہوں۔"

"کیوں۔؟"

"شام اترنے لگی تھی۔ اس نے کہا اتنا زیور پہن کر نہ جاؤ۔"

"تمہیں تو سلیم چھوڑنے آیا تھا۔"

"ہاں۔"

"پھر زیور وہاں رکھنے کی کیا تک تھی۔؟"

وہ جواب دیے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پھر یہی زیور اتنے بڑے جھگڑے کا سبب بنا کہ گھر والوں نے رما کو دھکے دے کر نکالا۔

"زیور واپس لے کر آؤ۔"

زیور اب سلیم اور سیماں کے قبضے میں تھا۔ ہاتھ آئی چیز کیسے واپس دے دیتے۔ دھوکا بازی پر اُتر آئے تھے اس لیے رما کو وہ بھڑکانے لگے۔

رما کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ دونوں اس سے اس طرح دشمنی کر رہے ہیں، وہ دوست دشمن کی تمیز نہ کر سکی۔ بات بڑھی۔ گھر والے زیور مانگتے رہے سیماں نے زیور نہ دیا۔

اور۔۔

نوبت طلاق تک آپہنچی۔

طلاق ہو گئی۔ رما بوکھلا گئی۔ رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ وہ راشد سے بچھڑ گئی تھی۔

راشد سے۔

جو اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا جس نے اُسے پیار و محبت کے مفہوم سے آشنا کیا تھا اور جو اپنی وجودی خامیوں کے باوجود اُسے اچھا لگتا تھا۔ جو اس کا اپنا تھا لڑائی جھگڑوں کے باوجود جو اُسے تحفظ کا احساس دلاتا تھا۔

لیکن۔۔

سیماں اور سلیم بڑے گھاگ تھے۔ نفرتوں کا غبار انہوں نے جس مقصد کے تحت پھیلایا تھا وہ پورا ہو گیا تھا۔ انھوں نے تو لمبا چوڑا پلان بنا لیا تھا۔ رما پیسہ بنانے کی مشین بن سکتی تھی، وہ رما کو اپنے ہاں لے آئے تھے اور اس پر محبتوں، عنایتوں اور نوازشوں کی بارشیں برسا رہے تھے۔ تسلی پیار اور محبت سے اس سانحے کو بھول جانے کی تلقین کرتے تھے۔

رما بستر سے اُٹھ بیٹھی۔ اپنے خوبصورت ہاتھوں کو مسلتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس کھینچی پھر دیوار پر لگے کلاک پر نگاہ ڈالی سلیم اور سیماں کو گئے گھنٹہ بھر ہو گیا تھا۔ وہ اب لوٹنے ہی والے تھے۔ وہ نبیل کے ہاں حق مہر، زیورات اور دوسری ضروری باتوں کا فیصلہ کرنے گئے تھے۔

نبیل بہت امیر کبیر آدمی تھا پہلی بیوی مر چکی تھی۔ دو سالہ معصوم سی بچی کا باپ تھا۔ اس بچی ہی کی خاطر وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔

کل نبیل کی دوسری اور رما کی تیسری شادی تھی۔

رما نے اک انگڑائی لی اور بستر سے اُٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آبیٹھی۔ بدن اُٹھا